MAUL - 504

ایم.اے.اُردو

سمسٹر اوّل

MASTER OF ARTS (URDU)

FIRST SEMESTER

تحقیق

TAHQEEQ

مولوی عبدالحق

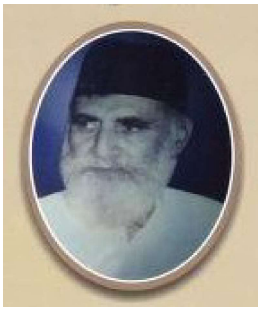

امتیاز علی خاں عرشی

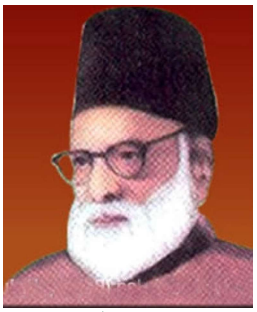

محمود شیرانی

پروفیسر مسعود حسین خاں

ڈاکٹر گیان چند جین

خواجہ احمد فاروقی

اُتراکھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی (نینی تال)

SCHOOL OF HUMANITIES

UTTARAKHAND OPEN UNIVERSITY

HALDWANI (NAINITAL) - 263139

ایم.اے.اُردو

MASTER OF ARTS (URDU)

سالِ اوّل

FIRST YEAR

سمسٹر اوّل

FIRST SEMESTER

ایم.اے. یو.ایل. - ۵۰۴ - تحقیق

MAUL - 504 - TAHQEEQ

اُترا کھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی (نینی تال)

SCHOOL OF HUMANITIES

UTTARAKHAND OPEN UNIVERSITY

HALDWANI (NAINITAL) - 263139

سرپرستِ اعلیٰ:

پروفیسراو. پی.ایس.نیگی، وائس چانسلر، اُتراکھنڈاوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی۔

کمیٹی بورڈ آف اِسٹڈیز:

پروفیسر رینو پرکاش (ڈائریکٹراسکول آف ہیومنٹیز (SOH) اُتراکھنڈاوپن یونی ورسٹی (UOU)، ہلدوانی۔

پروفیسرتوقیراحمدخاں، ریٹائرڈ پروفیسرشعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی، دہلی۔

پروفیسرسیدمحمدارشدرضوی، گورنمنٹ رضاپی.جی.کالج، رام پور۔

شہپرشریف، اسسٹنٹ پروفیسرشعبۂ اردو، اُتراکھنڈاوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی۔

محمدافضل حسین، اسسٹنٹ پروفیسروکورس کوآرڈِنیٹرشعبۂ اردو، اُتراکھنڈاوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی۔

رجسٹرار:

پروفیسرپی.ڈی. پنت، اُتراکھنڈاوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی۔

کورس کوآرڈِنیٹروایڈیٹر:

محمدافضل حسین (اُستاد بریلوی)

صدرِشعبۂ اردو، اُتراکھنڈاوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی

C جملہ حقوق بحقِ ناشرمحفوظ ہیں

اس کتاب کا کوئی بھی حصّہ کسی بھی شکل میں یونی ورسٹی کی تحریری اجازت کے بغیرشائع نہ کیا جائے۔ یہ کتاب ''اُتراکھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی'' کے ایم.اے. اردوسالِ اوّل، سمسٹراوّل، تحقیق کے نصاب کا جزو ہے۔مزیدمعلومات یاکسی بھی وضاحت کے لئے یونی ورسٹی حکّام یاصدرِشعبۂ اردو سے یونی ورسٹی کے حسبِ ذیل پتے پررابطہ قائم کیا جاسکتا ہے۔

DEPARTMENT OF URDU

UTTARAKHAND OPEN UNIVERSITY

UNIVERSITY ROAD, BEHIND TRANSPORT NAGAR (Teenpani Bypas)

HALDWANI-263139 Phone:05946-261122

پیش لفظ

اُتراکھنڈ اوپن یونی ورسٹی کا قیام اُتراکھنڈ قانون ساز اسمبلی کے ایک ایکٹ کے تحت ۳۱/اکتوبر ۲۰۰۵ء کو عمل میں آیا جس کا مقصد آبادی کے بڑے حصے کی تعلیمی ضرورتوں کی تکمیل اور فاصلاتی طریقۂ تعلیم کے ذریعے اُن لوگوں تک تعلیم پہنچانا ہے جو کسی مصروفیت یا مجبوری کے سبب کالجز یا یونی ورسٹیز تک نہیں پہنچ پاتے ہیں۔ یونی ورسٹی کے تعلیمی پروگرام ''ماسٹر آف آرٹ'' کے تحت ''ایم.اے.اردو'' بھی شامل ہے۔ یہ کتاب ایم.اے.اردو سالِ اوّل، سمسٹر اوّل، تحقیق کے نصاب میں شامل ہے جس کا نام ''ایم.اے. یو.ایل (۵۰۴) تحقیق ہے۔ یہ کتاب ۱۱/اکائیوں پر مشتمل ہے جو الگ الگ موضوعات پر مختلف اسباق ہیں۔

عزیز طلبا و طالبات!

فاصلاتی طریقۂ تعلیم کی کتابوں کو {خود تدریسی مواد، SLM}(Self Learning Materials) کہا جاتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ طالبِ علم کو یہ مواد خود ہی پڑھنا ہوتا ہے۔ روایتی درس گاہوں کے خلاف اسے پڑھانے کے لئے آپ کے سامنے استاد موجود نہیں رہے گا بلکہ آپ یہ مواد خود ہی پڑھیں گے اور سمجھیں گے۔ اِس صورتِ حال کے تحت اسباق کو اِس طرح تیار کیا گیا ہے کہ آپ کو کلاس میں موجودگی کا احساس ہو اور کلاس میں نہ ہونے کی کمی کافی حد تک دُور ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر اکائی کا آغاز اغراض و مقاصد سے کیا گیا ہے تاکہ آپ کو اندازہ ہو سکے کہ اُس اکائی کو پڑھنے کا مقصد کیا ہے؟ اُس کے بعد تمہید دی گئی ہے جس میں سبق کو مختصر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اکائی کے درمیان ''اپنے مطالعے کی جانچ'' کے تحت کچھ سوالات بھی دِیے گئے ہیں تاکہ آپ نے جو کچھ پڑھا ہے اُسے کس حد تک ذہن نشین کیا ہے؟ اِس بات کا اندازہ ہو سکے۔ اُن سوالات کے جوابات آخر میں دِیے گئے ہیں لیکن آپ کو چاہیے کہ پہلے خود اُن سوالات کے جوابات دیں پھر آخر میں دِیے گئے جوابات سے اپنے جوابات ملالیں تاکہ آپ کو اپنی صلاحیت کا اندازہ ہو اور آپ کی ذہنی ورزش بھی ہو جائے۔ امتحان میں آپ سے جس طرح کے سوالات پوچھے جائیں گے اُس کے نمونے بھی دِیے گئے ہیں۔ ساتھ ہی ہر اکائی کے آخر میں مشکل الفاظ کے معانی اور حوالہ جاتی کتب کے نام بھی دِیے گئے ہیں تاکہ آپ اُن کے مطالعے سے اپنی معلومات میں مزید اضافہ کرسکیں۔

ہم آپ کی کامیابی کے لئے دعائیں اور نیک خواہشات پیش کرتے ہیں۔

ایڈیٹر

ایم.اے.اُردو

(M.A.URDU)

سالِ اوّل

FIRST YEAR

سمسٹر اوّل

FIRST SEMESTER

ایم.اے. یو.ایل.-۵۰۴-تحقیق

MAUL - 504, TAHQEEQ

اکائی نمبر	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
بلاک نمبر01:			**05**
اکائی 1	اُردو میں تحقیق کی روایت	پروفیسر سید عتیق اللہ	06
اکائی 2	تحقیق کا فن اور اصول	پروفیسر سید عتیق اللہ	21
اکائی 3	تحقیق کے مسائل	پروفیسر سید عتیق اللہ	33
اکائی 4	تحقیق اور تنقید کا باہمی تعلق	پروفیسر سید عتیق اللہ	47
اکائی 5	اُردو کے اہم محققین	پروفیسر محمد نعمان خاں	64
بلاک نمبر02:			**81**
اکائی 6	مولوی عبدالحق	پروفیسر سید عتیق اللہ	82
اکائی 7	محمود شیرانی	پروفیسر سید عتیق اللہ	99
اکائی 8	خواجہ احمد فاروقی	ڈاکٹر شریف احمد قریشی	116
اکائی 9	امتیاز علی خاں عرشی	ڈاکٹر شریف احمد قریشی	133
اکائی 10	مسعود حسین خاں	پروفیسر محمد نعمان خاں	151
اکائی 11	ڈاکٹر گیان چند جین	پروفیسر محمد نعمان خاں	165

بلاک نمبر 01

اکائی 01	اُردو میں تحقیق کی روایت	پروفیسر سید عتیق اللہ
اکائی 02	تحقیق کا فن اور اصول	پروفیسر سید عتیق اللہ
اکائی 03	تحقیق کے مسائل	پروفیسر سید عتیق اللہ
اکائی 04	تحقیق اور تنقید کا باہمی تعلق	پروفیسر سید عتیق اللہ
اکائی 05	اُردو کے اہم محققین	پروفیسر محمد نعمان خاں

اکائی 01 : اُردو میں تحقیق کی روایت

ساخت :

01.01 : اغراض ومقاصد

01.02 : تمہید

01.03 : تذکروں میں تحقیقی اشارات

01.04 : تحقیق کے چار اَدوار

01.05 : سرسید خاں پہلے متنی نقاد

01.06 : مولوی عبدالحق کی متنی تنقید

01.07 : حافظ محمود شیرانی

01.08 : قاضی عبدالودود

01.09 : امتیاز علی عرشی

01.10 : مالک رام

01.11 : رشید حسن خاں

01.12 : خلاصہ

01.13 : فرہنگ

01.14 : سوالات

01.15 : حوالہ جاتی کتب

01.01 اغراض ومقاصد

اُردو میں تحقیق کی روایت کو ماضی کے ان تذکروں سے جوڑا جاسکتا ہے جو فارسی میں لکھے گئے تھے لیکن ان میں مطالعے کا موضوع اُردو شعرا تھے۔ اگرچہ اُن مطالعات پر جدید تحقیق کے اصولوں کا اطلاق نہیں کیا جاسکتا تاہم ہمارے اکثر محققین نے انہیں اپنا حوالہ بنایا ہے۔ عہدِ سرسید میں سرسید نے تحقیق کی طرف توجہ کی لیکن ان کی دل چسپیوں کے اہداف متنوّع تھے۔ اُردو مصنّفین کی طرف وہ توجہ نہیں کر سکے۔ اسی طرح شبلی نے فارسی شعرا کے مطالعے میں تحقیق سے کام لیا اور اپنی سیرتوں میں تحقیق کو بھی بنیاد بنایا۔ انہوں نے بھی اُردو شاعری یا اُردو شعرا اور ان کی تصنیفات کے سلسلے میں کسی تحقیق سے کام نہیں لیا۔

اِس اکائی میں بالخصوص مولوی عبدالحق اور محمود شیرانی سے رشید حسن خاں تک کی تحقیقی روایت کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے جس سے ہمارے طلبا کو اُردو میں تحقیق کے آغاز وارتقا کے بارے میں معلومات حاصل ہوں گی اور وہ اُن محققین کے کاموں سے واقف ہوسکیں گے جنہوں نے کئی گراں قدر تحقیقی وتدوینی کارنامے انجام دیے ہیں۔

01.02 تمہید

اس اکائی میں اُردو کی اُس تحقیقی روایت کو موضوع بنایا گیا ہے جس کے بنیادگزار محمود شیرانی تھے جنہیں محقّقِ اوّل کہا جاتا ہے اور رشید حسن خاں کے لفظوں میں قاضی عبدالودود محقّقِ ثانی تھے۔اس اکائی کے بعد ہمارے طلبا اُردو میں تحقیق کے آغاز وارتقا کے بارے میں واقف ہوسکیں گے اور انہیں اس بات کا بھی علم ہوگا کہ مولوی عبدالحق، محمود شیرانی، قاضی عبدالودود، امتیاز علی خاں عرشی، مالک رام اور رشید حسن خاں کا اُردو تحقیق کی دنیا میں کیا مقام ہے؟

01.03 تذکروں میں تحقیقی اشارات

اُردو میں تذکروں کے موضوع پر ہر دو اعتبار سے بحث کی گئی ہے۔بعض حضرات کو ان میں قباحت ہی قباحت نظر آتی ہے اور بعض حضرات انہیں معلومات افزا قرار دیتے ہیں۔تذکروں میں تنقیدی اشارے بھی دریافت کیے گئے اور بعض محققین نے بقدرِ ضرورت ان سے استفادہ بھی کیا ہے۔

ڈاکٹر حنیف نقوی ان کی تحقیقی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے یہ واضح کرتے ہیں کہ:

﴿۱﴾ تذکروں نے ایسے بے شمار فن کاروں کو بے نام ونشان ہونے سے بچالیا ہے جن کے کارنامے یا تو کسی وجہ سے مدوّن نہ ہوسکے یا مدوّن ہونے کے بعد ضائع ہوگئے۔اُردو ادب کی تاریخ سے یہاں بطورِ مثال مصطفیٰ خاں یکرنگ، خان آرزو اور مرزا مظہر جان جاناں کے نام پیش کیے جاسکتے ہیں۔ان اساتذہ کی تحقیقات کا جس قدر سرمایہ آج موجود ہے، وہ تذکروں ہی کے توسط سے حاصل ہوا ہے۔

﴿۲﴾ بعض تذکروں میں ان مؤلّفین نے زمانی ومکانی قرب سے پوری طرح فائدہ اٹھا کر ہم عصر شاعروں کے بارے میں ضروری اور کارآمد معلومات کا وہ بیش بہا قیمتی سرمایہ فراہم کردیا ہے جو دوسرے ذرائع سے حاصل نہیں ہوسکتا تھا۔

﴿۳﴾ تذکروں میں کبھی کبھی ایسی کتابوں کے حوالے اور اقتباسات بھی مل جاتے ہیں جو یقینی طور پر فنا ہوچکی ہیں یا جن کی بازیابی کے امکانات تقریباً مفقود ہیں۔

﴿۴﴾ تذکروں میں ایسے اشعار بھی مل جاتے ہیں، جنہیں شاعر پست از معیار قرار دے کر اپنے کلام سے خارج کردیتا ہے..... .غالبؔ کے منسوخ کلام کا ایک اچھّا خاصا حصّہ اسی طرح دستیاب ہوا ہے۔

﴿۵﴾ تذکروں سے متنازعہ فیہ کلام کی ملکیت کے تعین میں بھی مدد ملتی ہے۔

﴿۶﴾ کسی شاعر کے کلام کو تاریخی وزمانی اعتبار سے مرتب کرنے میں بھی تذکروں سے مدد ملتی ہے۔

اُردو میں باقاعدہ ادبی تاریخ (رام بابو سکسینہ کی تاریخِ ادب اردو) بیسویں صدی میں لکھی گئی۔اس سے قبل فارسی یا اُردو میں جو تذکرے لکھے گئے۔ان میں اگر کسی تذکرے کو اُردو ادب کی پہلی تاریخ کا نام دیا جاسکتا ہے تو وہ محمد حسین آزادؔ کی ''آبِ حیات'' ہے۔

اسی دَور میں اوراس کے بعد بھی جو تذکرے قلم بند ہوئے وہ یقیناً گزشتہ تذکروں سے کئی معنی میں ترقی یافتہ تھے اوران میں پہلے کے مقابلے تنقید اور تحقیق کا شعور زیادہ بہتر ملتا ہے۔ ''آبِ حیات'' میں اُردو زبان اور دیگر زبانوں بہ شمول برج بھاشا پر جو بحث ہے وہ تحقیقی نوعیت کی ہے۔ موجودہ زمانہ میں بہت سی چیزیں رَد ہوئی ہیں تو بہت سی چیزیں بحال بھی ہوئی ہیں۔ آزاد کے تصوّرِ زبان کو اگر رَد ہونا پڑا ہے تو یہ بھی ایک جدید تحقیقی کارنامہ ہے۔ آزاد نے مختلف اَدوار کی معاشرتی اور تہذیبی سطح پر جو تقسیم کی ہے اس میں بھی تحقیق کا ہی کا دخل ہے۔ ہماری تحقیق اکثر بوقت ضرورت اور بقدرِ ضرورت تذکروں سے تصدیق وتوثیق یا تردید وتنسیخ کے حوالے اخذ کرتی رہتی ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر حنیف نقوی نے بھی سطورِ بالا میں ان نکات کی وضاحت کرتے ہوئے تذکروں کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔

01.04 تحقیق کے چار دَور

ڈاکٹر عطش درّانی نے اُردو میں اُصولِ تحقیق کی قدیم روش کو تین دبستانوں میں تقسیم کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ:

﴿۱﴾ پہلا دبستان سرسید سے شروع ہوتا ہے جسے ہم ''تالیفی دبستان'' کہہ سکتے ہیں۔ آزاد، حالی، شبلی، مولوی عبدالحق، ڈاکٹر وحید قریشی، مسعود حسین خاں سے ڈاکٹر گیان چند جین تک اسی کی پیروی کی جاتی رہی۔ یہ تالیفی دبستان روایات کو جوں کا توں قبول کرتا اور حقائق کی محض بازیافت کرنے کے لئے تلاش اور تبصرے کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔

﴿۲﴾ دوسرا دبستان تشریح وتوضیح کرتا ہے اور اُصولِ تنقید کو استعمال کرتا ہے۔ کوئی ادبی رتنقیدی نظریہ قائم کرتا ہے۔ ڈاکٹر لائٹز سے اس کی ابتدا ہوتی ہے اور حافظ محمود شیرانی اس کے معلّمِ اوّل ہیں۔ یہ انتقادی دبستان کہلاتا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، قاضی عبدالودود، خلیل الرحمٰن داؤدی، مشفق خواجہ، رشید حسن خاں اسی مکتب فکر کے پیرو ہیں۔

﴿۳﴾ تیسرا مکتبِ فکر فرضیوں کی جانچ پرکھ کو تجزیوں اور معیاری ومقداری تحقیق کے لئے تکنیک کو بنیاد بناتا ہے اور تحقیقی بصیرت کا اظہار کرتا اور تحقیق کو کلّی رسمیّات قرار دیتا ہے۔ اس میں مولانا حالی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر محمد صادق، پروفیسر محمد عثمان، ڈاکٹر علیم اختر، مولانا صلاح الدین احمد جیسے تحقیقی کام کرنے والوں کی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔

ڈاکٹر عطش درّانی کی تقسیم بھی سائنسی قطعیّت سے عاری ہے۔ اس میں توضیح اور دلیل کا بھی فقدان ہے۔ حالی پہلے دبستان میں بھی ہیں اور تیسرے میں بھی اور پہلے دبستان میں مسعود حسین خاں کو شامل کرنے کا کوئی معقول جواز بھی نہیں ہے۔ حالی اور شبلی کو محققین کی فہرست میں جگہ دینے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

گیان چند کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ انہوں نے نظری مباحث کو بھی موضوع بنایا ہے۔ قدیم ادب کی چھان بین بھی کی ہے۔ تاریخوں کا تعین بھی کیا ہے اور تنقید کو بھی جا بجا ایک آلہ کے طور پر استعمال کیا ہے۔ تیسرے دبستان میں تکنیک کو بنیاد بنانے کی بات کہی گئی ہے۔ دراصل دوسرے دبستان کے تمام محققین نے تکنیک کو بنیاد بنایا ہے، اسی لئے ان کے یہاں ترتیب وتنظیم پائی جاتی ہے۔

ڈاکٹر محمد صادق اور ڈاکٹر جمیل جالبی کو بھی دوسرے دبستان میں جگہ دینے کی ضرورت تھی کیوں کہ دونوں کی تاریخیں اور محمد حسین آزاد پر ڈاکٹر محمد صادق کا تحقیقی کارنامہ ان کی تحقیقی وتنقیدی بصیرت کا مظہر ہے۔

تحقیق کرنے والوں کے صرف دو گروہ ہیں:

﴿۱﴾ قدیم طریقِ کار کے حامل محققین، جنہوں نے تدوین کا کام بہت زیادہ کیا ہے اور آنے والی نسلوں کے لئے بہت سی ایسی چیزیں مہیا کر دیں جن پر مدتوں تحقیق ہوتی رہے گی جسے اُردو ادب کی تاریخ کو ثروت مند بنانے کے لئے جاری رہنے اور جاری رکھنے کی ضرورت ہے۔ان میں سرسید، مولوی عبدالحق، ڈاکٹر زور، نصیرالدین ہاشمی وغیرہ کا شمار کیا جانا چاہیے۔

﴿۲﴾ دوسرا گروہ اصولِ تحقیق پر کاربند ہے۔ جو نئی تعلیمات کا پروردہ ہے اور جسے مغربی تحقیق کے طریق ہائے کار اور اصولوں کا بخوبی علم ہے۔ان کے یہاں تنقید کے عمل سے زیادہ تنقید کا طریقۂ کار زیادہ ملتا ہے۔ وہ آپس میں اس قدر گتھا ہوا ہوتا ہے کہ ایک کو دوسرے سے الگ کرنا مشکل ہے۔محمود شیرانی، قاضی عبدالودود اور رشید حسن خاں کے تحقیقی اُسلوب کی یہ خاص قدر ہے۔مولانا امتیاز علی عرشی، حنیف نقوی اور تنویر احمد علوی کی زبان بھی تنقیدی ہے اور ان کی توجہ اپنے اُسلوب کی نفاست پر بھی رہتی ہے۔

01.05 سرسید احمد خاں پہلے متنی نقّاد

سرسید احمد نے تزکِ جہانگیری، آئین اکبری اور تاریخ فیروز شاہی کے متون کو بڑی عرق ریزی و دیدہ ریزی کے ساتھ مدوّن کیا تھا۔ سرسید کے عہد میں تحقیق و تدوین کی طرف کسی اور نے توجہ نہیں کی تھی اور نا ہی ان فارسی تصنیفات کی تاریخی و تہذیبی معنویت و اہمیت کا کسی کو احساس تھا۔سرسید نے صحتِ متن کا بہر طور لحاظ رکھا ہے۔ان کی تحقیقی بصیرت اور دقّت پسندانہ طریقِ عمل کی جھلک ان کے دیباچوں میں بھی ملتی ہے۔متنی تنقید کے ابتدائی نقوش کے اعتبار سے یہ دیباچے اپنا خاص مقام رکھتے ہیں۔

01.06 مولوی عبدالحق کی متنی تنقید

مولوی عبدالحق اُردو کے سپاہی، اُردو کے خادم اور اپنے صحیح معنی میں بابائے قوم تھے۔انہوں نے بہ یک وقت کئی میدانوں میں کام کیا۔تحقیق، تنقید اور لغت کے علاوہ انہوں نے خاکے بھی لکھے اور کئی اعلیٰ درجے کے تدوینی کام بھی۔عبدالحق کے گراں قدر کاموں کی ایک طویل فہرست ہے۔مثلاً نکات الشعرا (میر تقی میرؔ)، تذکرۂ ریختہ گویاں (سید فتح علی گردیزی)، قطب مشتری (مُلّا وجہیؔ)، سب رس (مُلّا وجہیؔ)، رانی کیتکی کی کہانی (انشا اللہ خاں انشاؔ)، گلشنِ عشق (نصرتی) مثنوی خواب و خیال (میر اثرؔ) کی ترتیب و تنقید میں انہوں نے متون کو بنیادی اہمیت دی ہے۔

''اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا حصّہ'' بھی ایک تحقیقی کارنامہ ہے جس میں پہلی بار اُردو کے ابتدائی دَور میں صوفیاے کرام نے کیا کردار ادا کیا، اس کی تفصیلات بیان کی ہیں اور صوفیا کے ملفوظات اور ان کی گفتگوؤں کو بنیاد بنایا گیا ہے۔''مرحوم دہلی کالج'' بھی ایک نادر کارنامہ ہے۔دہلی کالج کے علمی اور ادبی خدمات پر یہ پہلا تحقیقی کام تھا۔انہوں نے ''معراج العاشقین'' مرتب کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی فرہنگ بھی تیار کی ہے۔

اس کے مقدمے میں اس نثر کے نمونے کو خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کا کارنامہ ثابت کرنے کی کوشش کی جسے بعد ازاں حفیظ قتیل نے اپنی تحقیق سے یہ ثابت کر دیا کہ یہ تصنیف مخدوم شاہ حسینی کا کارنامہ ہے۔ان کا یہ دعویٰ بھی غلط ثابت ہوا کہ ''قطب مشتری'' گولکنڈہ کی پہلی مثنوی ہے۔سیدہ جعفر کی تحقیق کے مطابق ''مثنوی یوسف و زلیخا'' پہلی تصنیف ہے۔تحقیق کی راہ ہمیشہ کھلی رہتی ہے۔ چیزیں رد و بحال ہوتی رہتی ہیں۔

مولوی عبدالحق کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے قدیم دکنی نسخوں کی تحقیق اور تدوین کی۔ ان کی فرہنگ ترتیب دیں۔ ان پر مفصّل مقدمات لکھے۔ ایک بڑے قابلِ قدر ذخیرے کو انہوں نے محفوظ کرلیا اور دوسروں کو تحقیق و تدوین کے ان کاموں کی قدر و قیمت کی طرف توجہ دلائی۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ تحقیق کے کام کو تشکیک، مہمیز کرتی ہے۔ عبدالحق کو بھی ''معراج العاشقین'' کے مصنف کے سلسلے میں شبہ تھا جو بعد ازاں صحیح ثابت ہوا۔ انہوں نے خود لکھا ہے کہ:

> ''ہمارے ہاں قدیم سے یہ دستور رہا ہے کہ لوگ اپنی تصانیف کو بعض مشاہیر اور نامور بزرگانِ دین سے منسوب کر دیتے ہیں..... اس بنا پر مجھے ہمیشہ یہ شبہ رہا کہ جو رسالے میرے پاس موجود ہیں، وہ حقیقت میں حضرت بندہ نواز کی تصنیف ہیں یا نہیں..... جب تک کوئی قطعی شہادت اس کی تائید میں نہ ہو، قیاس زیادہ قابل قبول نہیں ہوسکتا۔''

(تحقیق و تدوین-سمت و رفتار: ڈاکٹر محمد موصوف احمد، ص/۳۰۶)

''نکات الشعرا'' کو انہوں نے ایک مستند قلمی نسخے کو بنیاد بنا کر مرتب کیا۔ تذکرہ ریختہ گویان کو تین مختلف نسخوں سے مرتب کیا۔ ''قطب مشتری'' کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اسے دو نسخوں سے مرتب کیا ہے۔ مولوی عبدالحق تحقیق و تدوین کا شستہ مذاق رکھتے تھے۔ ان میں دقت طلبی، شوق اور لگن کا مادہ تھا۔ اصل ماخذ کی تلاش کو انہوں نے مقصدِ زندگی بنالیا تھا۔ انہوں نے اپنے فیصلوں میں کبھی عجلت اور جذباتیت کو آڑے آنے نہیں دیا۔ انہوں نے ''قطب مشتری'' کے مقدمے میں تنقیدِ متن کے بابت جن بنیادی اُمور کی نشان دہی کی ہے اس کا اطلاق ان تمام دکنی نسخوں کی ترتیب و تدوین کے طریق کار پر ہوتا ہے جو عبدالحق کی کوششوں سے منظر عام پر آئے۔

سحر انصاری نے انہیں نکات کے طور پر اس طرح مرتب کیا ہے۔

﴿۱﴾ قدیم دکھنی شاعر شعر کے وزن کی خاطر لفظ کو بری طرح توڑ مروڑ دیتے ہیں۔

﴿۲﴾ حرکات و سکنات میں بے تکلف ردّ و بدل کر دیتے ہیں۔

﴿۳﴾ بعض اوقات لکھتے تو پورا لفظ ہیں مگر پڑھتے اسے حذف کے ساتھ ہیں۔

﴿۴﴾ قدیم دکھنی شاعر اور ادیب لفظ جیسے بولتے ہیں، ویسے ہی لکھتے ہیں۔

﴿۵﴾ قدیم دکھنی کتابیں پڑھتے وقت ایک بات کا اور خیال رکھنا چاہیے کہ اس وقت بہت سے الفاظ کا تلفظ آج کل کے تلفظ یا تحریری صورت سے مختلف تھا۔'' (تحقیق و تدوین-سمت و رفتار: ڈاکٹر محمد موصوف احمد، ص/۳۰۷)

01.07 حافظ محمود شیرانی

محمود شیرانی کو تحقیق کا ''معلّمِ اوّل'' کہا جاتا ہے۔ وہ ایک محقّق، مدوّن اور ماہرِ لسانیات کے علاوہ فارسی ادبیات اور اس کی تاریخ کا بھی گہرا علم رکھتے تھے۔ محمود شیرانی کے تحقیقی کاموں میں پنجاب میں اُردو، تنقیدِ شعر العجم، آبِ حیات پر ایک نظر، مجموعہ نغز کی تصحیح، قدرت اللہ قاسم کے تذکرے اور یوسف زلیخا کی ترتیب و تدوین کی خاصی اہمیت ہے۔ ''تنقید شعر العجم اور آبِ حیات پر ایک نظر'' (نامکمل) میں انہوں نے اغلاط و تسامحات کی نشان دہی کی ہے۔ ''یوسف زلیخا'' کے بارے میں انہوں نے اس مقبول عام تصوّر کو غلط ثابت کیا کہ یہ فردوسی کا کارنامہ نہیں ہے۔ خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے کلام میں الحاقی عناصر کی نشان دہی کی ہے۔

''قصہ چہار درویش'' کو امیر خسرو کے بجائے ضیاء الدین خسرو کی تصنیف قرار دیا۔محمود شیرانی کی مشہور تصنیف ''پنجاب میں اُردو'' میں اُردو کی پیدائش کے سلسلے میں ان کا نظریہ اب اپنی معنویت کھو چکا ہے لیکن شیرانی نے جس طرح پنجابی، دکنی اور دوسری زبانوں کی چھان پھٹک کی ہے اور لسانی تجزیے کیے ہیں، ان کی قدر و قیمت کبھی کم نہیں ہوگی۔

رشید حسن خاں نے محمود شیرانی کے کارناموں کو معیاری اور مثالی قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

''اُردو میں تحقیق کا باضابطہ آغاز تو شیرانی صاحب سے ہوتا ہے۔ان کو بہ آسانی تحقیق کا معلم اوّل کہا جاسکتا ہے۔ نئے مآخذ کی تلاش اور اوّلین مآخذ کی اہمیت کا احساس ان ہی کے زمانے سے شروع ہوتا ہے۔ انہوں نے جرح وتعدیل اور احتساب کی صحت مند روایت قائم کی۔انہوں نے عملی طور پر یہ بتایا کہ عقیدت اور احتساب میں تضاد ہے اور اعترافِ کمال اور احتساب میں تضاد نہیں۔ ہمارا معاشرہ انتہا پسندی کی حد تک روایت پرست رہا ہے۔شیرانی صاحب نے اس روایت پرستی پر کاری ضرب لگائی اور ردّ وقبول کے لئے منطقی استدلال کی ضرورت کا احساس دلایا۔''

(تحقیق وتدوین سمت ورفتار ص/۱۳۵)

محمود شیرانی کا ذہن تحقیق کے تعلق سے بہت صاف تھا۔ان کا کہنا تھا کہ:

﴿۱﴾ تحقیق کا مطلب سچائی کی تلاش ہے۔

﴿۲﴾ جس سے علم انسانی میں اضافہ ہوتا ہے۔

﴿۳﴾ اس کے لئے مستقل جستجو اور لگاتار محنت درکار ہے۔

﴿۴﴾ حقائق پر مبنی جو علم ہمیں وِرثے میں ملا ہے وہ ہزاروں لوگوں کی صدیوں کی محنت کا نتیجہ ہے۔

﴿۵﴾ جوں جوں نئے حقائق ومصادر دریافت ہوتے جائیں گے سابقہ معلومات میں ترمیم وتنسیخ کے نتیجے میں ہمارا علم زیادہ معقول، اطمینان بخش اور جامع ہوتا چلا جائے گا۔

محمود شیرانی جس مسئلے پر قلم اُٹھاتے ہیں، ایک کے بعد ایک معلومات کا ایک سلسلہ سا قائم کر دیتے ہیں۔قدیم مآخذ کی تلاش میں وہ کوئی کور کسر اُٹھا نہیں رکھتے۔ جب تک خود مطمئن نہیں ہو جاتے اسے اپنی تحریر کا حصّہ نہیں بناتے۔استخراجِ نتائج میں ان کا استقلال اور یک سُوئی دوسروں کے لئے لائق تقلید عمل ہے۔متنی حقائق کی جستجو میں وہ لسانیات، تاریخ اور تہذیب کے وسائل بھی بروئے کار لاتے ہیں۔

تحقیق میں تقابل کو بھی حقیقت کی تہ تک پہنچنے کا ایک ذریعہ قرار دیتے ہیں۔انہوں نے محض خارجی شواہد ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ داخلی شہادتوں کی راہ سے بھی مقبولِ عام مغالطوں کو رفع کرنے کی کوشش کی۔ دراصل شیرانی مرحوم کو گم شدہ کتابوں کو دریافت کرنے میں لطف بے پایاں میسر آتا ہے۔خواہ اس طرح کی کوشش میں کتنی ہی دقتوں کا سامنا ہو۔

''پنجاب میں اُردو'' کا بنیادی نظریہ اب مسترد ہو چکا ہے، لیکن یہ تصنیف شیرانی مرحوم کی تحقیق وجستجو، وسعت علمی اور گہری لسانیاتی فہم سے ہمیں روشناس کراتی ہے۔اسے اُردو میں لسانیات کے موضوع پر لکھی ہوئی پہلی معیاری تحقیق سے موسوم کیا جاتا ہے۔

اس سلسلے میں کسی نے لکھا ہے۔

''شیرانی کے نزدیک معیاری تحقیق کا مطلب یہ ہے کہ اس سے کوئی علمی ادبی مسئلہ حل ہوتا ہو، کوئی غلط فہمی دور ہوتی ہو یا تہذیب و تاریخِ انسانی کا کوئی خلا پُر ہوتا ہو۔ شیرانی کے تحقیقی سرمائے کا غالب حصّہ تحقیق کامل کی شرائط پر پورا اُترتا ہے۔ انہوں نے بیسیوں ادبی اور لسانی مسائل کو موضوع بنایا، ان پر مدلل اور منطقی بحث کر کے اہم فیصلوں کا استنباط پوری چھان بین اور بحث و تمحیص کے بعد کیا۔''

01.08 قاضی عبدالودود

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تحقیقی شعور پیدا کرنے اور تحقیق کی روایت کی بنیاد رکھنے اور تحقیق کی اہمیت، افادیت اور ضرورت کا احساس دلانے میں محمود شیرانی کو اوّلیت حاصل ہے۔ رشید حسن خاں نے قاضی عبدالودود کو تحقیق کا معلّمِ ثانی کہا ہے۔ کیوں کہ قاضی صاحب نے تحقیق میں اُصول سازی، تحقیق کی زبان، تحقیق کے تقاضوں کو خاص موضوعِ بحث بنایا۔ قاضی صاحب نے احتیاط پسندی، صبر و تحمّل، بلا خوفی اور راست گفتاری اور غیر جذباتیت پر اصرار کیا۔ ان کے اِس رویے کے باعث تحقیق کو افتخار حاصل ہوا۔ بت شکنی کو ایک مثبت قدر کے طور پر اخذ کیا جانے لگا۔ ''غالب کا فرضی استاد'' میں غالبؔ نے عبدالصّمد کو اپنا استاد بتایا تھا اسے غالبؔ کی ذہنی اُپج قرار دیا۔ ''میر تقی میرؔ حیات اور شاعری'' کے تسامحات کی نشان دہی کر کے کئی مغالطوں پر قدغن لگا دیا ہے۔

''شاد کی کہانی شاد کی زبانی'' میں شاد کے اکثر بیانات کے جھوٹ کو ثابت کیا۔ فائز کی تاریخ وفات کا تعین کیا، اس کے دو بھائیوں کے نام بھی معلوم کیے اور یہ ثابت کیا کہ فائز کے والد کا نام محمود خلیل تھا۔ قاضی عبدالودود نے عبدالحق کی مرتب کردہ ''ذکرِ میر'' کی فروگذاشتوں پر سے پردہ اُٹھایا۔ اسے میر کی ناقص سوانح قرار دیا۔ مولوی عبدالحق کے بارے میں کہا کہ انہوں نے صرف ایک نسخے پر اکتفا کیا۔ ''نکات الشعرا'' کے سلسلے میں کہا کہ ''عبدالحق نے بنیادی نسخے کی تصریح نہیں کی اور اغلاط نے بہت سے اشعار کو مہمل بنا دیا ہے، گارساں دتاسی کی اسّی ۸۰/ اغلاط کی نشان دہی کی۔

دیوانِ رضا عظیم آبادی کی ترتیب، سوانح، املا، زبان فارسی کے مفردات و مرکّبات، ہندوستانی مفردات و مرکّبات اور تذکیر و تانیث وغیرہ کے عنوانات کے تحت اہم معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ قلق کے ''سفر آشوب'' کو دریافت کیا۔ جس میں واجد علی شاہ کی معزولی کے بعد کے مصائب کا بیان ہے۔ ارمغانِ بہار، دیوانِ نعیم دہلوی، دیوانِ نوازش، مثنوی مہاراجہ کلیان سنگھ عاشق، قطعاتِ دِلدار اور دیوان جوشش کو ترتیب دیا، مقدمات لکھے اور مختلف نسخوں سے تقابل کرتے ہوئے نیز خارجی اور داخلی شہادتوں کی بنیاد پر صحیح اور غلط کے فیصلے کیے۔

رشید حسن خاں نے قاضی عبدالودود کو تحقیق کا معلّمِ ثانی قرار دیتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے۔

''میرا خیال ہے کہ نئی نسل، تحقیق کے آداب اور انداز سے قاضی صاحب کے توسط سے آشنا ہوئی ہے۔ پچھلے پچیس تیس برسوں میں احتیاط پسندی کا جو رجحان بڑھا ہے، شک کرنے یا یوں کہیے کہ مضبوط دلیلوں کے بغیر دعوؤں کو قبول نہ کرنے کا انداز جس طرح فروغ پذیر ہوا ہے اور منطقی استدلال نے جس طرح اہمیت حاصل کی ہے اور زود یقینی اور خوش اعتقادی نے جس طرح کم اعتباری کی سند پائی ہے، اس میں قاضی صاحب

کی تحریروں کا بہت بڑا حصّہ ہے۔ ان کی بے لچک شخصیت، ان کا بے جھجک اندازِ گفتگو اور ان کے سخت گیر احتساب نے اس زمانے میں تحقیق کے طالب علموں کی ذہنی تربیت کی ہے اور ان کی تحریروں نے یہ بتایا ہے کہ تحقیق کی زبان اور پیرایۂ اظہار میں انشاپردازی، مرصّع کاری اور الفاظ کے بے محابا استعمال کی مطلق گنجائش نہیں۔ انہوں نے سچ بولنا سکھایا، مگر اس سے بڑا کام یہ کیا کہ سچ بولنے کا مطالبہ کرنے کو لازم قرار دیا، یہ بہت بڑا کام تھا۔''

(تحقیق وتدوین سمت ورفتار، ص/۱۳۵)

01.09 امتیاز علی خاں عرشی

امتیاز علی خاں عرشی ماہر غالبیات تھے۔ غالبؔ ان کی سب سے بڑی کمزوری اور سب سے بڑی طاقت تھے۔ قاضی عبدالودود تحقیق کی زبان کو کھری، واضح، آرائش وزیبائش سے عاری قرار دیتے ہیں۔ جو کڑوی سچائیوں سے مملو ہوتی ہے لیکن بعض حضرات نے اسی بنیاد پر قاضی صاحب کی زبان کو روکھی، پھیکی قرار دیا اور یہ بھی کہا کہ اس قسم کی زبان قرأت نواز یا Readable کم ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے عرشی کے اُسلوب میں ادبیت کا رنگ گہرا ہوتا ہے۔ وہ زیادہ اپیل کرتی ہے۔ تحقیق میں وہ ایک نقّاد کا رول بھی انجام دیتے ہیں۔ مولانا عرشی نے غالبؔ کے ضمن میں جو اعلیٰ درجے کے کام کیے ہیں وہ یہ ہیں۔

﴿۱﴾ ''مکاتیب غالب'' ۱۹۳۷ء کے عنوان سے نواب یوسف علی خاں اور نواب کلب علی خاں کے نام لکھے ہوئے غالبؔ کے خطوط کی ترتیب وتدوین ہے جس میں ایک تحقیقی وتنقیدی نوعیت کا طویل مقدّمہ بھی شامل ہے۔

﴿۲﴾ ''انتخابِ غالب'' ۱۹۴۳ء غالبؔ کے اُردو اور فارسی کلام کا انتخاب اس کا دیباچہ بھی عرشی صاحب کی تحقیقی بصیرت کے ساتھ ساتھ تنقیدی شعور کا مظہر ہے۔

﴿۳﴾ ''دیوانِ غالب عرشی'' ۱۹۵۸ء کی اس لحاظ سے بڑی قدر و قیمت ہے کہ عرشی صاحب نے بڑی دیدہ ریزی اور جَفا کَشی سے غالبؔ کے کلام کو تاریخ وار مرتب کیا ہے۔ اسے انہوں نے تین ابواب میں تقسیم کیا ہے۔

(الف) 'گنجینۂ غالب' کے عنوان سے پہلے باب میں ابتدائی کلام شامل ہے۔

(ب) 'نوائے سروش' کے تحت وہ کلام شامل ہے جسے آپ نے اپنی زندگی میں شائع کر دیا تھا اور جو ان کے متداول دیوان میں نہیں ملتا۔

(ج) 'یادگارِ نالہ' کے تحت وہ کلام شامل کیا ہے جو کسی مکتوب یا دیوان کے کسی حاشیے یا کسی بیاض میں اُنہیں ملا تھا۔

''دیوانِ غالب'' کے مقدّمہ میں تحقیق وتنقید کا امتزاج ہے۔ عرشی صاحب نے غالبؔ کے تنقیدی ذہن سے بھی پردہ اُٹھایا ہے۔ 'طرزِ سخن' کے تحت غالبؔ 'طرز' سے کیا مراد لیتے تھے۔ 'تعریفِ شعر' کے تحت شاعری کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر کیا تھا اور 'عیوبِ شعر' کے تحت یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ غالبؔ کن چیزوں کو عیوبِ شعر کے طور پر اَخذ کرتے تھے۔

﴿۴﴾ حقائق پر مبنی جو علم ہمیں ورثے میں ملا ہے وہ ہزاروں لوگوں کی صدیوں کی محنت کا نتیجہ ہے۔

عرشی صاحب نے انشاؔ کی ''رانی کیتکی کی کہانی'' کی تدوین میں سائنسی اُصولوں کوملحوظ رکھا اور رانی کیتکی کی زبان کے بارے میں اظہارِ خیال کیا۔ انشاؔ کی دوسری تصنیف ''سلک گوہر'' کو بھی مقدمے کے ساتھ شائع کیا۔ عرشی صاحب نے انشاؔ کے طرزِ تحریر کی خصوصیات بیان کی ہیں اور انشاؔ کی سوانح پر خصوصی توجہ دی ہے۔ شاہ عالم کے مجموعۂ کلام ''نادراتِ شاہی'' کو مرتب کیا جس میں شاہ عالم کا وہ کلام شامل ہے جوانہوں نے فارسی، اُردو اور برج بھاشا میں لکھا تھا۔ اپنی نوعیت کا یہ ایک اہم کارنامہ ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم کی نظر میں مولانا عرشی، اُردو کے پہلے متنی نقّاد ہیں کیوں کہ بقول ان کے:

> ''شیرانی صاحب کے مجموعۂ نغز اور قاضی عبدالودود صاحب کے 'دیوانِ جوشش' سے قبل عرشی صاحب کی مرتبہ 'مکاتیب غالب' شائع ہو چکی تھی لیکن ان دونوں حضرات نے متنی تنقید کے اس بہترین کام کو اپنے لئے نمونہ نہیں بنایا۔''

فرہنگِ غالب، فارسی مکاتیبِ غالب، برہانِ قاطع، وقائع عالم شاہی، تاریخِ محمدی، تاریخ قندھاری، تاریخِ اکبری، محاوراتِ بیگمات اور 'ترجمۂ مجالسِ رنگیں' بھی مولانا عرشی کے اہم تحقیقی وتدوینی کارنامے ہیں۔ اگرچہ ''دستور الفصاحت'' فارسی زبان میں ہے لیکن اُردو قواعد و لسان کے اعتبار سے یہ ایک مستقل حوالے کا حکم رکھتی ہے۔ عرشی صاحب نے سید احمد علی یکتا لکھنوی کی اس تصنیف کو مرتب کرنے میں بڑی جاں فشانی کی ہے۔ اس کا مقدّمہ ۱۱۷ صفحات پر مشتمل ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے (ارمغان، ص ۴۶۲) پر اس کے بارے میں لکھا ہے کہ:

> ''اگر میں غلط نہیں ہوں تو اس سے پہلے کسی بھی تذکرے کے تنقیدی اڈیشن پر اتنا تفصیلی مقدّمہ نہیں لکھا گیا اور نہ ہی متن کے اتنے مختلف پہلوؤں سے بحث کی گئی۔ یہ مقدّمہ خود اپنی جگہ پر ایک کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس تنقیدی ایڈیشن کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ عرشی صاحب نے حواشی لکھنے میں ۵۸ تذکروں سے مدد لی ہے۔ دستور الفصاحت میں ۳۵ شاعروں کا ذکر ہے، ان ۵۸ تذکروں میں جہاں کہیں ان شاعروں کا ذکر آیا ہے جو دستور الفصاحت میں شامل ہیں، عرشی صاحب نے وہ عبارتیں نقل کر دی ہیں۔ کتاب کے آخر میں اشخاص اور کتابوں کا اشاریہ دیا گیا ہے۔''

اس وضاحت کے بعد خلیق انجم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ۔

> ''عرشی صاحب نے جس متن کا بھی تنقیدی ایڈیشن تیار کیا ہے۔ وہ محمود شیرانی مرحوم اور قاضی عبدالودود کے مرتب کیے ہوئے تنقیدی ایڈیشنوں سے بہت بہتر ہے۔''

01.10 مالک رام

مالک رام کے تحقیقی اور تدوینی کاموں کی فہرست طویل ہے۔ وہ ماہرِ غالبیات ہیں، اسلامیات کا گہرا علم رکھتے ہیں۔ ایک گراں قدر تدوین کار اور مرقّع نگار ہیں۔ انہیں مولانا ابوالکلام کی تصنیفات سے غیر معمولی دل چسپی تھی۔ انہوں نے ترجمان القرآن، غبارِ خاطر، تذکرہ اور خطبات آزاد کو بڑی ذمہ داری اور تن دہی کے ساتھ مرتب کیا۔ غالبؔ کے سلسلے میں ذکرِ غالب، تلامذۂ غالب، فسانۂ غالب، گفتارِ غالب

کے علاوہ مرتب کردہ 'دیوانِ غالب (اُردو)' خطوطِ غالب اور گلِ رَعنا کی تدوین جیسے بڑے وقیع اور گراں قدر کام کیے۔ان کے علاوہ 'عورت اور اسلام' ایرانی شہنشاہی کے ڈھائی ہزار سال، وہ صورتیں الٰہی، قدیم دلّی کالج، تذکرۂ ماہ وسال اور تقریباً ۲۰۰ رمضامین مالک رام کی غیر معمولی تحقیقی، تنقیدی اور تدوینی بصیرت کے مظہر ہیں۔ مالک رام کے تحقیقی وتدوینی کاموں کے معیار کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے:

﴿۱﴾ تحقیق وتدوین ایک بے حد ذمہ داری اور جاں فشانی کا کام ہے جس کی ایک عمدہ مثال خود مالک رام ہیں۔

﴿۲﴾ صحیح متن کی دریافت میں قواعد، لسانیات، عروض، تاریخ، معاشرت اور تہذیب کا علم بھی ضروری ہے۔

مالک رام نے خود بھی اسے اپنا لائحہ عمل بنایا۔

﴿۳﴾ مصنّف کے وضاحت طلب مشعرات (Allussions) حوالہ جات، اقتباسات، اشخاص، مقامات اور کتابوں کے عنوانات و اسما کی وضاحتی فرہنگ ضروری ہے جس سے متن کی تفہیم کی راہ آسان ہوجاتی ہے۔اس ضمن میں مالک رام کے تدوینی کاموں کو ایک اعلیٰ مقام حاصل ہے۔

﴿۴﴾ سوانح عمریوں یا کسی مصنّف کی حیات، صحیح تاریخ پیدائش ووفات، اس سے وابستہ واقعات، اس سے منسوب تحریروں کی چھان پھٹک ایک نہایت دقت طلب عملیہ (Process) ہے اور سچائی کی تلاش کا راستہ ہمیشہ مشکل اور صبر آزما ہوتا ہے۔اس ذیل میں مالک رام کوئی دقیقہ نہیں چھوڑتے۔

﴿۵﴾ ماخذ کی تحقیق اور ان تک رسائی حاصل کرنے کے لئے قیاسات ومفروضات سے جہاں تک ہوسکے کم سے کم کام لینا چاہیے۔اس تصوّر کو بھی مالک رام نے ہمیشہ اپنے پیشِ نظر رکھا ہے۔

﴿۶﴾ مالک رام کا یہ بھی کہنا ہے کہ محقّق کو عبارت آرائی اور اُسلوب کی پرستاری سے بچنا چاہیے۔ مالک رام کا طرزِ تحریر واضح، تنقیدی اور علمی ہے۔توضیح وتصریح ان کے اُسلوب کی خاص پہچان ہے۔

01.11 رشید حسن خاں

گیان چند جین نے اُردو کے مشہور ومعروف مزاح نگار رشید احمد صدیقی کے حوالے سے لکھا ہے کہ انہوں نے اپنے مضمون ''پاسبان'' میں تحقیق پر گورکندن واستخواں برآوردن (قبر کھودنا اور ہڈیوں کا برآمد ہونا) کی پھبتی چست کی ہے۔گیان چند اس کا معقول جواب ان لفظوں میں دیتے ہیں کہ ''تحقیق زمین کندن ضرور کرتی ہے لیکن اس کا صلہ ریزۂ استخواں نہیں، موہن جوداڑو (Mohenjo-daro)، ہڑپہ (Harappa)، بیجاپور اور گولکنڈہ کی بازآفرینی ہے''۔

ظاہر ہے تحقیق ایک انتہائی دقت طلب اور صبر طلب علمی کام ہے جسے انسانی تہذیب وتمدّن کے ارتقا کی ایک کلید کہا جاتا ہے۔اس کے لئے ایک ایسا ذہن مطلوب ہے جس میں کرید ہو، کچھ نیا جاننے کا جذبہ ہو، جو چیزوں کو شبہ سے دیکھنے والی نظر رکھتا ہو۔ بے خوفی جس کی عادت ہو۔جو علمی ترقّی کے انسانی مشن میں خود بھی حصّہ دار بننا چاہتا ہو۔ جسے لسانی، عروض، قواعد اور کلاسیکی تاریخ ادبیات سے خاص دل چسپی ہو نیز ایک خاص قسم کی دیوانگی، علمی شوق اور تڑپ تحقیق کے لئے لازمی ہے۔ یہ ساری چیزیں وہ ہیں جو یکجا ہوکر رشید حسن خاں کی شخصیت کی تشکیل کرتی ہیں۔

رشید حسن خاں نے دراصل محمود شیرانی، قاضی عبدالودود اور امتیاز علی عرشی کی روایت کی توسیع کی، ان کے تصوّرات و تجربات سے فائدہ اُٹھایا۔ بلاخوفی کو اپنا مسلک بنایا۔ متن شناسی اور متنی تنقید کے معیار مقرّر کیے۔ تحقیق و تدوین کے اُصول بنائے اور ان کا اطلاق کیا۔ جہاں ضروری ہوا تنقید سے بھی کام لیا۔ اُردو املا کے اصول بنائے، جو غلط فہمیاں رواج پا گئی ہیں ان کا سدِّ باب کیا۔ اس لحاظ سے رشید حسن خاں کے ان مضامین کی خاص اہمیت ہے جو انہوں نے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں ترتیب کردہ تاریخ ادب اُردو کی پہلی جلد جمیل جالبی کی تاریخ ادب اُردو کی پہلی جلد ''دیوانِ غالب صدی ایڈیشن'' مرتبہ مالک رام اور 'اُردو شاعری کا انتخاب' مرتبہ ڈاکٹر محی الدین زور پر تحقیقی مضامین قلم بند کیے ہیں۔ رشید حسن خاں نے ان کتابوں میں جو خامیاں راہ پا گئی تھیں اور جو اغلاط و تسامحات گمراہی کا باعث تھیں انہیں طشت از بام کیا۔ اُردو املا، زبان و قواعد کے مسائل پر بھی انہوں نے اُصولی بحثیں کیں۔

انہوں نے بعض ان سفارشات کو جوں کا توں رکھا جنہیں عبدالستار صدیقی نے بڑی دیدہ ریزی سے تیار کیا تھا۔ خان صاحب نے اپنی طرف سے بھی کچھ منطقی نوعیت کی سفارِشات پیش کی ہیں۔ کئی اداروں نے اپنے یہاں ان کا اطلاق کیا اور رائج کیا۔ اس سلسلے میں خان صاحب کی کتاب ''اُردو اِملا'' ۱۹۶۷ء اور دوسرے مضامین کا مجموعہ ''زبان اور قواعد'' ۱۹۷۶ء ایک بڑے فارمیٹ پر ایک بڑا تاریخی کارنامہ ہے جو قواعد شاعری سے متعلّق ہے۔

رشید حسن خاں کا مرتب کردہ 'انتخابِ ناسخ' اپنے طویل اور مدلّل مقدمے کے اعتبار سے بہت اہم کام ہے۔ یہ ایک عام غلط فہمی راہ پا گئی تھی کہ ''اصلاحِ زبان'' کے قاعدے ناسخ کے ذہن کی پیداوار ہیں۔ دراصل ان قاعدوں، ضابطوں اور متروکات کی فہرست ناسخ کے ایک شاگرد میر اوسط علی اشک کی تیار کردہ تھی انہوں نے اسے ناسخ سے منسوب اس لئے کیا تھا کہ استاد کے نام سے اسے استناد کا درجہ حاصل ہو سکتا ہے۔ رشید حسن خاں نے اس مقبول عام مغالطے کا ازالہ کیا۔ رشید حسن خاں کے جن کاموں نے ان کا ایک بلند کوش تصوّر قائم کیا ہے وہ یہ ہیں۔

﴿۱﴾ تدوینِ باغ و بہار ۱۹۹۲ء ﴿۲﴾ تدوینِ سحر البیان

﴿۳﴾ تدوینِ فسانۂ عجائب ۱۹۹۰ء ﴿۴﴾ تدوینِ گلزار نسیم ۱۹۹۵ء

ان کے علاوہ مثنویاتِ شوق کی تدوین، زٹل نامہ (کلیاتِ جعفر زٹلی) کی تدوین اور طلبا و اساتذہ کی خاص تربیت کی غرض سے اُردو کیسے لکھیں ۱۹۷۵ء انشا اور تلفظ ۱۹۹۴ء اور کلاسیکی ادب کی فرہنگ جیسے مفید مطلب اور دقت طلب کام بھی انجام دیے۔ اسی سلسلے کی کڑی کے طور پر مصطلحاتِ ٹھگی جیسے معلومات افزا کام کو دیکھنا چاہیے۔ رشید حسن خاں تحقیق ہی نہیں تنقید کے بھی شہسوار ہیں۔ ''تلاش و تعبیر'' نام کا تنقیدی مضامین کا مجموعہ ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا تھا۔ جس میں جوشؔ اور فیضؔ سے متعلق متنازع فیہ مضامین بھی شامل ہیں۔ ان کے تنقیدی مضامین کا دوسرا مجموعہ ''تفہیم'' کے نام سے ۱۹۹۳ء میں شائع ہوا تھا۔ ان کے اکثر تحقیقی مضامین و مقدمات میں بھی تحقیق و تنقید کا خوب صورت امتزاج ملتا ہے۔

رشید حسن خان کے تحقیقی و تدوینی طریقِ کار کی خصوصیات کو اس طرح مرتب کیا جا سکتا ہے۔

﴿۱﴾ تحقیق کے عمل میں وہ قاضی عبدالودود کے پیرو ہیں اور تدوین کے عمل میں مولانا امتیاز علی عرشی کی تقلید پر اساس رکھتے ہیں۔

﴿۲﴾ متنی تنقید کے معیار مقرّر کیے اور خود بھی عملاً گراں قدر نمونے پیش کیے۔

﴿۳﴾ باغ و بہار، فسانۂ عجائب، گلزارِ نسیم، سحرالبیان اور مثنویاتِ شوق کو جس طرح سائنٹفک انداز میں پیش کیا، اس سطح کی کوئی دوسری مثال مشکل ہی ملے گی۔ ان کلاسیکی تصانیف کی تدوین متنی تنقید کے ضابطوں کے مطابق کی گئی ہے۔ حاشیوں میں متن سے متعلّق تشریحی ولسانی پہلوؤں کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔ اشخاص، مقامات وغیرہ پر وضاحتی نوٹ درج کیے گئے ہیں۔ ایسے الفاظ جن کا تلفّظ اب بدل چکا ہے۔ ''ضمیمے میں ان پر وضاحتی حواشی لکھے ہیں''، متن میں اعراب، علامات اور رموزِ اوقاف کا التزام بھی رکھا ہے، مختلف نسخوں کی بنیاد پر اور جہاں تک ممکن ہوسکا منشائے مصنّف کے مطابق ان تصانیف کی تدوین کی گئی ہے۔

﴿۴﴾ ڈاکٹر خلیق انجم کے خیال کے مطابق: اُردو میں رشید حسن خاں کے پایہ کا کوئی اور متنی نقّاد ابھی تک پیدا نہیں ہوا۔ خاں صاحب کو متنی تنقید کے سائنٹفک طریقوں پر قدرت حاصل ہے۔ وہ املا اور تلفظ کے ماہر ہیں، اسی لئے وہ متن کا جس طرح تنقیدی ایڈیشن تیار کرتے ہیں وہ کوئی اور نہیں کرسکتا، غالباً اسی بنیاد پر گیان چند نے انہیں ''خدائے تدوین'' کے لقب سے نوازا ہے۔

﴿۵﴾ رشید حسن خاں، زبانی روایتوں پر کبھی بھروسہ نہیں کرتے۔ وہ روایتوں کی چھان پھٹک کا طریقہ بھی بتاتے ہیں۔ انہوں نے ''مثنویاتِ شوق'' کے بارے میں ایسی کئی روایتوں کا ذکر کیا ہے، جنہیں اکثر بغیر تحقیق وتأمّل کے حوالے کے طور پر اخذ کیا جاتا رہا ہے۔

﴿۶﴾ تحقیق کے لئے تحقیقی مزاج کا ہونا بنیادی چیز ہے۔

﴿۷﴾ پروفیسر حنیف نقوی نے انہیں بے لاگ محقّق قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

> ''اُردو میں ادبی تحقیق کو جن لوگوں کی بدولت آبرومندانہ مقام حاصل ہوا ہے، ان میں رشید حسن خاں کا نام ایک روشن چراغ کی حیثیت رکھتا ہے۔ قاضی عبدالوَدود کے بعد وہ دوسرے شخص ہیں جنہوں نے اوہام و مفروضات کے ہر بت کو توڑنے اور ہر حقیقت کو واشگاف انداز میں بیان کرنے کا فریضہ کسی تأمّل اور تکلّف کے بغیر پوری جرأت مندی اور راست بازی کے ساتھ انجام دیا ہے۔''
>
> (رشید حسن خاں کچھ یادیں کچھ جائزے، ص..۱۶۴)

﴿۸﴾ رشید حسن خاں کی زبان رُوکھی پھیکی نہیں ہے لیکن استعاراتی یا رنگین بھی نہیں ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ''تاریخ اور تحقیق کی زبان کو مبالغے سے پاک اور عبارت آرائی سے محفوظ رہنا چاہیے''۔ خان صاحب تادمِ آخر اسی قول پر قائم رہے۔

﴿۹﴾ رشید حسن خاں کے نزدیک تحقیق ایک مسلسل عمل ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ تحقیق میں اصلیت کا تعین اس وقت تک کی حاصل شدہ معلومات پر مبنی ہوتا ہے۔ اس سے آئندہ کے امکانات کی نفی نہیں ہوتی۔

﴿۱۰﴾ تحقیق میں اعداد وشمار کی جمع کاری کو اہمیت دینے کے باوجود ان کا خیال ہے:

> ''تحقیق میں اعداد وشمار اور مطلق حقائق کا تعیّن بنیادی چیز ہے لیکن یہی سب کچھ نہیں۔ یہ اس کا ابتدائی حصّہ ہے، بے حد ضروری لیکن اہم کام یہ بھی ہے کہ جن حقائق کا تعیّن کیا گیا ہے، دیکھا جائے کہ ان سے کیا نتائج نکلتے ہیں اور ان سے علم وآگہی میں کس نوعیت کا اضافہ ہوتا ہے۔''
>
> (رشید حسن خاں، کچھ یادیں کچھ جائزے، ص...۱۵۶...۱۵۷)

رشید حسن خاں تحقیق وتدوین کی اس عظیم روایت کی آخری کڑی ہیں جس کی ابتدا حافظ محمود شیرانی سے ہوئی، جس کی رفتار کو تیزی و استحکام قاضی عبدالودود اور مولانا عرشی نے بخشا اور جس کی انتہا رشید حسن خاں پر ہوتی ہے۔ اُردو تحقیق وتدوین کی تاریخ میں جن حضرات نے کئی اعلیٰ درجے کے کام کیے ہیں اُن میں مسعود حسین رضوی ادیب، مختارالدّین احمد، ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ، گیان چند جین، مسعود حسین خاں، نصیرالدین ہاشمی، تنویر احمد علوی، مشفق خواجہ اور حنیف نقوی شامل ہیں۔ ان حضرات نے اُردو تحقیق وتدوین کی تاریخ کو مالا مال کیا اور آنے والی نسلوں کے لئے رَہ نمائی کے اصول بھی قائم کیے۔

01.12 خلاصہ

اُردو میں تحقیق وتدوین کا آغاز سرسید احمد خاں کے اُن تحقیقی وتدوینی کاموں سے ہوتا ہے جن کا موضوع تاریخ تھا اور جو فارسی زبان میں تھیں ''آثارالصنادید'' تحقیق کا ایک اعلیٰ درجے کا کارنامہ ہے لیکن سرسید نے یہ سارے کام اپنے طور پر انجام دیے تھے۔ ان کے سامنے نئے سائنٹفک اصول نہیں تھے۔ پھر بھی ان میں ربط وضبط کا گہرا شعور ملتا ہے۔ اُردو میں حافظ محمود شیرانی سے تحقیق وتدوین کی ایک نئی روایت قائم ہوتی ہے۔ محمود شیرانی نے یہ واضح کیا کہ محقّق کو زبان، قواعد، عروض، تاریخ وتہذیب کا علم بھی ضروری ہے۔

رشید حسن خاں نے انہیں تحقیق کا معلّمِ اوّل کہا ہے۔ مولوی عبدالحق نقّاد ومحقّق تھے۔ انہوں نے دکنی ادبیات کی تلاش کی طرف خاص توجہ کی اور ڈاکٹر محی الدین زور، نصیرالدین ہاشمی، عبدالقادر سروری اور شمس اللہ قادری کی روایت میں توسیع کی اور قطب مشتری اور سب رَس کے علاوہ اور کئی مخطوطات اور رسالے دریافت کیے۔ قاضی عبدالودود ایک بے خوف محقّق تھے۔ انہوں نے سائنسی اُصولوں کے مطابق تحقیق و تدوین کی۔ رشید حسن خاں نے انہیں اُردو تحقیق کا معلّمِ ثانی قرار دیا ہے۔ قاضی عبدالودود کے علاوہ امتیاز علی عرشی نے تحقیقی وتدوینی کارناموں سے اِس روایت کی توسیع کی اور اسے استحکام بخشا۔ عرشی صاحب کے کاموں کی ایک لمبی فہرست ہے۔ خصوصاً غالبؔ سے متعلّق ان کے تحقیقی و تدوینی کاموں کا ایک اعلیٰ مقام ہے۔ اس روایت کی توسیع مالک رام اور رشید حسن خاں نے کی اور یہ سلسلہ حنیف نقوی تک جاری ہے۔

01.13 فرہنگ

استنباط	: نتیجہ	تہ	: اصل، بنیاد، حقیقت
اہداف	: ہدف کی جمع، نشانہ	فقدان	: کمی
بازیافت	: جس کی دوبارہ تلاش کی گئی ہو، دریافت	قباحت	: عیب، برائی
تالیف	: کسی کتاب کو مرتب کرنا	متنازعہ فیہ	: وہ بات جو جھگڑے کا باعث ہو
تسامحات	: تسامح کی جمع، غلطی	مشعرات	: Allussions
تصریح	: صراحت، وضاحت	مؤلّف	: ترتیب کار، تدوین کار

01.14 سوالات

مختصر سوالات

سوال نمبر۱ : سرسید احمد خاں نے کن تاریخی کتابوں کی تدوین کی تھی؟

سوال نمبر۲ : رشید حسن خاں کے بارے میں خلیق انجم کی کیا رائے ہے؟

سوال نمبر۳ : قاضی عبدالودود کے اہم تحقیقی وتدوینی کاموں کے نام بتایئے؟

سوال نمبر۴ : محمود شیرانی نے اپنی کس کتاب میں لسانیاتی بحث کو بنیاد بنایا ہے؟

تفصیلی سوالات

سوال نمبر۱ : مالک رام کی تحقیق وتدوین کا معیار کیا ہے؟ واضح کیجیے۔

سوال نمبر۲ : محمود شیرانی کو اُردو تحقیق کا ''معلم اوّل'' کیوں کہا جاتا ہے؟

سوال نمبر۳ : کیا قاضی عبدالودود کو اُردو تحقیق کا معلمِ ثانی کہا جاتا ہے؟ اور کیوں؟

سوال نمبر۴ : اُردو تحقیق وتدوین کی روایت میں رشید حسن خاں کے مقام کا تعین کیجیے۔

معروضی سوالات

سوال نمبر۱ : حافظ محمود شیرانی کو ''اُردو تحقیق کا معلّمِ اوّل'' کس نے کہا ہے؟

(الف) تنویر احمد علوی (ب) حنیف نقوی (ج) گیان چند جین (د) رشید حسن خاں

سوال نمبر۲ : رشید حسن خاں کو ''خدائے تدوین'' کے لقب سے کس نے نوازا ہے؟

(الف) مالک رام (ب) گیان چند جین (ج) مختار الدین احمد (د) مسعود حسین خاں

سوال نمبر۳ : ڈاکٹر عطش درّانی نے اُردو تحقیق کے کتنے دبستان بتائے ہیں؟

(الف) دو (ب) چار (ج) تین (د) چھ

سوال نمبر۴ : ''نادراتِ شاہی'' کی تدوین کس نے کی ہے؟

(الف) امتیاز علی عرشی (ب) قاضی عبدالودود (ج) سرسید (د) مالک رام

معروضی سوالات کے جوابات

جواب نمبر۱ : (د) رشید حسن خاں جواب نمبر۳ : (ج) تین

جواب نمبر۲ : (ب) گیان چند جین جواب نمبر۴ : (الف) امتیاز علی عرشی

01.15 حوالہ جاتی کتب

۱۔ شعرائے اُردو کے تذکرے از ڈاکٹر حنیف نقوی

۲۔ ارمغان از مرتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

۳۔ تاریخ ادب اُردو (جلد سوم) از سیدہ جعفر

۴۔ رشید حسن خاں، کچھ یادیں کچھ جائزے از جاوید رحمانی

۵۔ تحقیق وتدوین از ڈاکٹر موصوف احمد

اکائی 02 : تحقیق کا فن اور اصول

ساخت :

02.01 : اغراض ومقاصد

02.02 : تمہید

02.03 : تحقیق کا معنی ومفہوم

02.04 : سائنسی علوم میں تحقیق

02.05 : سماجی علوم میں تحقیق

02.06 : سائنسی اور سماجی علوم میں تحقیق کے طریقۂ کار میں فرق وامتیاز

02.07 : تحقیق کا فن

02.08 : تحقیق کی تعریف

02.09 : تحقیق کے اصول اور طریقۂ کار

02.10 : خلاصہ

02.11 : فرہنگ

02.12 : سوالات

02.13 : حوالہ جاتی کتب

02.01 اغراض ومقاصد

تحقیق کا تعلّق محض ادب سے نہیں ہے۔تقریباً تمام علوم میں تحقیق ایک شرط کی حیثیت رکھتی ہے۔تحقیق کا عمل،علوم کے دائرے کو وسعت بخشتا اور اس کی ترقّی کی رفتار کو تیز تر کرتا ہے۔اگر تحقیق نہ ہو تو ترقّی کی راہیں مسدود ہو جائیں۔انسانی بصیرتوں کی جِلا کے پیچھے بھی تحقیق ہی کارفرما ہوتی ہے۔ادب کی تاریخ بھی ایک انتہائی حسّاس ترین شعبہ ہے جس میں غلطیوں اور کوتاہیوں کی کافی گنجائش ہوتی ہے۔ان غلطیوں اور کوتاہیوں کا پتہ لگانا اور حقائق تک پہنچنا بھی یوں ضروری ہوتا ہے کہ ادبی تاریخ کے قاری، اُردو ادب کے اساتذہ وطلبا گمراہیوں سے محفوظ رہ سکیں۔ایک ادبی تحقیق کا یہ کام ہوتا ہے کہ وہ سچ اور جھوٹ میں امتیاز قائم کر سکے۔حقائق کی دریافت کر سکے اور الحاقی عناصر کی کاٹ چھانٹ کر سکے یا ان کی دلائل واسناد کی بنیاد پر نشان دہی کر سکے۔

اس اکائی کا مقصد بھی یہی ہے کہ ہمارے طلبا تحقیق کا بنیادی علم حاصل کر سکیں اور یہ جان سکیں کہ اس کے اُصول وضوابط کیا ہیں؟اس کا طریقۂ کار کیا ہے؟اس میں کس طرح سے تحقیق کی جاتی ہے اور کن نکات کو ذہن میں محفوظ رکھنا چاہیے۔

02.02 تمہید

تحقیق ایک فن ہے۔جس کے اپنے کچھ اُصول بھی ہیں۔ ہر علم کے کچھ بنیادی اُصول ہوتے ہیں۔جن سے اس کی شناخت ہوتی ہے۔اس اکائی کا مقصد تحقیق کے فن کے بارے میں معلومات مہیا کرنا ہے یعنی تحقیق کے عمل کی کیا نوعیت ہے؟ اس کا طریقۂ کار کیا ہے؟ وہ کن اُصولوں پر کار بند ہوتا ہے؟ اس اکائی کے مطالعے کے بعد ہمارے طلبا تحقیق کے فن، اس کی بنیادوں، اس کے طریقِ عمل، اس کے تقاضوں اور اس کے اُصولوں کے بارے میں ہمہ جہت علم سے بہرہ ور ہو جائیں گے۔

02.03 تحقیق کا معنی و مفہوم

تحقیق کو انگریزی میں **Research** کہتے ہیں۔جس کے معنی حقائق یا اُصولوں کی دریافت، کھوج اور تفتیش کے ہیں۔یعنی باقاعدہ چھان بین کا عمل، کڑے مطالعے اور کھوج بین یا تفتیش کے ذریعے نئے حقائق کی دریافت یا معلوم شدہ اور تحقیق شدہ مواد یا دریافت وغیرہ کو سائنسی اُصولوں کی بنیاد پر ازسرِ نَو پرکھنا اور نئے نتائج کا استنباط کرنا۔گویا تحقیق محض نئے حقائق کی دریافت ہی سے عبارت نہیں ہے بلکہ دریافت شدہ حقائق کی ازسرِ نَو تحقیق کا کام بھی اس کے احاطۂ عمل میں آتا ہے۔اسی معنی میں تلاش **Search** یا تفتیش **Investigation** کے بجائے ادب اور مختلف علوم میں ریسرچ کی اصطلاح مروّج ہے۔

ریسرچ **Research** کی اصطلاح کو ایک سند کا درجہ حاصل ہے کیوں کہ تحقیق ایک سلسلۂ جاریہ ہے۔دُنیا امکانات سے معمور ہے۔ ماضی سے جو چیزیں ہم تک پہنچتی ہیں، ان کی ترسیل کا ذریعہ محض تحریری متون ہوتے ہیں۔متون یا تو سینہ بہ سینہ یا تحریر کی شکل میں بعد کی نسلوں تک پہنچتے ہیں۔اکثر متون مخطوطات کی شکل میں مبہم، غیر واضح اور مسخ شدہ ہوتے ہیں یا مختلف کاتبوں اور ترتیب کاروں کے تیار کردہ ہوتے ہیں۔بعض متون میں کسی نے اپنی طرف سے کچھ اضافہ کر دیا ہے یا بعض متون میں کاٹ چھانٹ کر دی ہے۔کہیں لفظوں کی تبدیلی واقع ہو گئی ہے یا تصحیح و اصلاح کے نام پر اس کی اصل ہی کو مسخ کر دیا ہے۔اس لئے سائنس اور ادب ہی میں نہیں دوسرے تمام علوم مثلاً تاریخ، اقتصادیات، عمرانیات، تہذیبیات، نفسیات اور فلسفہ میں تخلیقی سرگرمی ہمیشہ جاری رہتی ہے۔جس کے باعث ان کے معنوی دائرے وسیع ہوتے ہیں۔ترقّیِ انسانی کا کارواں تیزی کے ساتھ آگے بڑھتا رہتا ہے۔انسانی ذہن و بصیرت کو بیش از بیش جِلا ملتی ہے۔قوموں کی ذہنی ترقّی کا دار و مدار تحقیق و دریافت کے ساتھ مربوط ہے۔تحقیق، انسانی ترقّیات پر مہمیز کرتی ہے۔ماضی کو اس کی اصل شکل میں واضح کرنے کی سعی کرتی اور مستقبل سازی کے لئے ایک پورا لائحہ عمل مہیا کرتی ہے۔

02.04 سائنسی علوم میں تحقیق

ایک تحقیق کا تعلّق سائنسی تجربات سے ہے۔سائنس داں گزشتہ تحقیقات کے تناظر میں نئے حقائق کی دریافت کے لئے کوشاں ہوتا ہے۔ش.اختر نے اس سلسلے میں وضاحت کرتے ہوئے علمِ طبیعیات میں ریسرچ کے طریقِ کار کو موضوع بنایا ہے۔وہ لکھتے ہیں۔

> ''ریسرچ علم طبیعیات میں مادہ اور توانائی کے برتاؤ اور رویّے سے وابستہ ہے۔علم حیاتین (حیاتیات) میں زندگی کی پیدائش، نشو و نما اور بقا سے متعلّق نئے گوشوں کو بے نقاب کرتا ہے۔میڈیکل سائنس میں ریسرچ نئے ذہنی اُفق کے ساتھ آگے بڑھتا ہے اور ہر دن ترقّی کی نئی منزلیں طے کرتا ہے۔''

02.05 سماجی علوم میں تحقیق

سماجی علوم میں نظری اور عملی ہر دو سطح پر تحقیق کی جاتی ہے۔ عملی تحقیق کے معنی اس تحقیق کے نہیں ہیں جو تجرباتی اور تجزیاتی بنیاد پر سائنسی علوم میں کی جاتی ہے۔ سماجی علوم میں عدد شماری Data-Collection کی خاصی اہمیت ہے۔ بیش تر تحقیق نظری یعنی Theoratical نوعیت کی ہوتی ہے جس کا انحصار عقلی اور معروضی تجزیے پر ہوتا ہے اور محقّق کی کوشش منطقی نتائج نکالنے کی طرف زیادہ ہوتی ہے۔

02.06 سائنسی اور سماجی علوم میں تحقیق کے طریقۂ کار میں فرق و امتیاز

سائنسی علوم میں تحقیق کی تاریخ سب سے پرانی ہے۔ اس کے قدیم ترین سرے یونان میں ملتے ہیں۔ یونان میں ارسطو کے زمانے میں طبعیاتی سائنس کی طرف خصوصی توجہ ہوئی۔ طبّی تحقیق کی تاریخ سب سے قدیم ہے۔ یونانی طب کو عربوں نے عام کیا اور اسے بلندی کے انتہا پر پہنچا دیا۔ کیمیا، ہیئت، جغرافیہ، فلکیات، الجبرا اور ریاضی میں انہوں نے غیر معمولی دریافتیں کیں۔ یونان میں نباتات، طبیعیات، حیاتیات اور دیگر سائنسی علوم میں تحقیقی سطح پر تفتیش و تفحص کی طرف توجہ دی گئی۔ ارسطو کی اکیڈمی ایک تجربہ گاہ بھی تھی۔ اسی طرح ہندوستان میں ریاضی اور ادویات کی تحقیق میں غیر معمولی ترقّی ہوئی۔

سائنسی علوم میں تحقیق کی رفتار بہت تیز ہوتی ہے کیوں کہ ایک تحقیق دوسری تحقیق پر مہمیز کا کام کرتی ہے۔ سائنسی محقّق حیات و کائنات (جس میں فطرت بھی شامل ہے) کو ہزاروں ہزار امکانات سے معمور صیغۂ راز سمجھتا ہے۔ ایک راز سے پردہ اُٹھتا ہے اور پتہ چلتا ہے کہ اس کے پیچھے بھی ایک پردہ ہے۔ اس طرح ہر پردے کے پیچھے ایک پردہ ہوتا ہے جو راز در راز کی صورت ہوتی ہے۔ گویا تحقیق ایک Open-Ended شعبۂ عمل ہے جس کا کہیں اختتام نہیں۔ سماجی علوم میں بھی تحقیق ایک مسلسل عمل ہے۔ سماجی علوم میں بھی منطقی نتائج نکالے جاتے ہیں۔ سارا عمل عقلی اور تجزیاتی بنیاد پر ہوتا ہے۔ معروضیت اور غیر جذباتیت ہی پر تاکید کی جاتی ہے لیکن سائنسی علوم میں اس دریافت شدہ حقائق میں مزید تردید و توسیع کی گنجائش ہوتی ہے۔ سائنس نے اب اپنے رشتے ٹیکنالوجی (Technology) سے مضبوط کر لیے ہیں۔ سائنسی اور ٹیکنالوجی اب ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم سمجھے جاتے ہیں۔ وہ شعبۂ جراحی ہو یا برقیاتی ذرائع ترسیل کا شعبہ، انسانی زندگیوں میں خارجی اور داخلی سطح پر ہی نہیں صارفی سطح پر بھی انقلاب عظیم پیدا کر دیا ہے۔ بیسویں صدی کے رُبعِ دوم سے یہ کہا جانے لگا تھا کہ انسان مشین کا غلام ہو کر خود ایک مشین یا پرزۂ مشین بن گیا ہے لیکن اس عہد کا یہ دعویٰ نصف سچائی کا حامل تھا۔ صحیح معنوں میں آج کا وہ انسان جو موبائل اور انٹرنیٹ سے گھرا ہوا ہے مشین کا غلام، مشین کا فرماں بردار اور خود مشین بن چکا ہے۔ جہاں تک سماجی علوم میں تحقیق کا تعلّق ہے۔ ش. اختر نے اس ضمن میں بڑی تفصیل کے ساتھ وضاحت کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''سماجی سائنس بھی اسی طرح افراد، سوسائٹی، سماج، معاشرہ، خاندان اور قوم و ملک میں انسانوں کی طبقاتی تقسیم اور اس کی کشمکش سے پیدا ہونے والی صورت حال کا جائزہ لیتا ہے، پھر اس روشنی میں نئے معاشی نظام کی بنیادیں اُستوار کرتا ہے۔ یہ معاشی نظام بہتر معاشرہ کی تخلیق کے بعد تہذیبی، اقدار کو بھی جنم دیتا ہے۔ یہ معاشرہ نیا آدمی پیدا کرتا ہے جس کے تصوّرات ماضی سے تعلّق تو رکھتے ہیں لیکن وہ تحقیق و تنقید کی کسوٹی پر انہیں پرکھتا اور پھر اپنی زندگی کے لئے ایک ایسا لائحہ عمل تیار کرتا ہے جس میں بلند ترین انسانی مفاد کی دنیا چھپی

رہتی ہے۔ جب معاشرہ بن جاتا ہے تو فنون لطیفہ کی دنیا بھی ان سے بے نیاز نہیں رہ سکتی۔ پھر انسان کی اندرونی زندگی کے مسائل اس کے دائرہ میں شامل ہو جاتے ہیں۔''

(تحقیق کے طریقۂ کار: ص/۱۶)

02.07 تحقیق کا فن

تحقیق بذاتِ خود ایک علم ہے اور فن بھی۔ تحقیق کا مادّہ ہر کس و ناکس میں نہیں ہوتا۔ ''محبت کے لئے کچھ خاص دل مخصوص ہوتے ہیں" کے مصداق تحقیق کے لئے بھی کچھ خاص ذہن ہوتے ہیں جن میں کرید کا مادّہ ہوتا ہے جنہیں دنیا شبہات سے بھری پڑی محسوس ہوتی ہے جیسے ہر چیز ایک صیغۂ راز ہے۔ گویا شک کا مادّہ ہی مزید تحقیق کے لئے اُکساتا ہے۔ پروفیسر حنیف نقوی کا بھی یہی کہنا ہے کہ محقّق کے ذہن میں شک کا مادّہ موجود نہیں تو اس پر تحقیق کے امکانات روشن نہیں ہو سکتے۔ اس سلسلے میں آگے وہ لکھتے ہیں:

''تشکیک تحقیق کی اساس ہے۔ جب تک آپ کسی واقعے سے متعلّق ہر بیان کو شک کی نگاہ سے دیکھنے اور اس کے مالہٗ و ماعلیہ کا ذاتی طور پر تجزیہ کر کے اس کی اصلیت تک پہنچنے کی کوشش نہیں کریں گے، اس کی سچائی آپ پر واضح نہیں ہو سکتی۔ ''خطائے بزرگان گرفتن خطاست'' جیسے تصوّرات تحقیق کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں رکھتے۔ چناں چہ جو لوگ تقلیدی ذہن رکھتے ہیں اور کسی بات کو محض اس لئے مان لینے میں تامل نہیں کرتے کہ وہ کسی معتبر اور ثقہ بزرگ کا قول یا کسی ماہر فن کی رائے ہے، وہ صحیح سلامت اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکتے۔''

اسی معنی میں تحقیق حقائق کی بازیافت یا دریافت شدہ حقائق کی ازسرِ نَو تحقیق کا عمل ہے۔ انسانی تہذیبی زندگی میں تحقیق کا عمل ایک ناگزیر ضرورت اور فطرت کے تقاضے کے تحت شروع ہوا۔ انسان اردگرد کی اشیا اور فطرت کی اندرونی قوّتوں اور ان کے اندر مخفی امکانات کی تلاش کو اپنا مقصد عظیم اس لئے بناتا ہے کہ وہ خود بھی اپنے لئے ایک عجیب و غریب صیغۂ راز تھا۔ وہ خارج سے اپنے داخل تک پہنچنا چاہتا تھا۔ اسی جستجو نے اسے اُسطور سازی کی طرف مائل کیا، غیر مرئی اور مرئی قوّتوں کی تفتیش کو اس نے اپنا منصب بنایا۔ مختلف دیوی دیوتا اور خدا تخلیق کیے۔ فلسفے نے اس کی رہ نمائی کی، مذہب نے اسے اپنے سایۂ عاطفت میں لینے کی کوشش کی۔ اس طرح تحقیق انسانی ذہن کا سب سے مرغوب عمل ٹھہرا۔ ادبی تحقیق بھی ادبی تنقید اور ادب کی تاریخ کے حق میں ایک ناگزیر عمل ہے۔ ادبی تحقیق کے عمل اور طریقۂ کار کا دائرہ وسیع ہوا ہے۔ ادب کے محقّق کو اب دوسرے سماجی علوم سے بھی روشنی اخذ کرنی پڑتی ہے۔ بالخصوص تاریخ، عمرانیات (Sociology) اور لسانیات (Linguistics) کے علم نے جس طرح فروغ پایا ہے۔ ادبی تحقیق نے اس سے کافی استفادہ کیا ہے۔ ش. اختر نے اس سلسلے میں وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

''جدید ادبی تحقیق کا تاریخ، لسانیات اور بشریات سے گہرا تعلّق ہے۔ اس لئے روایتی طرز تحقیق جو انیسویں صدی سے بیسویں صدی کی پانچویں دہائی تک بہت مقبول رہی، اب بے معنی ہوگی۔ اس نے اپنا رشتہ سائنسی طریقۂ کار سے جوڑ لیا اور سماجی علوم کی مدد سے ادبی سرمایہ کا جائزہ لینا شروع کیا۔''

(تحقیق کے طریقۂ کار، ص/۱۰)

02.08 تحقیق کی تعریف

﴿۱﴾ تحقیق: حقائق کی دریافت کا نام ہے۔

﴿۲﴾ تحقیق: معلوم سے نامعلوم کی تلاش سے عبارت ہے۔

﴿۳﴾ تحقیق: مغالطے اور جھوٹ کو مزید بالغ ہونے سے روکنے کا نام ہے۔

﴿۴﴾ تحقیق: ''معلومات کے پیچھے جو علم کی معرفت اور دانش وری چھپی ہوئی ہے اسے حاصل کرنے'' کا نام ہے۔

﴿۵﴾ تحقیق: آفاقی صداقت تک پہنچنے کا راستہ ہے۔

﴿۶﴾ تحقیق: انسانی تہذیبی و ذہنی ارتقا کی کلید ہے۔

﴿۷﴾ تحقیق: ''حق کی تلاش'' ہے۔

﴿۸﴾ تحقیق: انسانی زندگی میں تحقیق ایک سلسلۂ جاریہ کا نام ہے۔

﴿۹﴾ ''تحقیق ان مسائل کے طریقۂ مطالعہ سے عبارت جن کے حل جزوی یا کلی طور پر حقائق سے اخذ کیے جاتے ہیں''
سی.سی.کرافورڈ

﴿۱۰﴾ ''تحقیق کسی مسئلے کی مناسب حل کی جستجو میں ایک نفیس اور منظّم طریقۂ کار کا استعمال کرتی ہے جس کے پاس مخصوص قسم کے آلات، اوزار اور لائحہ عمل ہوتے ہیں۔''

﴿۱۱﴾ تحقیق کی بنیاد مشاہدہ، مطالعے اور تقابل پر ہوتی ہے۔

﴿۱۲﴾ ''تحقیق میں اعداد و شمار جمع کاری برائے جمع کاری کوئی معنی نہیں رکھتی'' بجائے اس کے اس تحقیق کی اہمیت ہے جس میں اصولوں کے فروغ، انہیں تفصیل و احتیاط کے ساتھ تیار کرنے اور انہیں جلا بخشنے کی طرف توجہ کی گئی ہو۔ اسی کے ساتھ تجرباتی مواد اور اس کی جمع کاری کی بھی اس عملی (Processing) میں خاص اہمیت ہے۔ آر.ایم.ہوٹوپن (R.M.Hotopim)

﴿۱۳﴾ تحقیق ایک دانش ورانہ کارگزاری ہے۔

﴿۱۴﴾ کِلِفّورڈ ووڈی (Clifford Woody) کے لفظوں میں:

''تحقیق کا کام مسائل کی توضیح اور از سرِ نو توضیح پر مشتمل ہوتا ہے جو مفروضات بھی قائم کرتی ہے یا مسائل کے حل تجویز کرتی ہے۔ اعداد و شمار اکٹھا کرتی انہیں تنظیم بخشتی اور ان کی قدر و قیمت آنکتی ہے۔ وہ مخصوص نتائج کا استخراج بھی کرتی ہے اور نتائج اخذ کرتی نیز ان نتائج کو کمالِ ہوشیاری کے ساتھ جانچتی پرکھتی ہے۔ بالآخر وہ قائم کردہ مفروضات کے درست اور موزوں ہونے کے بارے میں طے کرتی ہے۔''

02.09 تحقیق کے اصول اور طریقۂ کار

تحقیق ایک مشکل فن ہے۔ دوسرے شعبہ ہائے علوم کی طرح تحقیق کے بھی کچھ اُصول ہیں۔

جیسا کہ ڈاکٹر نجم الہدیٰ نے کہا ہے:

''ادبی تحقیق دیگر ہر تحقیق کی طرح نامعلوم حقائق کی دریافت یا معلوم حقائق کی چھان بین، ترتیب نو توثیق یا تردید اور باالفاظ دیگر بازیافت ہے۔ اس لئے تحقیق کے نتیجے میں حاصل شدہ مواد کو پیش کرنے کے کچھ قاعدے اور اصول ادبی دنیا میں فی زمانہ مروّج ہیں اگر یہ قاعدے اور اُصول نہ ہوں تو ایسی دریافت یا بازیافت صحیح معنوں میں دریافت یا بازیافت نہیں ہوگی۔ لہٰذا قابلِ اعتنا بھی نہیں ہوگی۔''

(مسائل ومباحث، ص/۲۵)

سب سے بنیادی اُصول کا تعلّق محقّق کی ذات اور اس کی عملی نوعیت سے تعلّق رکھتا ہے۔ جیسا کہ کہا گیا ہے، تحقیق ایک مشکل شعبۂ علم ہے۔ تحقیق کے تقاضوں سے عہد برآ ہونا ہر کسی کے بس میں نہیں ہوتا۔ اس کے لئے محقّق میں حصولِ علم کا شوق اور جذبہ ضروری ہے۔ کیوں کہ تحقیقی کام صبر طلب ہوتا ہے۔ جن حضرات کا تخیّل حسّاس، نظر باریک بیں، ذہن میں یک سُوئی اور محنت ومشقت کی خو، بو نہیں ہے۔ انہیں تحقیق کی سنگلاخ اور طول طویل راہ پر گام زَن نہیں ہونا چاہیے۔ محقّق کے لئے ضروری ہے کہ:

﴿۱﴾ اس میں اپنے مشاہدے اور مطالعے پر اعتماد ہو۔

﴿۲﴾ اس میں استقلال کے ساتھ مسلسل غور وخوض، تفتیش وجستجو اور یک سُوئی یا پتّا مار کر بیٹھنے کی عادت ہونی چاہیے۔

﴿۳﴾ عجلت پسندی اور فوری طور پر نتیجے تک پہنچنے کا رویّہ یا مسابقت اور فوری طور پر منزل کوشی کا میلان تحقیق کو راس نہیں آتا۔

﴿۴﴾ بقول حنیف نقوی:

''محقّق کا کام چوں کہ اعلانِ حق اور صرف اعلانِ حق ہے، اس لئے بنیادی طور پر اس کا قلندری اور راست بازی کی صفات سے متّصف ہونا ضروری ہے۔ چناں چہ جو شخص ستائش کی تمنّا اور صلے کی خواہش سے بے نیاز رہ کر، سود وزیاں سے بالاتر ہوکر اپنے فرائض انجام دینے کا حوصلہ نہ رکھتا ہو اور جسے حق گوئی اپنی ستائش وعافیت سے بھی زیادہ عزیز نہ ہو، وہ تحقیق کا حق ادا کرسکتا ہے۔''

﴿۵﴾ تحقیق کے لئے تحقیقی مزاج کا ہونا ضروری ہے۔ اگر کسی فرد کی تحقیق سے طبعی مناسبت یا کرم کتابی بننے کی صلاحیت نہیں ہے اور صبر وتحمّل یا برداشت کا مادّہ بھی نہیں ہے تو وہ تحقیق کے کام سے کبھی وفا نہیں کرسکتا۔ اس طرح کے مشقّت آمیز اور دیدہ ریزی کے کام سے بہت جلد اس کا اُوب جانا یقینی ہے۔

﴿۶﴾ رشید حسن خاں نے علم اور آسان پسندی کو تحقیق کا سب سے بڑا دشمن قرار دیتے ہوئے اصول کے طور پر یہ کلّیہ قائم کیا ہے کہ:

''علم تحقیق کے لئے ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ صرف علم ضروری ہوتا تو ہمارے محقّقین بھی بہت ہوتے کیوں کہ عالم تو بہت گزرے ہیں، محققین ہیں بس تین چار۔''

﴿۷﴾ محقّق میں تجسّس اور کُرید کا مادّہ ضروری ہے۔ یوں بھی انسان ہمیشہ کسی نہ کسی نئی کھوج میں لگا رہتا ہے۔ زندگی کو بہتر سے بہتر بنانے کے لئے وہ کچھ رَد کرتا ہے کچھ قبول کرتا ہے۔ کچھ توسیع اور اضافہ کرنے کے درپَے ہوتا ہے۔ یہ تجسّس کا مادہ ہی ہے جو اُسے نئی نئی منزلوں کی تلاش کے لئے اُکساتا ہے اور وہ کسی لمحے چپکے نہیں بیٹھتا۔ ڈاکٹر نجم الہدیٰ کا بھی کہنا ہے کہ ازل سے تجسّس انسان کی فطرت ہے:

''یہی تجسّس علم بلکہ سارے علوم وفنون کا محرک ہے اور اسی سے تحقیق وتفتیش کے دروازے کھلتے ہیں۔ علمی تحقیق انسان کی اسی جبلی جستجو وآرزو کے نتیجے میں ہوتی آئی ہے۔ مزید جاننے کی تمنا سے ہی روز بروز اور نَو بہ نَو حکمی اور سائنسی ایجادات اور انکشافات ہوئے ہیں اور ہوتے جارہے ہیں۔ ادبی تحقیق، علمی تحقیق کا ہی ایک شعبہ ہے۔''

(مسائل ومباحث، ص ۲۴)

﴿۸﴾ یہ ضروری نہیں ہے کہ جو تحقیق ہو چکا ہے وہ حرفِ آخر ہے یا جو کچھ بزرگوں نے کہہ دیا ہے یا جو روایت سے چلا آرہا ہے اس میں جھوٹ کا عنصر شامل نہیں ہوگا۔ سائنسی، سماجی علوم اور ادب میں 'کل' کی ایسی بہت سی تحقیقات ہیں جن کا شمار مسلمات میں کیا جاتا تھا اور بعد کے زمانوں میں وہ غلط ثابت ہوئیں۔ ایک جگہ حنیف نقوی نے بھی اس امر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

''جو چیز سب سے زیادہ ضروری اور اہم ہے وہ مسلّمات کی جانچ پرکھ ہے۔ اس لئے کہ صحیح نتائج تک پہنچنے میں اکثر یہ مسلّمات ہی سب سے بڑی رکاوٹ بنتے ہیں۔ ایک عام محقّق یا ناقد بالعموم مسلّمات سے آگے بڑھ کر ہی اپنی بات شروع کرتا ہے۔ اکثر حالتوں میں اسے یہ اندازہ نہیں ہوتا ہے کہ وہ جس بنیاد پر اپنی عمارت تعمیر کررہا ہے، وہ مستحکم نہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اصل حقیقت حجاب اندر حجاب روپوش ہوتی جاتی ہے اور غلط تاویلات وتعبیرات کے فروغ کی راہیں کھلتی جاتی ہیں۔''

اسی لئے کہا جاتا ہے کہ تحقیق کے شعبہ کو سب سے زیادہ نقصان تقلیدی ذہن اور اس تصوّر نے پہنچایا ہے کہ ''خطائے بزرگاں گرفتن خطا است''، یعنی بزرگوں کی خطاؤں پر گرفت کرنا خود ایک خطا ہے۔ جیسا کہ یہ روایت چلی آرہی ہے کہ اصلاحِ زبان کی تحریک کے علم بردار ناسخ تھے جب کہ حنیف نقوی اور رشید حسن خاں کی تحقیق کے مطابق یہ ناسخ کے شاگرد میر اوسط علی اشک کا شاخسانہ تھا۔ چوں کہ ناسخ کا نام بڑا تھا اور نامی استاد تھے، اس لئے اشک نے انہیں اپنے استاد سے منسوب کردیا تاکہ شبہ کی کوئی گنجائش پیدا نہ ہوسکے اور یہی ہوا بھی۔

﴿۹﴾ پروفیسر حنیف نقوی کے خیال کے مطابق محقّق کو تحقیق کے عمل کے دَوران اور بھی کچھ مراحل سے گزرنا پڑتا ہے:

پہلا مرحلہ انکشافِ حقائق کا، دوسرا استخراجِ نتائج کا۔ ان میں انکشاف حقائق کو منطقی ترتیب کے علاوہ اہمیت کے نقطۂ نظر سے بھی اوّلیت حاصل ہے۔ اس لئے کہ اصل حقائق تک رسائی کے بغیر صحیح نتائج کا استنباط ناممکن ہے جب کہ یہ قطعاً ضروری نہیں کہ کسی معاملے کی تہ تک پہنچنے کے بعد اس سے فوری طور پر کوئی حتمی نتیجہ بھی برآمد کرلیا جائے یا انکشافِ حقائق سے استخراجِ نتائج تک کا سفر لازماً ایک ہی محقّق طے کرے۔ آج کا

ایک معمولی انکشاف کل کے کسی بڑے انکشاف کا پیش خیمہ بھی بن سکتا ہے اور ایک محقّق کی کوئی دریافت کسی دوسرے محقّق کو تعبیرات کی نئی راہیں بھی دِکھا سکتی ہے۔''

﴿۱۰﴾ محقّق کو مصنّف کے بیانات پر سرِ تسلیم خَم نہیں کر دینا چاہیے وہ سچ اور صحیح بھی ہو سکتے ہیں لیکن اکثر مصنّفین نے اپنی زندگی اور سوانح، دوسروں سے تعلقات، دشمنی و دوستی یا عشق و معاشقے کے بارے میں بڑ بولے پن یا غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ چوں کہ خود مصنّف نے اپنی زبان اور اپنے قلم سے کوئی بات کہی ہے تو عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ حتمی، مصدّقہ اور کسی بھی ثبوت سے مبرّا ہے۔ اس لئے محقّق کو اس قسم کے بیانات کے دھوکے میں نہیں آنا چاہیے اور پوری تحقیق کے بعد ہی اسے کسی فیصلہ تک پہنچنا چاہیے۔

﴿۱۱﴾ محقّق کو دوسروں کے تیار کردہ قلمی نسخوں کے بجائے خود مصنّف یا اس کی موجودگی میں تیار کردہ مخطوطے پر زیادہ یقین کرنا چاہیے۔ دوسروں کے تیار کردہ نسخوں میں اکثر مرتبین نے الحاق سے بھی کام لیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سوداؔ کے کلیات میں ان کے معاصرین شعرا اور شاگردوں کا کلام کثرت سے شامل ہے۔ میر سوزؔ کی ایک سو چھتیس ۱۳۶ غزلیں مطلعوں اور مقطعوں کے ساتھ اس کلیات میں شامل ہیں۔ سوداؔ کے مطبوعہ کلیات میں قائمؔ چاند پوری کی مثنوی ''در شدّت سرما، طفل پتنگ باز اور تین منظوم حکایتیں'' بھی شامل ہیں۔

اس کے علاوہ ۳۵۹ شعر کی ایک طویل مثنوی ''حکایت مردِ درویش'' بھی قائم کی ہے۔ سوداؔ کے بعض شاگردوں کا کلام اور شیدا کی لکھی ہوئی فدوی لاہوری پر ہجو بھی سوداؔ کے مطبوعہ کلیات میں موجود ہے۔ راقم کا ایک قصیدہ ''بندرابن'' اور شیخ چاند کی تحقیق کے مطابق ۹۱ مرثیے اس (سوداؔ) کے مطبوعہ کلیات میں ملتے ہیں جن میں سے ۱۸ ایسے ہیں جو اس (سوداؔ) کے نہیں ہیں۔ لطف کی بات یہ کہ ان تمام ۱۸ مراثی میں مہربان تخلّص بھی موجود ہے۔ الحاق کی ان صورتوں کے پیش نظر ڈاکٹر تنویر احمد علوی اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ:

> ''کسی متن کو قدیم الاصل قرار دینے کے لئے یا کسی عہد کی شخصیت سے وابستہ کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ یہ معلوم کیا جائے کہ اس کے حق میں معاصر شہادتیں کیا ہیں اور متن کے قدیم تر قلمی نسخے کس زمانے سے تعلّق رکھتے ہیں۔ ایسی شہادتوں کی عدمِ موجودگی میں یہ شبہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ متن اس عہد یا اس شخص سے تعلق نہیں رکھتا۔ اس ضمن میں داخلی شہادت کے طور پر یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ اس کی زبان، طرزِ املا اور جملوں کی ساخت کس نوعیت کی ہے۔ نیز اس میں جو الفاظ یا علمی اصطلاحات آئی ہیں وہ کس قدر قدیم ہیں اور آیا اس عہد سے پیشتر کی ہیں یا اسی عہد سے تعلّق رکھتی ہیں۔ مقولوں اور اشعار وغیرہ سے بھی متعلّق اسی طرح کی تحقیقی چھان بین ضروری ہے۔''
>
> (اُصول تحقیق و ترتیب متن: ڈاکٹر تنویر احمد علوی، ص ۱۱۸)

﴿۱۲﴾ موضوع کے انتخاب میں اسکالر کی دل چسپی اور اس سے عہدہ برآ ہونے کی اہلیت ضروری ہے۔ کسی بھی مسئلے کو تحقیق کا موضوع بنانے سے پہلے اس کے مختلف پہلوؤں، اندیشوں، امکانات اور متعلّقہ مواد تک رسائی کے ذرائع اور موضوع کی بساط، وُسعت اور حسّاسیت اور مطلوبہ وقت و مہلت پر غور و خوض ضروری ہے۔

﴿۱۳﴾ قاضی عبدالودود نے ''اُصولِ تحقیق'' کے ضمن میں اِس امر کی وضاحت کی ہے کہ:

''ہر بات یکساں اہمیت نہیں رکھتی لیکن بات اہم ہو یا غیر اہم، محقّق کو حق تحقیق ادا کرنا چاہیے۔ بعض اوقات کوئی بات جو محض جزوی معلوم ہوتی ہے، معمولی اہمیت اختیار کر لیتی ہے۔ مزید یہ کہ اگر بے احتیاطی عادت بن گئی تو ان اُمور میں بھی جو خود لکھنے والے کی نظر میں اہم ہیں اس سے گریز نہیں۔ جونسن کا قول ہے کہ معاملہ کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو اس کی تفاصیل کے بیان میں حقیقت سے جزوی انحراف بھی رَوا نہیں۔ بچوں کو اس کا خوگر بنانا چاہیے، مگر بہت احتیاط سے کام لیں۔ مثلاً یہ کہ کوئی امر اگر ایک کھڑکی کے پاس ظہور میں آیا ہے اور بچہ یہ کہے کہ دوسری کے پاس ہوا تو اسے فوراً ٹوکنا چاہیے۔ پتا نہیں حقیقت سے تجاوز کہاں پہنچا دے۔ قائم کے نام سے بحث کرتے ہوئے ایک کرم فرما نے لکھا کہ اس کا کوئی خاص نام اگر نہ ہوا تو اس سے قیامت نہ ٹوٹ پڑے گی، یہ بالکل صحیح ہے لیکن قیامت تو قائم پیدا نہ ہوتے یا ہوتے ہی مر جاتے جب بھی نہ ٹوٹتی۔''

(ارمغان: ص..۱۱...۱۲)

﴿۱۴﴾ تحقیق کا بنیادی وظیفہ محض تحقیق ہے۔ محقّق کو صرف اپنے تحقیق کے موضوع کو مرکوزِ نظر رکھنا چاہیے۔ اُسلوب کی پرستاری، استعارہ سازی، تشبیہ سازی یا لفظی طوطا مینا سے اسے دامن بچانے کی ضرورت ہے۔ اس طرح کا صنّاعانہ یا تخلیقی اُسلوب چیزوں کو نمایاں اور واضح کرنے کے بجائے پردہ پوشی کا باعث بن جاتا ہے۔

﴿۱۵﴾ تحقیق کے عمل میں یادداشت کو بھی بروئے کار لایا جاتا ہے لیکن یادداشت جہاں یادوں کو برانگیخت کرتی ہے وہیں اکثر دھوکہ بھی دیتی ہے۔ اس ضمن میں قاضی عبدالودود نے تفصیلاً لکھا ہے کہ:

''حافظہ دھوکہ دیتا ہے، لیکن کسی حد تک اس پر بھروسا کیے بغیر چارہ نہیں ورنہ آپ کو اپنا نام بتاتے وقت اپنا شناختی کارڈ جس پر آپ کا عکس بھی ہو دیکھ لینا پڑے گا۔ سوال یہ ہے کہ کب بھروسا کیا جائے اور کب نہیں۔ اس کا اطمینان بخش جواب مجھے معلوم نہیں۔ دو باتیں اس سلسلے میں البتہ کہہ سکتا ہوں۔ ایک یہ کہ ہر شخص کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اس کا حافظہ کن معاملات میں قوی اور کن معاملات میں ضعیف ہے۔ مجھے سینکڑوں سنین جن کا تعلق ادب اُردو سے ہے، یاد ہیں، لیکن ایک کے سوا کوئی ٹیلی فون نمبر مجھے یاد نہیں اور وہ خود میرا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جن اُمور کے لئے حوالہ ضروری ہے وہاں بھروسا نہیں کرنا چاہیے اور کوئی بات ماخذ کی طرف رجوع کیے بغیر نہ کہی جائے۔ یہ ممکن نہ ہو تو یہ صراحت کر دی جائے کہ حافظے پر اعتماد کیا گیا ہے۔''

(ارمغان: ص....۱۹)

﴿۱۶﴾ مصنّف یا مصنّف کے کسی قریب ترین شاگرد یا کسی اور معاصر نے اگر کسی سلسلے میں کچھ لکھا ہے تو ضروری نہیں کہ وہ صحیح ہو۔ لوگ اکثر اپنی تحریروں میں تحفظات سے کام لیتے ہیں۔ بعض شاعرانہ تعلّی، خود پسندی کے خوگر ہوتے ہیں۔ بعض میں رشک و حسد کا مادّہ ہوتا ہے۔ بعض کو ایذا رسانی میں لذّت حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے قاضی عبدالودود کا یہ بھی کہنا ہے کہ:

''کہاجاتا ہے کہ گھر والے گھر کا حال بہتر جانتے ہیں مگر کچھ ضروری نہیں کہ وہ اپنے یا اپنے بزرگوں کے متعلّق جو کچھ لکھیں صحیح ہو، غالبؔ اپنے کو ترک ایبک کہتے ہیں،لیکن ایبک ترکوں کی کوئی قسم ہی نہیں۔شادؔ عظیم آبادی نے اپنا سلسلۂ نسب حسین فیروزی شاہ شیراز معاصر حافظ سے ملایا ہے۔اس نام کا کوئی بادشاہ نہیں گزرا۔وہ ذاتی اور خاندانی آوارہ گری میں کہاں تک جاسکتے ہیں اس کا اندازہ ان اصحاب کو ہوگا، جنہوں نے میری کتاب ''اشتر وسوزن'' دیکھی ہے۔ایک بزرگ کے متعلّق ان کے بیٹے نے لکھا ہے کہ نہوں نے ۱۵ر جلدوں میں ایک کتاب تصنیف کی تھی، جس کی بہ دولت وہ عالم اسلامی میں مشہور ہوگئے۔شہرت اگر اس کا نام ہے کہ بیٹا اس سے واقف ہوتو اور بات ہے، ورنہ یہ بات کسی اور نے نہ دیکھی ہے اور نہ کسی شخص نے جو ناقل شخص نہیں،اس کا ذکر کیا ہے۔''

(ارمغان:ص...۲۱....۲۲)

﴿۱۷﴾مختلف سائنسی اور سماجی علوم میں بھی پہلے مفروضات قائم کیے جاتے ہیں۔یہ ضروری نہیں کہ مفروضات کی بنیاد پر ہمیشہ صحیح نتیجے تک پہنچتے ہوں لیکن ضروری ہے کہ مفروضات سے آگے کے لئے تحقیق کی راہیں کھلتی ہیں۔محقّق کو اپنے طریقہ کو سمت دینے اور جستجوؤں کو تازہ دَم رکھنے میں مدد ملتی ہے۔ش.اختر نے مفروضات اور ان کی نوعیت کے بارے میں تفصیل سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ریسرچ کا آغاز کسی نہ کسی مسئلہ سے ہوتا ہے یا کوئی دشواری اس کی ابتدا کرتی ہے اور پھر ذہن تحقیق کی طرف مائل ہوتا ہے اس کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ جو دشواریاں نتائج کی راہ میں حائل ہوں اور مقاصد کی برآری میں سدِّ راہ ہیں اُنہیں دُور کیا جائے تا کہ صحیح حل کا راستہ ہم وَار ہو سکے۔اس لئے بہتر صورت یہ ہوتی ہے کہ اسکالر اپنی دشواریوں اور موضوع سے متعلّق مسائل کا ایک واضح نقشہ اپنے سامنے رکھے اور پھر اُسے حل کرنے کی طرف مائل ہو۔انہیں مسائل اور دشواریوں کو حل کرنے کے لئے ایک مفروضہ کی ضرورت ہوتی ہے۔کوئی ضروری نہیں کہ مفروضات تحقیق کے دوران صحیح ثابت ہوں لیکن اسے غلط ثابت کرنے کے لئے بھی تحقیق کی راہوں سے گزرنا ہے۔لہٰذا مفروضات کا ذہن میں صاف نقشہ موجود رہنا ضروری ہے۔جب یہ احاطۂ تحریر میں آ گیا تو اسے پانے کے لئے مفروضات کے تمام چھوٹے بڑے نکات اُبھر جاتے ہیں،جنہیں ایک اسکالر حقائق کی روشنی میں پرکھتا ہے۔اگر مفروضہ درست نہیں ہے یا سرے سے بنایا ہی نہیں گیا ہے تو اسکالر کا ذہن کبھی منطقی طور پر سوچ بھی نہیں سکتا اس کی تحقیق آگے نہیں بڑھ سکتی۔گویا مفروضے کی نوعیت نگراں کی ہوتی ہے جو ہر لمحہ اسکالر کو ہدایت دیتا رہتا ہے۔''

(تحقیق کے طریقہ کار:ص....۵۰.....۵۱)

02.10 خلاصہ

تحقیق ایک مشکل ترین فن ہے۔ جو مشقت طلب بھی ہے اور صبر آزما بھی۔ محقق میں طبعی مناسبت اور فطری رجحان کا پایا جانا ضروری ہے۔ اسے انعام واکرام کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔ اس میں علمی شوق اور تجسس کا میلان ہونا چاہیے۔ مواد کی فراہمی کے لئے ہمہ وقت تیار اور کمر بستہ رہنا چاہیے۔ مزاج میں استقلال اور یک سُوئی ہونی چاہیے اور حق گوئی کی صفت ہونی چاہیے کیوں کہ تحقیق کے معنی ہی سچائی اور حقیقت کی دریافت کے ہیں۔

02.11 فرہنگ

استخراج	: باہر نکالنا، خارج کرنا	برانگیخت کرنا	: تحریک دینا، اُبھارنا
استنباط	: نتیجہ	تفحص	: تلاش
اہداف	: ہدف کی جمع، نشانہ	متّصف	: حامل صفت ہونا
ایذارسانی	: تکلیف پہنچانا	مفروضات	: مفروضہ کی جمع، فرض کیا ہوا

02.12 سوالات

مختصر سوالات

سوال نمبر۱ : تحقیق کے معنی ومفہوم پر بحث کیجیے۔

سوال نمبر۲ : تحقیق میں مفروضات کی کیا اہمیت ہے؟

سوال نمبر۳ : تحقیق کو حقائق کی دریافت کا نام کیوں دیا گیا ہے؟

تفصیلی سوالات

سوال نمبر۱ : تحقیق کی تعریف کا تعیّن کیجیے۔

سوال نمبر۲ : تحقیق کے بنیادی اصولوں پر بحث کیجیے۔

سوال نمبر۳ : یہ کیوں کہا گیا ہے کہ تحقیق کے لئے تحقیقی مزاج کا ہونا ضروری ہے؟

سوال نمبر۴ : سائنسی علوم اور سماجی علوم میں تحقیق کے طریقہ کار کے فرق پر اظہارِ خیال کیجیے۔

معروضی سوالات

سوال نمبر۱ : رشید حسن خاں نے کسے تحقیق کا سب سے بڑا دشمن قرار دیا ہے؟

(الف) تشکیک (ب) استقلال (ج) علم (د) مشقت

سوال نمبر۲ : میر سوز کی کتنی غزلیں سوداؔ کے مطبوعہ کلیات میں موجود ہیں؟

(الف) ۱۳۹ (ب) ۱۳۳ (ج) ۱۳۷ (د) ۱۳۶

سوال نمبر۳ : یہ کس نے کہا ہے کہ محقّق کا قلندری اور راست بازی کے صفات سے متّصف ہونا چاہیے؟

(الف) حنیف نقوی (ب) قاضی عبدالودود (ج) رشید حسن خاں (د) ش.اختر

سوال نمبر۴ : یہ کس نے کہا ہے کہ حافظہ دھوکہ دے سکتا ہے؟

(الف) حنیف نقوی (ب) قاضی عبدالودود (ج) رشید حسن خاں (د) تنویر علوی

معروضی سوالات کے جوابات

جواب نمبر۱ : (ج) علم جواب نمبر۳ : (الف) حنیف نقوی

جواب نمبر۲ : (د) ۱۳۶ جواب نمبر۴ : (ب) قاضی عبدالودود

02.13 حوالہ جاتی کتب

۱۔ اصولِ تحقیق و ترتیب متن از ڈاکٹر تنویر احمد علوی

۲۔ ارمغان (تحقیق و تنقید: ۲۰۱۲) از مرتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

۳۔ فکر و نظر (علی گڑھ، ستمبر: ۲۰۰۵) از علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی

۴۔ رشید حسن خاں، کچھ یادیں کچھ جائزے از ڈاکٹر محمد آفتاب اشرف، جاوید رحمانی

۵۔ تحقیق و تدوین (سمت و رفتار) از ڈاکٹر موصوف احمد

۶۔ تحقیق کے طریقۂ کار از ش.اختر

۷۔ تحقیق و تدوین از پروفیسر ابن کنول

اکائی 03 : تحقیق کے مسائل

ساخت :

03.01 : اغراض ومقاصد

03.02 : تمہید

03.03 : جامعات سے باہر آزادانہ تحقیق

03.04 : مواد کی فراہمی کا مسئلہ

03.05 : مشفق خواجہ کا تحقیقی کارنامہ

03.06 : عملی مسائل کی نوعیت

03.07 : جامعاتی تحقیق اور مسائل

03.08 : جامعاتی اسکالرز کے عملی اور تکنیکی مسائل

03.09 : خلاصہ

03.10 : فرہنگ

03.11 : سوالات

03.12 : حوالہ جاتی کتب

03.01 اغراض ومقاصد

تحقیق ایک مشکل موضوع ہے۔ یہ ایک میدانِ خارزار کی طرح ہے جسے عبور کرنے کے لئے بڑی ہمّت ،صبر اور برداشت کی ضرورت ہے۔ تحقیق کی راہ طویل بھی ہے اور پیچیدہ بھی۔ ایک مسئلہ حل ہوتا نہیں کہ دوسرا سامنے آجاتا ہے پھر بھی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ تحقیق کا کام مکمّل ہوگیا ہے کیوں کہ یہ ایک مسلسل عمل ہے۔ ہماری تحقیق کو کب چیلنج کا سامنا کرنا پڑے اور کب کسی نئی تحقیق کی بنیاد پر اسے مسترد کردیا جائے ،نہیں کہا جاسکتا۔ اِس اکائی کا مقصد ہی تحقیق کے ان مسائل پر بحث کرنا اور طلبا کو ان سے آگاہ کرنا ہے، جن کا واقع ہونا، ہمیشہ امکان کے اندر ہوتا ہے۔ بعض مسائل ضمنی نوعیت کے ہوتے ہیں اور بعض کی حیثیت دائمی ہوتی ہے۔ طلبا اس اکائی کے بعد تحقیق کے مسائل کے بارے میں معلومات حاصل کرسکیں گے اور یہ سمجھ سکیں گے کہ ان مسائل کی نوعیت کیا ہے؟

03.02 تمہید

تحقیق کی ایک قسم وہ ہے جسے آزادانہ تحقیق کہا جاسکتا ہے یعنی تحقیق کرنے والوں کا وہ گروہ جو تحقیق کے موضوع کے انتخاب میں کسی ادارے کا پابند نہیں ہوتا اس کے اپنے مسائل ہیں۔

دوسرا گروہ وہ ہے جو جامعات کے اسکالرز سے منسوب ہے۔ جو زیادہ تر جامعاتی قوانین کا پابند ہوتا ہے۔ اس کا کوئی نگراں ہوتا ہے اور اس کے تحقیقی کام کی دو سینئر اساتذہ رپورٹ تیار کر کے بھیجتے ہیں۔ یہ بھی امتحان ہی کی شکل ہے۔ مثبت اور موافق رپورٹ آنے پر وائیواوائس (Viva-Voce) امتحان کے مرحلے سے بھی اسکالرز کو گزرنا پڑتا ہے۔ اس زبانی امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد ہی اسکالر کو پی.ایچ.ڈی (Phd) کی ڈگری تفویض کی جاتی ہے۔ آزادانہ تحقیق اور ادارہ جاتی تحقیق میں مسائل کی نوعیت بھی مختلف ہوتی ہے۔ اس اکائی میں ان مسائل پر غور وخوض کیا جائے گا۔ جو نظری مسائل بھی ہیں اور عملی مسائل بھی۔

03.03 جامعات سے باہر آزادانہ تحقیق

تحقیق کرنے والوں کے دو نمایاں گروہ ہیں:

﴿الف﴾ آزادانہ تحقیق کرنے والوں کا گروہ۔ ﴿ب﴾ جامعاتی تحقیق کرنے والوں کا گروہ۔

آزادانہ تحقیق کرنے والوں کی بھی ایک لمبی فہرست ہے۔ یہ سلسلہ گزشتہ صدی سے تا حال چلا آرہا ہے۔

یہ وہ گروہ ہے جس کا اصرار حسبِ ذیل مقاصد اور اہداف پر ہے۔

﴿۱﴾ انسانی علم کی ترقّی میں اضافہ ہو۔

﴿۲﴾ صلہ وانعام سے بے نیازی جن کی طبیعت کا خاصّہ ہے تحقیق کا کام ان ہی کو خوش آتا ہے۔

﴿۳﴾ تحقیق ایک دقت طلب، صبر آزما اور طولِ اَمل ہے۔

﴿۴﴾ تحقیق کے لئے بے خوفی، راست بازی اور حق گوئی جیسی صفات کا ہونا لازمی ہے۔

﴿۵﴾ تحقیق میں خطائے بزرگاں گرفتن خطا است یعنی بزرگوں کی غلطیوں کی نشان دہی کرنا خود ایک خطا ہے، کے کوئی معنی نہیں ہیں''

﴿۶﴾ تحقیق کا کام ہی جھوٹ کو بڑھنے اور پھیلنے سے روکنا، دوسروں کو مزید گمراہیوں سے بچانا اور حقیقت کی کُنہ تک پہنچنے کی کوشش کرنا ہے۔

﴿۷﴾ تحقیق کا کام دریافت کرنا، آگاہ کرنا اور خبردار کرنا ہے۔

﴿۸﴾ محقّق کی طبیعت میں شک اور کرید کا مادّہ ہونا چاہیے۔

﴿۹﴾ تحقیق کے لئے تحقیقی مزاج، شوق اور تلاش وجستجو کی لگن ہونا ضروری ہے۔

﴿۱۰﴾ محقّق کو لسانیات، تاریخ، تہذیب، قواعد وعروض وغیرہ جیسے علوم اور دوسری زبانوں سے بھی واقفیت ہونا چاہیے۔

تقابل وتفتیش کے موقعوں پر کب کس علم کی ضرورت پیش آجائے یہ نہیں کہا جاسکتا۔

﴿۱۱﴾ عجلت پسندی تحقیق کو کبھی راس نہیں آتی۔

﴿۱۲﴾ محض یادداشت پر بھروسہ اکثر غلط ثابت ہوتا ہے۔اس لئے تصدیق وتوثیق کے بغیر کسی بات کو حتمی نہیں سمجھنا چاہیے۔

﴿۱۳﴾ دریافت ومتنی تنقید کے عمل میں سائنٹفک اُصولوں کو ہی رہ نما اُصولوں کے طور پر اخذ کرنا چاہیے۔

﴿۱۴﴾ تدوین کے عمل میں صداقت تک پہنچنے کے لئے جہاں تک ہو سکے مصنّف کی زندگی میں تیار شدہ نسخے ہی کو بنیاد بنانا چاہیے۔

اس ذیل میں ڈاکٹر تنویر احمد علوی کا کہنا ہے کہ

''کسی متن کو تحقیقی طور پر مرتب کرنے کے لئے سب سے پہلا اور ضروری کام ایسے مآخذ کی جستجو اور اسانید کی دریافت ہے جن پر اس متن کی اساس قائم کی جاسکے اور جن کی مدد سے اس سے متعلّق دوسرے ضروری مسائل کی تحقیق اور توجیہ ممکن ہو سکے۔''

آزادانہ تحقیق کا کام انجام دینے والوں میں حافظ محمود شیرانی، مولوی عبدالحق، قاضی عبدالودود، مولانا امتیاز علی عرشی، مالک رام، مسعود حُسین خاں، محی الدین قادری زور، نصیرالدین ہاشمی، مسعود حسن رضوی ادیب، مختارالدین احمد، گیان چند، تنویر احمد علوی، مشفق خواجہ، رشید حسن خاں اور حنیف نقوی کا شمار کیا جانا چاہیے۔حالاں کہ انہی میں وہ حضرات بھی ہیں جنہوں نے اپنا تحقیقی سفر پی.ایچ.ڈی کے کام سے شروع کیا تھا اور بعد ازاں انہوں نے تحقیق وتدوین کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا، ان میں گیان چند، تنویر احمد علوی، مسعود حسین خاں اور حنیف نقوی شامل ہیں۔آزادانہ سطح پر یعنی جامعات سے باہر تحقیق کا کام کرنے والوں کو درج ذیل سہولت اور آزادی حاصل ہے کہ:

﴿۱﴾ وہ اپنے موضوع کے تعیّن میں آزاد ہوتے ہیں۔

﴿۲﴾ موضوع سے عہدہ برآ ہونے کے لئے وقت کی کوئی قید نہیں ہوتی۔

﴿۳﴾ اپنی تلاش کے طریقوں اور نتائج میں وہ کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہوتے۔

﴿۴﴾ ان کا مقصد کسی ڈگری کا حصول یا روزگار کی فراہمی نہیں ہوتا۔اس لئے اپنے نتائج کے استنباط واستخراج میں نہ تو عجلت سے کام لیتے ہیں اور نہ حق گوئی میں انہیں کوئی باک ہوتا ہے۔

﴿۵﴾ اپنے لائحہ عمل اور ابواب بندی میں بھی وہ صرف اپنی نظر اور اپنے تجربے پر اعتماد کرتے ہیں۔

﴿۶﴾ ان کا مقصد محض علم وادب کی خدمت ہوتا ہے۔

﴿۷﴾ محقق بھی اپنے ذوق اور دل چسپی کے مطابق میدانِ عمل کا انتخاب کرتے ہیں۔علم وادب کے تقاضوں اور ضرورتوں کو بھی مدِنظر رکھتے ہیں، لیکن پہلو بہ پہلو اپنے ذوق کی طمانیت بھی ان کا مقصود ہوتا ہے۔مثلاً امتیاز علی عرشی یا شیخ اکرام نے غالبؔ کو کبھی فراموش نہیں کیا۔رشید حسن خاں کو کلاسیکی ادبی کارناموں کی تدوین اور لغات میں خاص دل چسپی تھی۔مسعود حسن رضوی ادیبؔ کی توجہ کا مرکز مرثیہ اور اس کے متعلقات تھے۔انہیں اُردو اسٹیج سے بھی خاص رغبت تھی۔محی الدین قادری زور، نصیرالدین ہاشمی، مولوی عبدالحق اور سیدہ جعفر کا میدانِ عمل دکنی ادبیات کی تدوین وتحقیق کے ساتھ خصوصی طور پر مختص تھا۔عبدالستار صدیقی مرحوم نے اِملا اور تلفظ کے مسائل کو مرکز میں رکھا اور تحقیقی سطح پر ان مسائل پر غور وخوض کیا۔

﴿۸﴾ حافظ شیرانی، قاضی عبدالودود، امتیاز علی عرشی اور رشید حسن خاں کو یہ آزادی تھی کہ مقبولِ عام مغالطوں کا سدِّ باب کرسکیں۔ حافظ شیرانی کو لاہور کے کتب خانوں اور خود ان کے نجی کتب خانے سے بھرپور فائدہ ہوا۔ قاضی عبدالودود کے پاس بھی نجی کتابوں اور مخطوطات کا ذخیرہ تھا۔ انہوں نے خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ سے بھی بہت استفادہ کیا اور ہندوستان سے باہر جو سرمایہ موجود ہے اسے بھی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ امتیاز علی عرشی کے لئے رام پور رضا لائبریری، رام پور علم وادب کا ایک سرچشمہ ثابت ہوا۔

رشید حسن خاں کے لئے دہلی یونی ورسٹی اور ہارڈنگ لائبریری کی کتابیں علم وآگہی کا وسیع تر مخزن تھیں۔ ہمارے ان محقّقین کو جب بھی کسی کم یاب یا نایاب تصنیف یا نسخے کے بارے میں معلوم ہوتا تھا تو وہ اسے حاصل کرنے کے لئے بے چین ہوجاتے تھے اور اس کی روشنی سے ذہن کے اندھیروں کو مٹانے کی کوشش کرتے تھے۔

اس طرح کے مواد کے حصول میں وہ خود غرض ہوتے تھے لیکن اسے حاصل کرنے کے بعد اس کی تشہیر اور اسے دوسروں تک پہنچانے میں وہ بے حد فیّاض تھے۔ مولوی عبدالحق نے دکنی لائبریریوں کے علاوہ چھوٹے چھوٹے دیہاتوں کی بھی خاک چھانی اور گرد آلود قدیمی نسخوں کو حاصل کرنے کی بھرپور سعی کرتے۔ یہ جنون اور دیوانگی صرف محقّقین میں ہی ہوتی ہے۔ اگر ان حضرات میں اس قسم کی قلندرانہ شان نہیں ہوتی اور دَربدَری کا یہ حوصلہ نہیں ہوتا تو ہماری تحقیق کی تاریخ اتنی ثَروت منداور اس قدر متنوّع نہیں ہوتی۔

03.04 موادکی فراہمی کا مسئلہ

تحقیق کے کام کے لئے صرف تحقیق کے ذوق وشوق اور فطری مناسبت ہی درکار نہیں ہوتی۔ کیوں کہ محقّق کا کام قدیم کی دریافت اور بازیافت ہوتا ہے۔ اپنی تحقیق کو مدلّل اور نتیجہ خیز بنانے کے لئے نظری طور پر ہی چوکنا نہیں رہنا پڑتا بلکہ قدم قدم پر عمل آور بھی ہونا پڑتا ہے۔ اسے اپنے موضوع سے نپٹنے کے لئے متعلقہ مواد کی ضرورت ہوتی ہے جسے حاصل کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے بھی اس مسئلے کی طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھا ہے:

> ''.....ہمارے یہاں ایسے وسائل کی نسبتاً کمی ہے جن کے توسّط سے تحقیق یا ترتیب کا کام کرنے والے کے لئے اپنے مطلوبہ مواد اور متعلقہ مصادر تک رسائی آسان ہوجائے۔''

اُردو شعروادب کی روایت گزشتہ کئی صدیوں پر محیط ہے۔ اُردو شعروادب کے ارتقا کے زمانے بھی وہی ہیں جب سماجی اور معاشی سطح پر ہندوستانی عوام کو بار بار کئی طرح کے مصائب سے دوچار ہونا پڑا۔ ملک کے اندر بھی مختلف صوبائی یا علاقائی گروہ آپس میں متصادم تھے۔ سکھ، جاٹ، مرہٹے اور دیگر اقوام کے حملوں نے بھی سیاسی مرکزیت کو تہس نہس کردیا تھا۔ بیرونی حملہ آوروں میں سے احمد شاہ ابدالی اور غلام قادر روہیلہ کی قتل وغارت گری اور لوٹ مار نے بھی ملک کی سالمیت اور سیاسی استحکام کو بہت بڑا نقصان پہنچایا۔ سب سے بڑا نقصان کتابوں اور مخطوطات کی بربادی سے ہوا۔ دوسرے یہ کہ قدیم نسخوں کو محفوظ کرنے کے محدود ذرائع تھے اور ان ذرائع کا بھی استعمال عام نہیں تھا۔

اکثر قدیم نادر نسخے تتر بتر ہوئے، انہیں دیمک چاٹ گئی یا ورق کے ورق غائب ملے۔ جیسے ڈاکٹر جمیل جالبی کو فخر الدین نظامی کی مثنوی کا جو نسخہ ملا اس کے ابتدائی اوراق ہی غائب تھے۔ یہ پتہ ہی نہیں چل سکا کہ مثنوی کا نام کیا ہے۔ مثنوی کے دو مرکزی کرداروں کدم راؤ

پدم راؤ کے نام پر جمیل جالبی کو اس کا عنوان قائم کرنا پڑا۔ اب اس مثنوی کو ''مثنوی کدم راؤ پدم راؤ'' کے نام ہی سے جانا جاتا ہے۔ اسے اُردو کی پہلی دستیاب مثنوی سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔

محقّق کو جواز وثبوت فراہم کرنے کے لئے متعلقہ اور مطلوبہ مواد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس مقصد کے لئے اسے مختلف کتب خانوں کے دروازے کھٹکھٹانے پڑتے ہیں۔ دربدر خاک چھاننی پڑتی ہے۔ کئی دوسرے حضرات سے رابطہ کرنا پڑتا ہے۔ تب بھی ضروری نہیں کہ کوئی اپنے مقصد میں کامیاب ہوجائے۔ ملک میں کئی قدیم کتب خانے ہیں جن میں مدّتوں تک ان کے تحفّظ کے لئے کوئی خاص کوشش نہیں ہوسکی۔ یہ کتابیں پرانی خستہ اور سیلن زدہ عمارتوں اور سال خوردہ الماریوں کی زینت تھیں۔ ان کی مناسب سائنسی سطح پر فہرست سازی بھی نہیں ہوسکی۔ حتّٰی کہ روزمرّہ کی صفائی سے بھی یہ عمارتیں اور الماریاں محروم رہیں۔ گویا یہ کتابیں اور قدیم نسخے جو نادر و نایاب ہیں، گدڑی یا گودڑ میں لعل کے مماثل تھے۔ آزادی کے بعد بھی عرصۂ دراز تک ان کی فہرست سازی کی گئی اور نہ جدید کیمیاوی وسائل کو کام میں لایا گیا کہ ان کا تحفّظ ممکن ہوسکے۔ عہدِ جدید میں تھوڑا فرق ضرور پڑا ہے لیکن اُردو کی کتابوں کی طرف اب بھی بڑی حد تک عدمِ توجہی پائی جاتی ہے۔

ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے موجودہ صورتِ حال کو بھی غیر تسلّی بخش بتاتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ:

> ''یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس رسائی کا سب سے بڑا وسیلہ مختلف علمی کتب خانے یا ان کی فہرستیں ہیں جب کہ صورت حال یہ ہے کہ اوّل تو کچھ خاص مقامات پر ہی اچھے کتاب خانے موجود ہیں پھر ان میں بھی بہت سے کتاب خانے ایسے ہیں جن کی فہرستیں یا تو مرتب ہی نہیں ہوئیں یا ہنوز ان کی اشاعت عمل میں نہیں آسکی اور ایسے کتاب خانے تو اور بھی کم ہیں جن کے توضیحی کیٹلاگ چھپ کے سامنے آئے۔ ایسی تفصیلی یا اجمالی فہرستوں کا بڑی بڑی لائبریریوں کے علاوہ ایک جا صورت میں دستیاب ہونا بھی آسان نہیں۔''
>
> (اصولِ تحقیق وترتیب متن، ص..۳۱ تا ۳۲)

ہمیں یہ بخوبی علم ہے کہ حیدرآباد، اورنگ آباد، لکھنؤ، دہلی، پٹیالہ، بھوپال، ٹونک وغیرہ میں قدیم لائبریریوں اور نجی کتب خانوں میں جو ہزاروں ہزار کتابوں اور مخطوطات کا ذخیرہ ہے۔ ان سے بڑی حد تک اُردو معاشرہ نابلد ہے۔ حیدرآباد کی عثمانیہ یونی ورسٹی اور پٹیالہ کی پنجاب سنٹرل پبلک لائبریری اورنگ آباد میں گورنمنٹ کالج کی لائبریری، بھوپال کی مولانا آزاد نیشنل لائبریری کے علاوہ ایسی کئی لائبریریاں ہیں جہاں اُردو اور فارسی کی قدیم تصنیفات وتالیفات دھول پھانک رہی ہیں یا انہیں زمیں دوز کردیا گیا ہے۔ بہت سی لائبریریوں کے منتظم اور ان کے اربابِ حل وعقد کے غیر اُردو داں ہونے کے باعث ہزاروں ہزار قیمتی کتابوں کا اثاثہ تلف ہوچکا ہے۔

جس طرح برطانیہ، فرانس، جرمنی وغیرہ کے نیشنل کتب خانوں اور آرکائیوز (Archives) میں موجود و محفوظ اکثر کتابوں اور قلمی نسخوں کو حاصل کرنا مشکل امر ہے اسی طرح اندرونِ ملک بھی ہم اکثر بے دست و پا ہوکر رہ جاتے ہیں۔ مشہور اور نیشنل کتب خانوں کا تو ہمیں علم ہے لیکن ایسے کئی کتب خانے ہیں جو چھوٹے چھوٹے قصبات میں موجود ہیں اور جن سے ہماری واقفیت معدوم ہے۔ جنوبی ہندوستان کے کئی گھرانے ایسے ہیں جہاں قدیم مخطوطات اور کتابیں صندوقوں میں بند پڑی ہیں۔ مولوی عبدالحق کی طرح اگر مختلف شہروں اور قصبات کا دَورہ

کیا جائے تو شاید تاریخ کی بہت سی گم شدہ کڑیاں ہمیں دستیاب ہو جائیں۔ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے مسعود حسن رضوی کا ایک اقتباس درج کیا ہے کہ انہیں انیسؔ کے کلام کے قلمی نسخوں کی تلاش میں کس قدر مشکلات پیش آئی تھیں۔رضوی مرحوم لکھتے ہیں:

''مرثیوں کے مختلف نسخے مختلف وقتوں میں مختلف لوگوں سے مستعار لے کر یا ان کے گھروں میں جا جا کر اپنے نسخوں سے ان کا مقابلہ کیا۔اگر یہ سب نسخے کسی ایک کتب خانے میں یا مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہوتے یا کسی طرح ہر شخص کی دسترس کے اندر ہوتے تو میں ان کے اختلافات درج کرتے وقت ان کا حوالہ بھی دیتا جاتا۔مگر خود مجھ کو ان کے حاصل کرنے میں اتنی دقّت اور اتنی زحمت اُٹھانا پڑی کہ میرا دل ہی جانتا ہے اور اب اگر دوبارہ ان سب کو فراہم کرنا چاہوں تو ایک مدّت کی دردودوش کے بعد بھی یقیناً کامیابی نہ ہوگی۔''

(اُصولِ تحقیق وترتیب متن،ص.۳۶)

رشید حسن خاں کو''باغ و بہار'' کی تدوین کے سلسلے میں کافی تگ ودَو کرنی پڑی۔انہوں نے''باغ و بہار'' کے تین نسخوں کو قابلِ ذکر بتایا ہے۔ہندی مینول (Manual) میں شائع شدہ ۱۰۲رصفحات جس کا ذکر گل کرسٹ نے اپنے کسی خط میں کیا تھا۔دوسرا کلکتہ میں جس کی اشاعت ہوئی تھی اور تیسرا ڈنکن فاربس کا مرتب کردہ۔''ہندی مینول'' کی تلاشِ بسیار کے بعد وہ کس صورت میں دستیاب ہوا،اس پوری روداد کو خان صاحب نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''ہندی مینول کے سلسلے میں ایک عجیب اتفاق رونما ہوا جس کا ذکر کرنا ضروری ہے۔مجھے ایک زمانے سے اِس کی تلاش تھی۔۱۹۶۳ء یا ۱۹۶۴ء میں ایک بار ڈاکٹر مختارالدین آرزو سے باغ و بہار کی تدوینِ نَو کا ذکر آیا۔اُنہوں نے کہا کہ اُن کے پاس ایک قدیم نسخہ ٹائپ میں چھپا ہوا ہے،جو ہے تو باغ و بہار کا حصّہ،لیکن اُس کا سرِ ورق اور آخر کے صفحات موجود نہیں،اِس لیے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ کب کا چھپا ہوا ہے۔انہوں نے ازراہِ لطفِ خاص وہ نسخہ مجھے دے دیا۔میں نے اِسے دیکھا لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کون سی اشاعت ہے۔شروع کا صفحہ،جس پر بسم اللہ مرقوم ہے،موجود،لیکن آخر سے ناقص۔آخری مطبوعہ صفحے پر صفحہ نمبر ۱۰۲رموجود ہے،لیکن کسی شخص نے آٹھ صفحے اپنے قلم سے لکھ کر،پہلے درویش کی سیر کو مکمّل کر دیا ہے۔میں نے اُسے رکھ لیا اور پھر بھول گیا۔اب جو لندن سے ہندی مینول میں شامل چار درویش کے ۱۰۲رصفحوں کا عکس آیا،تو اچانک مجھے وہ نسخہ یاد آیا،اُسے نکال کر دیکھا؛ مقابلہ جو کرتا ہوں تو معلوم ہوا کہ یہ تو ہندی مینول کا حصّہ ہے، کسی شخص نے اصل کتاب سے اِن اوراق کو الگ کر لیا تھا اور پھر کسی شخص نے یہ دیکھ کر کہ پہلے درویش کی سیر ناتمام ہے،اپنے قلم سے اُسے مکمل کر دیا اور جلد بندھوالی۔کیا عرض کروں کس قدر مسرّت ہوئی!''

(باغ و بہار،ص...۷۶تا۷۷)

03.05 مشفق خواجہ کا تحقیقی کارنامہ

جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے کہ مطلوبہ مواد کی فراہمی ایک نہایت دشوار گزار مرحلہ ہے۔ کبھی کبھی کوئی کم یاب یا نادر نسخہ فوراً ہاتھ لگ جاتا ہے اور کبھی کبھی ایک مدّت تک کامیابی کی کوئی صورت نہیں نکلتی۔ اگر مختلف جامعات، چھوٹے بڑے اُردو کے کتب خانوں اور نیشنل لائبریریوں میں جو مخطوطات کا ذخیرہ بکھری ہوئی شکل میں موجود ہے۔ اس کی فہرست سازی ممکن ہو سکے تو تحقیق کرنے والوں کا کام بہت آسان ہوسکتا ہے بلکہ اُردو میں تحقیق کی رفتار میں جو کمی واقع ہوگئی ہے وہ بھی دور ہوسکتی ہے۔ چیزیں جب آسانی سے دستیاب ہونے لگیں گی تو نئی نسلیں خود بخود تحقیق و تدوین جیسے کاموں کی طرف متوجہ ہوں گی۔ اقبال اور احمد دین کے گہرے رشتۂ اخلاص کے بارے میں اُردو دنیا پوری طرح واقف ہے۔ یہ بھی علم ہے کہ احمد دین نے اقبال کی شاعری کے مختلف پہلوؤں کا تنقیدی محاکمہ کیا تھا اور اسے باقاعدہ ایک کتاب کی شکل دی تھی لیکن کہا جاتا ہے کہ کسی وجہ سے انہوں نے اس کتاب کو خود ہی تلف کر دیا تھا۔ بعدازاں بعض تبدیلیوں (جن میں ترمیمات اور اضافے شامل ہیں) کے ساتھ ۱۹۲۹ء میں اس کا دوسرے ایڈیشن کی اشاعت عمل میں آئی۔ احمد دین کے پہلے نسخے میں کیا تھا اور بعدازاں اس میں کس نوعیت کی تبدیلی کی گئی اس سے اُردو دنیا اور اقبال کے فکر و فن پر کام کرنے والے لاعلم تھے۔ مشفق خواجہ پہلی اشاعت کی تلاش میں مسلسل مصروف رہے اور کسی نہ کسی طرح اس کے دو نسخے انہوں نے دریافت کر لیے۔

علاوہ اس کے مشفق خواجہ نے احمد دین کی ۲۰ کتابوں کا بھی پتہ لگایا جو سوانحی، تاریخی، ادبی، لسانیاتی، اسلامیاتی موضوعات پر مبنی ہیں۔ احمد دین کو نجوم و فلکیات (Astrology & Astronomy) سے بھی خصوصی دل چسپی تھی۔ مشفق خواجہ نے احمد دین کی کتاب ''اقبال'' کو دریافت کر کے ایک بڑا کارنامہ انجام دیا۔ اس کی قدر و قیمت کے بارے میں انہوں نے لکھا ہے کہ:

> ''احمد دین نے یہ کتاب ایسے زمانے میں لکھی جب اُردو میں تنقید، زبان و بیان کی خوبیاں اور خامیاں دکھانے تک محدود تھی۔ احمد دین نے تنقید کے اصل منصب کو پہچانا اور فن کار کو اس کی ذات اور عہد کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کی۔ اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ احمد دین نے اُردو تنقید کو فن کی پرکھ کے نئے معیار اور نئی قدروں سے آشنا کرایا۔ یہ کتاب اس اعتبار سے بھی اہمیت رکھتی ہے کہ اُردو میں پہلی تنقیدی کتاب ہے، جس میں کسی شاعر کے فکر و فن پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔''
>
> (ارمغان: ص....۳۸۰)

مشفق خواجہ کا ایک بڑا کارنامہ جائزۂ مخطوطات اردو ہے۔ پاکستان کے مقابلے میں ہندوستان میں اُردو کے کئی مراکز ہیں۔ ایسے بے شمار ادارے اور کتب خانے ہیں جہاں قدیم کتابیں اور ان کے مختلف نسخے موجود ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی وضاحتی فہرست تیار کی جائے۔ مشفق خواجہ نے تنِ تنہا یہ کام کر دکھایا۔ اس طرح کے کام بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ مشفق خواجہ نے پاکستان میں واقع سرکاری اور غیر سرکاری لائبریریوں اور ذاتی کتب خانوں تک رسائی حاصل کی اور مختلف عنوانات قائم کر کے ان کی وضاحتی فہرستیں تیار کیں۔ اس طرح معلومات کا بڑا ذخیرہ مہیّا کر دیا۔ آفتاب احمد آفاقی نے اس ذیل میں تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

''مشفق خواجہ کے تحقیقی کاموں کے ضمن میں یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ انہوں نے ہر جگہ غیر معمولی ریاضت کے ساتھ وسعتِ نگاہ کا واضح ثبوت دیا ہے۔ اس سلسلے کا ایک اہم کام ''جائزہ اُردو مخطوطات'' ہے جو پاکستان کے مختلف سرکاری، غیر سرکاری اور ذاتی کتب خانوں میں بکھرے ہوئے اُردو مخطوطات کے متعلّق ضروری معلومات فراہم کرنے کے علاوہ ہر مخطوطے کے دیگر نسخوں، مطبوعہ نسخوں، مصنّف کے حالات اور ماخذ پر خاصی توجہ دی گئی ہے۔ اس طرح یہ کام مخطوطات کی وضاحتی فہرست مرتب کرنے تک محدود نہیں رہا بلکہ ایک سوانحی و کتابیاتی جائزے کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ مشفق خواجہ نے ہر مخطوطے کے بارے میں چند عنوانات کے تحت تفصیلات بہم پہنچائی ہیں مثلاً تاریخ کتابت، خط، مہر، کیفیت، آغاز، اختتام، ترقیمہ، مندرجات، خصوصیات، دیگر نسخے، مصنّف، ماخذ وغیرہ۔ اس طور تحریر سے متعلقہ مخطوطہ ذاتی کتب خانے میں ہے تو کتب خانے کے مالک کا پتا بھی درج کر دیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ وضاحتی فہرست سوانحی کتابیاتی جائزے پر مبنی مکمل کتاب کے درجے کا حکم رکھتی ہے۔''

(ارمغان: ص.. ۳۸۱ تا ۳۸۲)

مختار الدین احمد نے فہرست سازی کے جو کام کیے ہیں ان کی بڑی قدر و قیمت ہے۔ مثلاً ''فہرستِ مخطوطاتِ احسن کلکشن'' ۱۹۵۳ء فہرستِ مخطوطات و نوادر کتب خانہ مسلم یونی ورسٹی ۱۹۵۳ء اور فہرستِ مخطوطات علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی ۱۹۸۰ء کی تحقیقی اہمیت مسلمہ ہے۔ اس طرح کی وضاحتی فہرستوں سے اسکالرز اور محقّقین کو کافی سہولت میسر آتی ہے لیکن اس طرح کے کام دوسری جامعات، کتب خانوں اور اداروں میں بھی ہونا چاہیے۔ جس کی بڑی ضرورت ہے۔

03.06 عملی مسائل کی نوعیت

تحقیق ایک کل وقتی عمل ہے، جس کے لئے محقّق کو مسلسل اور رات دن ذہنی و عملی طور پر مصروفِ کار رہنا پڑتا ہے۔ موجودہ زندگیوں میں ضروریات کا نقشہ کافی حد تک بدل چکا ہے۔ شاعری، فکشن نگاری یا تنقید کے میدانوں میں عملی تحقیق و جستجو کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ذہن اگر موزوں ہے یا فکشن کی فہم رکھتے ہوں تو بھی تخلیقی کام انجام دیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح تنقید نگار کے لئے محض مطالعے کی شرط ہے۔ وہ اپنی رائے قائم کرنے میں آزاد ہوتا ہے۔ تحقیق، تلاش و جستجو سے عبارت عمل ہے۔ بغیر ثبوت، جواز، حوالے اور دلیل کے تحقیق کوئی معنی نہیں رکھتی۔ محقّق کو کبھی کبھی دَر بدر بھٹکنا پڑتا ہے، کتب خانوں کی خاک چھاننی پڑتی ہے۔ مختلف حضرات سے رابطہ قائم کرنا پڑتا ہے۔ مختلف نسخوں کا تقابلی مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے محقّق کا کام بڑا دشوار گزار اور مشقّت طلب ہے۔ سوال یہ اُٹھتا ہے کہ موجودہ ''صارفی سماج'' میں بغیر کسی مالی معاونت یا آمدنی کے محض تحقیق کے کام کو کوئی اپنا قیمتی وقت مہیا کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے آج کے تقاضے قطعاً مختلف ہیں۔ جاگیرداری اور زمیں داری کے زمانے لَد گئے۔ اُردو کے لئے سیاسی ماحول بھی سازگار نہیں ہے۔

تحقیق سے جن ذہنوں کو فطری مناسبت ہے یا وہ نوجوان جو جامعات سے تحقیق کی ڈگری حاصل کر چکے ہیں۔ انہیں اگر کوئی سرکاری یا نیم سرکاری ادارہ تحقیق کے منصب سے لگاتا ہے تو اُردو میں تحقیق کی اس روایت کی توسیع ممکن ہے جسے قائم کرنے میں حافظ محمود شیرانی، عبدالحق، قاضی عبدالودود، مالک رام، امتیاز علی عرشی اور رشید حسن خاں نے اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ ہمارے سرکاری، نیم سرکاری اُردو اداروں اور جامعات کو تحقیق طلب اور تدوین طلب موضوعات کی وضاحتی فہرست بنانے کی ضرورت ہے۔ تمام جامعات کے شعبہ ہائے اُردو میں باہمی ربط وضبط کی اگر کوئی سبیل نکلے تو ایسے موضوعات کی فہرست تیار کی جاسکتی ہے جو تحقیق طلب ہیں اور جن پر یا تو کام نہیں ہوا ہے اور اگر ہوا ہے تو وہ اس پایہ کا نہیں ہے کہ اسے شائع بھی کیا جائے۔ ہمارے سرکاری اور نیم سرکاری اداروں جیسے قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان اور مختلف صوبائی اُردو اکیڈمیاں اگر اس طرح کے محقّقین کے لئے مناسب وظیفہ کی رقم مختص کر سکیں تو یہ ایک ٹھوس کام ہوگا اور تحقیق کی رفتار تیز تر ہو سکے گی نیز اس کا معیار بلند ہونے کا امکان بھی متوقع ہے۔

03.07 جامعاتی تحقیق اور مسائل

جامعاتی تحقیق کے مسائل جامعات سے باہر آزادانہ تحقیق کرنے والوں سے مختلف ہیں۔ جامعات کے اپنے مقررہ ضابطے اور قاعدے ہیں جن کے مطابق اسکالرز کا انتخاب ہوتا ہے۔ تحقیق کے لئے جس مزاج، فطری مناسبت اور ذوق وشوق کی بات کہی جاتی ہے اس کا اطلاق ان اسکالرز پر نہیں ہوتا۔ کیوں کہ یہاں خدمت یا علمی ترقّی مقصود نہیں ہوتی بلکہ حصولِ سند اور اس کے بعد حصولِ روزگار مقصود ہوتا ہے۔ مقاصد کی نوعیت اور فرق ہی سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ اسکالر محض اسی وقت تک تحقیق کے کام میں مصروف رہتا ہے جب تک کہ اسے ڈگری نہیں مل جاتی۔ یہ بھی ایک عام تجربہ ہے کہ اسکالرز تحقیق کے تقاضوں کو بھی ملحوظ نہیں رکھتے۔ رجسٹریشن (Registration) کے بعد ہی سے مواد کی فراہمی ان کا منصب ہونا چاہیے لیکن ابتدائی برس وہ محض اِدھر اُدھر مٹر گشتی یا غیر ادبی کاموں میں لگا دیتے ہیں۔ آخر میں بے حد عجلت میں اپنے کام کو مکمّل کر کے پیش کر دیتے ہیں۔ ان کا خواب ایک عمدہ تحقیقی مقالہ نہیں ہوتا بلکہ ڈگری اور نوکری ہوتا ہے۔ ۹۰ رفیصدی سے زیادہ اسکالرز روزگار حاصل کرنے کے بعد تحقیق تو کیا لکھنا پڑھنا ہی چھوڑ دیتے ہیں۔

کوئی کسی سیاسی پارٹی کے ساتھ جڑ جاتا ہے۔ کوئی کسی ادارے کی ممبر شپ کے پیچھے بھاگتا ہے۔ ہر زبان میں کچھ سینئر اساتذہ پاور ہاؤس کے طور پر قائم ہیں۔ ہمارے اسکالرز نوکری پانے کے بعد ان کی خوشامد، چاپلوسی اور درباداری میں لگ جاتے ہیں نتیجہ یہ ہے کہ تحقیق محض ایک خانہ پری بن کر رہ جاتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ گزشتہ نسل سے تعلّق رکھنے والے اساتذہ نے واقعتاً تحقیقی مقالے لکھے تھے اور بڑی محنت ومشقّت سے تحقیق وتدوین کا کام کیا تھا۔ ذوقؔ کے کلام کی گراں قدر تدوین تنویر احمد علوی نے کی، قمر رئیس نے پریم چند کے ناولوں کا تحقیقی وتنقیدی مقالہ لکھا، محمد حسنؔ نے ''شمالی ہند میں اُردو کا فکری وتہذیبی پس منظر'' گوپی چند نارنگ کا ''ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اُردو مثنویاں''، نذیر احمد نے ''ظہوری کی حیات وخدمات'' پر مقالہ قلم بند کیا، حنیف نقوی نے ''شعرائے اُردو کے تذکرے'' پر پی ایچ.ڈی. کی ڈگری حاصل کی۔ اس طرح گیان چند، ابومحمد سحر، حامدی کاشمیری، مسعود حسن رضوی ادیب کے جامعاتی تحقیقی کاموں کا مرتبہ کافی بلند ہے۔

موجودہ وقتوں میں ہمارے اسکالرز تحقیق سے جی چراتے ہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ تو یہی ہے کہ مشکل پسندی ان کی سہولت پسند طبیعت سے میل نہیں کھاتی۔ دوسرے یہ کہ فارسی زبان سے وہ لاعلم ہیں۔ فارسی زبان کو سیکھنے کی طرف وہ مائل نہیں ہوتے۔ حالاں کہ دوسرے

شعبوں کے طلبا ایک سے زیادہ زبانیں سیکھنا چاہتے ہیں۔انگریزی اور ہندی شعبوں کے طلبا اُردو، فرانسیسی، روسی، چینی اور جرمنی سیکھ رہے ہیں لیکن فارسی سکھانے والی کلاسوں میں اُردو کا کوئی طالب علم نظر نہیں آتا۔اُردو میں تحقیق کے لئے فارسی زبان سے واقفیت ضروری ہے۔گیان چند فارسی کے ساتھ انگریزی بھی ضروری سمجھتے ہیں۔محض فارسی اور انگریزی زبانوں کا علم ہی نہیں سیاسی اور سماجی تاریخ سے شناسائی بھی ضروری ہے۔بقول ان کے:

''اُردو کے محقّق کو انگریزی اور فارسی دو زبانوں سے واقفیت ناگزیر ہے۔ایسے موضوع کم ہوں گے جن پر فارسی سے بے نیاز رہ کر کام کیا جاسکے۔فارسی میں اتنی دسترس ضروری ہے کہ فارسی مخطوطات کو پڑھا اور سمجھا جاسکے۔اُردو کے بیش تر تذکرے فارسی میں ہیں بیش تر اصنافِ سخن فارسی اصناف کا پرتو ہیں۔سیاسی اور سماجی پس منظر لکھنے کے لئے فارسی اور انگریزی تاریخوں کو کھنگالنا پڑتا ہے۔نئے ادبی رجحانات کا جائزہ لینے کے لئے مغربی ادب اور تنقید کا مطالعہ ناگزیر ہے۔لسانیات پر کام کرنے والوں کے لئے کم سے کم ہندی اور اگر ہوسکے تو سنسکرت، پالی، پراکرت وغیرہ سے بھی متعارف ہونا ضروری ہے۔محقّق کا مطالعہ جتنا وسیع ہوگا اسی قدر اس کی نظر وسیع اور دُوررَس ہوگی۔اس کے لئے محض ادبیات کا مطالعہ کافی نہیں۔ادب کے پس منظر کے لئے سیاسی اور سماجی تاریخوں سے شناسائی بھی ضروری ہے۔''

(تحریریں:ص.۱۳تا۱۴)

ہمارے طلبا شاعری کے بجائے فکشن اور نثری ادب کی طرف زیادہ رغبت رکھتے ہیں۔کیوں کہ طلبا میں شاعری کے ذوق اور شاعری کی فہم کی سطح بہت پست ہوگئی ہے۔بیش تر طلبا کو ادب ہی سے کوئی دل چسپی نہیں اور نہ ادب و غیر ادب کے فرق کو وہ سمجھتے ہیں۔نثری ادب یا فکشن کے تنقیدی مطالعے کے لئے بھی تنقیدی شعور لازمی ہے۔پریم چند یا کرشن چندر کے فکشن پر تحقیقی مقالہ لکھنے کے معنی محض پریم چند یا کرشن چندر کے ادب کا مطالعہ ناکافی ہے۔فکشن کے دوسرے اہم ناموں اور پوری تاریخ کا مطالعہ ہی ان میں اچھے اور برے فکشن کا علم و شعور مہیا کر سکتا ہے۔مطالعے کے لئے مطالعے کا شوق ناگزیر ہے اور یہی چیز ہمارے اسکالرز میں کم سے کم نظر آتی ہے۔

03.08 جامعاتی اسکالرز کے عملی اور تکنیکی مسائل

جامعاتی اسکالرز کا سب سے بڑا مسئلہ موضوع کا تعیّن ہوتا ہے۔بعض یونی ورسٹیز میں ریسرچ کمیٹی اور شعبۂ اُردو میں لچک پائی جاتی ہے۔وہ اسکالرز کی دل چسپی اور ذہنی سطح کو مدِّنظر رکھتے ہیں اور خود اسکالر کے طے کردہ موضوع کو ترجیح دیتے ہیں۔بعض اسکالرز ادب کا ذوق رکھتے ہیں،نسبتاً ان کا مطالعہ گہرا ہوتا ہے یا انہیں مطالعے کا شوق ہوتا ہے۔ان کی خود کی بھی کچھ ترجیحات ہوتی ہیں۔ان کی ترجیحات کو مدنظر رکھ کر ان سے گفتگو اور بحث کی جاتی ہے اور پھر انہیں ان کے طے کردہ موضوع کو منظوری دے دی جاتی ہے۔بحث اور گفتگو میں محض موضوع کا مسئلہ ہی درپیش نہیں ہوتا بلکہ موضوع کی اہمیت، افادیت اور معنویت پر بھی غور کیا جاتا ہے۔یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ پیش کردہ موضوع پر کسی اور یونی ورسٹی نے ڈگری نہیں دی ہو یا اس سے بہتر کام کی توقع کی بنیاد پر بھی اسے منظور کیا جاسکتا ہے۔

اس کے برعکس بعض مقامات میں اسکالر کو موضوع دیا جاتا ہے۔ خواہ اسے اس سے دل چسپی ہو یا نہ ہو۔ رجسٹریشن کے قاعدے بھی بہت سخت ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی دو دو سال محض رجسٹریشن میں لگ جاتے ہیں۔ سنوپسس (Synopsis) کی تیاری میں نگراں اور اسکالر کے درمیان جو تال میل ہونا چاہیے اس کی کمی بھی بہت سے جذباتی مسائل پیدا کر دیتی ہے۔ ایک اہم بات یہ ہے کہ مطلوبہ مواد کی فراہمی اتنی آسانی نہیں ہوتی۔ خصوصاً ایک طالب علم کے لئے متعلقہ مواد کو اکٹھا کرنا اس لئے بھی مشکل ہوتا ہے کہ مبتدی ہونے کے ناطے اسے ان ذرائع کا پوری طرح علم نہیں ہوتا جہاں اسے متعلقہ مواد دستیاب ہوسکتا ہے۔ اکثر ان کے نگراں بھی ان ذرائع سے واقف نہیں ہوتے۔ ان نزاکتوں اور دقتوں کے پیش نظر اسکالرز کے موضوع کا تعیّن کرنا چاہیے تاکہ وہ معینہ وقت میں اس کام سے عہدہ برآ ہو سکے۔

تحقیقی مقالے کی تیاری کے سلسلے میں موضوع کی ابواب بندی یا تبویب، سنوپسس کی خاص اہمیت ہے۔ ایک بہتر تبویب کے لئے تجربہ کار ذہن ناگزیر ہے۔ نگراں کی نگہداشت میں اگر کئی مقالات کو پی ایچ.ڈی. کی ڈگری مل چکی ہے تو وہ بہتر طور پر تبویب کی تشکیل کر سکتا ہے۔ تبویب ایک لائحہ عمل ہوتا ہے۔ منزل تک پہنچنے کی ایک سیدھی راہ ہوتی ہے۔ تبویب ہی اگر پیچیدہ یا ضرورت سے زیادہ اس کا دامن وسیع ہے تو معینہ وقت کی مدّت کم پڑ سکتی ہے۔ اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ تبویب کو بہت پیچیدہ اور تفصیل دیکھ کر طلبا درمیان ہی سے ریسرچ کا کام چھوڑ دیتے ہیں۔ اس لئے تبویب کو بے حد واضح اور راست ہونا چاہیے۔

مقالہ لکھنے سے پہلے اسکالر کے لئے یہ ضروری ہے کہ مختلف لائبریریوں سے رابطہ قائم کرے اور موضوع سے متعلّق معاون اور حوالہ جاتی کتب کی فہرست تیار کرے۔ ان رسائل و جرائد کی تلاش بھی ضروری ہے جن میں تحقیقی مضامین کی اشاعت ہوتی رہتی ہے۔ مطلوبہ مواد محض کتابوں میں محفوظ نہیں ہوتا بلکہ اکثر رسائل اور جرائد میں بھی دستیاب ہوتا ہے۔ کیوں کہ ضروری نہیں کہ وہ مضامین کسی کتاب کی زینت بنے ہوں۔ ان رسائل و جرائد کی فائلیں علی گڑھ یونی ورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری، خدا بخش لائبریری (پٹنہ) اور رضا لائبریری (رام پور) میں موجود ہیں۔ چوں کہ موجودہ دَور میں اسکالرشپ کے طور پر خاصی بڑی رقم بھی ان اسکالر کو ماہ بہ ماہ ملتی ہے اس لئے پٹنہ، علی گڑھ یا رام پور یا حیدرآباد وغیرہ کے سفر کے مصارف وہ آسانی کے ساتھ اُٹھا سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایمان داری اور دیانت داری سے کام کرنے کی نیت بنیادی چیز ہے۔ ش.اختر نے اپنی کتاب تحقیق کے طریقۂ کار میں، اسکالر کے مسائل پر تفصیل سے بحث کی ہے۔

درج ذیل اقتباس میں انہوں نے ان مسائل کا نچوڑ پیش کر دیا ہے:

''ریسرچ اسکالر کے مسائل خاص کر اُردو دنیا میں بنیادی حیثیت کے ہیں۔ اوّل تو یہ کہ پوسٹ گریجویٹ کی سطح پر ان کی تعلیم کا مناسب انتظام نہیں۔ دوئم تحقیق کے طریقِ کار پر کوئی اچھی معلوماتی اور معیاری کتاب اُردو میں اب تک نہیں لکھی گئی۔ حالاں کہ ملک جید محقّقین سے خالی نہیں۔ ہندوستان میں اُردو کے دانش وروں نے بھی اس کی طرف دھیان نہیں دیا اس کا ایک بڑا نقصان یہ ہوا کہ **M.Phil** اور **Ph.D**، **D.Litt** کے مقالات دو طرح کی کمزوریوں اور خامیوں کا شکار ہو کر رہ گئے ہیں:

﴿۱﴾ ریسرچ اسٹوڈنٹس طریقۂ کار کی لاعلمی کی وجہ سے سینکڑوں صفحات کا پلندہ تو جمع کر دیتے ہیں، لیکن نہ **Synopsis** قاعدہ کی بنی ہوئی ہے نہ موضوع کا مناسب انتخاب ہوتا ہے۔

﴿۲﴾نگراں خود طریقۂ کار سے ناواقف ہیں انہیں نہیں معلوم کہ Term-Paper، Assessment اور پی ایچ.ڈی. یا ڈی.لٹ. کے مقالوں میں کیا فرق ہے۔انہیں اس کا بھی احساس نہیں کہ ادبی تحقیق سماجی علوم کی تحقیق سے بہت استفادہ کرسکتی ہے اور یہ ضروری بھی ہے۔لیکن بدقسمتی سے اُردو کے اساتذہ کرام کی بڑی تعداد ایسی ہے جو مولویت اور خانقاہی تربیت کے زیر اثر جدید علوم اور سائنس سے استفادہ کو اب بھی گناہ کے مترادف تصوّر کرتے ہیں۔اس چشم پوشی کی وجہ سے طالب علموں کو ڈگری تو مل جاتی ہے لیکن تھیسس (Thessis) معیار کی ادنی سطح پر بھی پوری نہیں ہوتی۔اس لئے ضروری ہے کہ حسب ذیل اُمور کی طرف اربابِ حل وعقد دھیان دیں:

﴿الف﴾ Dissertation کو لازمی موضوع بنادیا جائے۔

﴿ب﴾ تحقیق کے طریقۂ کار کا نظریاتی سبق نصاب میں شامل کردیا جائے۔

﴿ج﴾ سماجی علوم کے ذریعے ادبیات کی تعلیم کا نظم کیا جائے۔

﴿د﴾ عصری ادب (بین الاقوامی اور قومی) کا مطالعہ نصاب کا ایک ناگزیر حصّہ ہوجائے۔

﴿ہ﴾ دوسری زبانوں کے ادب میں تحقیق کی رفتار اور اس کے سرمایہ سے واقفیت کی کوئی عملی صورت نکالی جائے۔

﴿و﴾ شعبہ کے ریسرچ جرنل معلوماتی مضامین سے پر ہوں جس میں ابتدائی اور اعلیٰ سطح کی تحقیقی کاوشوں کا جائزہ بھی لیا جائے۔

﴿ز﴾ اساتذۂ کرام کے لئے ریسرچ کے طریقۂ کار کا ایک ریفریشر کورس بنایا جائے اور سال میں ایک بار اس کی تربیت دی جائے، اس سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ اسکالر اور نگراں ریسرچ کے ابتدائی مسائل سے واقف ہوجائیں گے اور وہ طریقۂ کار کی روشنی میں تحقیق کی دشوار گزار راہوں کو طے کرنا سیکھ جائیں گے۔''

(تحقیق کے طریقۂ کار:ص..۲۸ تا ۳۰)

03.09 خلاصہ

تحقیق آزادانہ سطح پر ہو یا جامعاتی سطح پر ڈگری حاصل کرنے سے اس کا تعلّق ہو۔اس کا بنیادی منصب ''حق کی دریافت'' ہے۔ آزادانہ تحقیق کرنے والوں کو تحریک دینے والا ان کا جذبۂ صادق ہوتا ہے، جو کسی ڈگری یا ملازمت یا صلہ وانعام کے حصول کے لئے تحقیق کا کام انجام دیتے ہیں۔علم کی خدمت کا جذبہ ان کے شوق پر مہمیز کا کام کرتا ہے۔جامعاتی اسکالرز کا بنیادی مسئلہ موضوع کے انتخاب، اس کے سنوپسس Synopsis کی تیاری، مواد کی فراہمی اور ایک خاص مدّت میں اسے مکمّل کرنے سے عبارت ہے۔

جامعاتی اسکالر عموماً ڈگری کی غرض سے تحقیق وتنقید کے کام کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔بعض اسکالرز ادب کا شوق رکھتے ہیں اور ان کا مقصد کچھ کر کے دکھانا ہوتا ہے۔دونوں صورتوں میں تحقیق وتدوین کا کام ایک بڑی آزمائش کے مماثل ہوتا ہے۔لائبریریوں، اُردو کے بڑے اداروں اور جامعات کے کتب خانوں میں محفوظ کتابوں اور مخطوطات کی فہرستیں اگر تیار کی جاسکیں تو آزادانہ کام کرنے والوں اور جامعاتی اسکالرز کو مطلوبہ مواد کی فراہمی میں پیش آنے والی ممکنہ دقتیں کم ہوسکتی ہیں اور وہ مقررہ مدّت میں مقالے کو مکمّل کرسکتے ہیں۔

03.10 فرہنگ

آرکائیوز	:	محکمۂ آثار قدیمہ، Archives	خاصّہ	:	خاص قوت
تبویب	:	ابواب بندی، Synopsis	کُنہ	:	اصلی، بنیاد
تشہیر	:	شہرت	لائحۂ عمل	:	عملی منصوبہ
تفویض	:	سپرد کرنا	مخطوطات	:	مخطوطہ کی جمع، قلمی نسخہ
توثیق	:	مستحکم کرنا	مصادر	:	مصدر کی جمع، اصل، بنیاد
توجیہ	:	وضاحت کرنا	منصب	:	مقصد

03.11 سوالات

مختصر سوالات

سوال نمبر۱ : آزادانہ تحقیق کا مفہوم کیا ہے؟

سوال نمبر۲ : تحقیق کو ''حق کی دریافت'' کیوں کہا جاتا ہے؟

سوال نمبر۳ : تحقیق ایک دقت طلب اور صبر آزما کام کیوں ہے؟

سوال نمبر۴ : آزادانہ سطح پر تحقیق کا کام کرنے والوں کو کیا سہولتیں میسر ہیں؟

تفصیلی سوالات

سوال نمبر۱ : جامعاتی تحقیق میں کن مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے؟

سوال نمبر۲ : مشفق خواجہ کے کس تحقیقی کارنامے کی خاص اہمیت ہے؟

سوال نمبر۳ : مواد کی فراہمی کو ایک نہایت مشکل مرحلہ کیوں کہا جاتا ہے؟

سوال نمبر۴ : جامعاتی اسکالرز کے عملی اور تکنیکی مسائل کیا ہیں اور انہیں کس طرح حل کیا جا سکتا ہے؟

معروضی سوالات

سوال نمبر۱ : علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے کتب خانے کے مخطوطات کی فہرست سازی کس نے کی ہے؟

(الف) حنیف نقوی (ب) رشید حسن خاں (ج) مختار الدین احمد (د) مشفق خواجہ

سوال نمبر۲ : ''ہندی مینول'' کی تلاش کس نے کی تھی؟

(الف) تنویر احمد علوی (ب) قاضی عبدالودود (ج) مالک رام (د) رشید حسن خاں

سوال نمبر۳ : ''جائزۂ اُردو مخطوطات'' کس کا تحقیقی کارنامہ ہے؟

(الف) امتیاز علی عرشی (ب) مشفق خواجہ (ج) عبدالحق (د) محمود شیرانی

سوال نمبر۴ : اردو محقق یا اسکالر کے لئے کس زبان کا علم بے حد ضروری ہے؟

(الف) فارسی (ب) عربی (ج) انگریزی (د) فرانسیسی

معروضی سوالات کے جوابات

جواب نمبر۱ : (ج) مختارالدین احمد جواب نمبر۳ : (ب) مشفق خواجہ

جواب نمبر۲ : (د) رشید حسن خاں جواب نمبر۴ : (الف) فارسی

03.12 حوالہ جاتی کتب

۱۔ اصولِ تحقیق و ترتیب متن از ڈاکٹر تنویر احمد علوی

۲۔ ارمغان مرتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

۳۔ تحریریں از گیان چند

۴۔ تحقیق کے طریقۂ کار از ش.اختر

۵۔ باغ و بہار مرتبہ رشید حسن خاں

اکائی 04 : تحقیق اور تنقید کا باہمی تعلّق

ساخت :

04.01 : اغراض ومقاصد

04.02 : تمہید

04.03 : تحقیق کے معنی اور مفہوم

04.04 : تنقید کے معنی اور مفہوم

04.05 : تحقیق کے عمل اور تنقید کے عمل میں امتیازات کی نوعیت

04.06 : تحقیق کے عمل اور تنقید کے عمل میں مماثلتیں

04.07 : خلاصہ

04.08 : فرہنگ

04.09 : سوالات

04.10 : حوالہ جاتی کتب

04.01 اغراض ومقاصد

تحقیق اور تنقید کے میدانِ عمل یا دائرۂ کار میں بنیادی نوعیت کی مماثلتیں اور امتیازات کیا ہیں؟ یہ سوال اکثر ادبی مباحث کا موضوع ہوتا ہے۔اس اکائی کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ دونوں کی اہمیت، افادیت اور معنویت پر بحث کی جائے اور یہ دیکھا جائے کہ دونوں ایک دوسرے کے لئے کس قدر معاون ہیں۔ دونوں کی خصوصات کیا ہیں؟ کیا دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں۔ان سوالات پر گہرائی کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ہمارے طلبا کو دونوں کی واضح تصویر مہیا کی جاسکے اور ان غلطیوں یا خوش فہمیوں کا ازالہ ہوسکے جو عموماً مقبول عام حیثیت رکھتی ہیں۔

04.02 تمہید

تحقیق اور تنقیدی دونوں کے اپنے اپنے طریقۂ کار اور عمل کی نوعیتیں ہیں۔اپنی اپنی جگہ دونوں اہم ہیں۔دونوں ایک دوسرے کے لئے معاون ہیں۔قدیم ادب میں ایک بہت بڑا حصّہ الحاقی ہے۔اس کو صحیح تر صورت میں دریافت کرنا، اصل نسخوں تک پہنچنا اور شاعر یا مصنف کا تعین کرنا ایک بنیادی کام ہے۔ادبی متون بالعموم نقل در نقل سے گزرتے آئے ہیں۔صاحبِ نقل سے بھی غلطیاں سرزد ہوتی ہیں۔کبھی کبھی تصحیح کی غرض سے بھی بنیادی متن کچھ کا کچھ ہوجاتا ہے۔ یہ اُردو ہی میں نہیں دنیا کی دوسری زبانوں میں بھی ہوا ہے۔اس صورت میں تدوین کار اور محققین اغلاط وتسامحات کی نشان دہی کرتے ہیں اور ایک صحیح تر متن تک پہنچنے کی سعی کرتے ہیں۔صحیح تر متن ہی صحیح تر تنقید کی بنیاد بن سکتا ہے۔

اس طرح تنقید بھی گمراہی سے بچتی ہے۔ یہ تو تحقیق وتدوین کی وہ صورت ہے جو تنقید کو صحیح تر متون فراہم کرتی ہے۔ لیکن تحقیقی کا عمل بنیادی طور پر ایک طرح سے تنقید کا عمل بھی ہے۔ محقّق وتدوین کار کو تنقیدی شعور سے کام لینا پڑتا ہے۔ کیوں کہ تنقید اور تحقیق دونوں کا کام چھان پھٹک کا ہے۔ صحیح متن کی دریافت کے عمل کو متنی تنقید کہا جاتا ہے۔ اس اکائی میں درج ذیل اُمور کو بنیاد بنایا گیا ہے۔

﴿۱﴾ تحقیق کے معنی اور مفہوم ﴿۲﴾ تنقید کے معنی اور مفہوم

﴿۳﴾ تحقیق وتنقید کے امتیازات ﴿۴﴾ تحقیق وتنقید میں مماثلتیں

ان اُمور کے بارے میں علم حاصل کرنے کے بعد ہمارے طلبا کے لئے یہ سمجھنا آسان ہوجائے گا کہ تحقیق وتنقید میں کس نوعیت کا رشتہ ہے اور یہ ایک دوسرے کے لئے کس قدر معاون اور ناگزیر ہیں۔

04.03 تحقیق کے معنی اور مفہوم

تحقیق، حق کی تلاش یا حقائق کی بازیافت کے عمل کا نام ہے۔ تحقیق کا تعلق محض ادب سے نہیں ہے۔ سائنسی اور سماجی علوم میں بھی تحقیق کے عمل کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ مختلف علوم میں جو ارتقائی عمل دکھائی دیتا ہے اور انسانی تہذیب جس طرح ارتقا پذیر ہے اس کے پیچھے تحقیق وجستجو کا مسلسل عمل کارفرما ہے۔ ہر تحقیق، دوسری تحقیق کے لئے راہ ہم وَار کرتی ہے۔ مغالطوں اور خوش فہمیوں سے آگاہ کرتی ہے۔ آگاہیوں کو جِلا بخشتی ہے۔ تحقیق کا منصب ہی سچائی اور صحیح کی تلاش ہے۔ لیکن سچائی یا سچ بھی ایک اضافی قدر ہے۔ جیسا کہ الفریڈ نارتھ وہائیڈ ہیڈ کا قول ہے:

"There are no whole truths; all truths are half-truths. It is trying to treat them as whole truths that plays the devil."

''یعنی کوئی صداقت مکمل صداقت نہیں ہے۔ تمام صداقتیں آدھی صداقتیں ہیں۔ اُنہیں مکمل صداقتوں کے طور پر سمجھنے کی کوشش کرنا شیطانی کام ہے۔''

الفریڈ نارتھ وہائٹ ہیڈ (Alfred North Whitehead) کا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح کل کے سچ آج جھوٹ یا غلط ثابت ہوئے اسی طرح آج کی دریافت شدہ حقیقت کل غلط ثابت ہوسکتی ہے۔ کل کے مسلّمات آج ٹوٹ رہے ہیں اور آج کے مسلمات کو کل چیلنج کا سامنا ہوگا۔ تحقیق ایک مسلسل عمل ہے۔ جس کے ذریعے ہماری کوشش یہ ہوتی ہے کہ تاریخ کی گم شدہ کڑیوں کا پتہ لگائیں۔ جو جھوٹ مستحکم ہوگئے ہیں انہیں مزید پھلنے پھولنے سے روکیں۔ اس طرح انسانی تہذیبی ترقّی کے عمل میں تحقیق ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ علوم وفنون کی جو ترقّی یافتہ صورت آج نظر آرہی ہے اس کے پیچھے کئی نسلوں کی ذہنی کاوشوں، جِلا کاریوں اور آزمائشوں کا دخل ہے۔

خدا کی وَدیعَت کردہ فطرت کو بھی انسان نے ایک نظم دینے، سجانے بنانے کی کوشش کی ہے۔ ہزاروں لاکھوں برسوں سے قطع وبُرید کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ اقبال نے بھی کہا تھا:

تو شب آفریدی ، چراغ آفریدم — سفال آفریدی ، ایاغ آفریدم

تو رات پیدا کرتا ہے میں چراغ پیدا کرتا ہوں — تو مٹی پیدا کرتا ہے میں اس سے پیالے بناتا ہوں

بیابان و کہسار و راغ آفریدی گلستان و گلزار و باغ آفریدم

تو جنگل ، صحرا ، پہاڑ پیدا کرتا ہے میں پھولوں سے لدے ہوئے باغ اور چمن زار پیدا کرتا ہوں

من آنم کہ از سنگ ، آئینہ سازم من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

میں وہ ہوں جو پتھر کو گھِس کر آئینہ بنا لیتا ہوں میں وہ ہوں جو زہر کو نچوڑ کر مشروب بنا لیتا ہوں

یہاں اقبال خدا سے خطاب کرتے ہوئے انسانی ذہن و وِجدان کے خیرہ کن عمل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ بتاتے ہیں کہ انسانی زندگیوں میں یہ جو سارا حُسن ہے، فطرت میں یہ جو نفاست و تراش خراش ہے، اس خودی کا کمال ہے جو خود بھی ایک سطح پر خلّاقی کی صلاحیت سے مملو ہے۔ خدا نے انسان کو بھی ایک طرح تخلیقی، تشکیلی اور ترکیبی اہلیتوں سے سرفراز کیا ہے۔ انسان اگر تحقیقی شعور سے محروم ہوتا تو وہ خوب سے خوب تر کی جستجو کی طرف مائل نہ ہوتا، نہ دنیا پہلے کے مقابلے میں اس قدر رہائش کے لائق ہوتی۔ حنیف نقوی نے تحقیق کے اسی تہذیبی عمل کو بنیاد بنا کر واضح کیا ہے کہ:

''تحقیق حقائق کی بازیافت کا عمل ہے جو اہلِ علم کو ان کی کوتاہیوں اور لغزشوں سے آگاہ کر کے ان کی اصلاح کے مواقع فراہم کرتا رہتا ہے۔ حقائق کی یہ بازیابی ان واقعات کی تلاش و جستجو سے عبارت ہے جو مُرورِ ایام کے ساتھ ماضی کا حصّہ بنتے رہتے ہیں اور رفتہ رفتہ ہمارے دائرۂ علم سے باہر ہو جاتے ہیں۔ بہ الفاظِ دیگر محقق وقت کے لامتناہی سلسلے کی ٹوٹی ہوئی کڑیوں کو دوبارہ جوڑنے اور تاریخ کی بھولی بسری سچائیوں کو از سرِ نَو منظّم و مربوط کرنے کا وہ اہم فریضہ انجام دیتا ہے جس کے بغیر نہ ہم اپنے تہذیبی تشخص کا عرفان حاصل کر سکتے ہیں اور نہ علوم و فنون کا کارواں نئی جہتوں سے آشنا اور نئے آفاق سے روشناس ہو سکتا ہے۔ اس اعتبار سے علم و ادب اور تصنیف و تالیف کے دوسرے میدانوں میں کام کرنے والوں کی بہ نسبت محقق کا منصب زیادہ انہماک، زیادہ غور و فکر اور زیادہ دقّتِ نظر کا طالب ہوتا ہے۔''

(تحقیق و تدوین: ص..۱۲)

تحقیق کا کام محض نامعلوم کی دریافت ہی سے تعلق نہیں ہے۔ معلوم حقائق کی چھان بین بھی اس کے دائرے میں آتی ہے۔ جو کچھ کہ تحقیق ہو چکا ہے اس میں بھی توسیع اور مزید تحقیق و تفتیش کی گنجائش ہوتی ہے۔ مثلاً غالبؔ کے بارے میں یہ خیال عام تھا کہ وہ فارسی کلام میں صرف غالبؔ تخلص استعمال کرتے تھے بعد ازاں ''اسدؔ'' کے ساتھ غالبؔ بھی اُردو میں استعمال کرنے لگے۔ غلام رسول مہر جیسے ماہر غالبیات نے بھی اسی مقبول عام روایت پر اکتفا کیا۔ ان کے بعد امتیاز علی عرشی کو بھی یہ دھوکہ ہوا۔ اس غلط روایت کو سب سے پہلے ڈاکٹر ابو محمد سحر نے مسترد کیا۔ حنیف نقوی نے اس مسئلے پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

''مولانا غلام رسول مہر اور ان سے بڑھ کر مولانا امتیاز علی عرشیؔ جیسے ممتاز غالبؔ شناس کی تائید کے باوجود اس روایت کے دونوں ہی پہلو یعنی غالبؔ ابتدا میں صرف اُردو میں شعر کہتے تھے اور انہوں نے فارسی

میں صرف غالبؔ تخلص استعمال کیا ہے، از روئے تحقیق نا قابلِ قبول ہیں۔ اس غلط فہمی کی طرف سب سے پہلے ۱۹۷۰ء میں پروفیسر ابو محمد سحر نے اپنے ایک مضمون کے ذریعے متوجہ کیا۔ ان کے بقول ۱۹۲۱ء میں ''نسخۂ حمیدیہ'' کی اشاعت کے بعد ہی ماہرین غالبیات کو یہ معلوم ہو جانا چاہیے تھا کہ غالبؔ اُردو کی طرح فارسی میں بھی ابتدا میں اسدؔ ہی تخلص کرتے تھے۔ دیوان کے اس نسخے میں موجود فارسی کے ایک قصیدے میں انہوں نے یہی تخلص نظم کیا ہے۔ دیوان غالب بخطِ غالب کی دریافت کے بعد یہ حقیقت مزید واضح ہوگئی ہے کہ غالبؔ اپنی شاعری کے ابتدائی دور ہی میں فارسی میں بھی شعر کہنے لگے تھے اور وہ اس زمانے میں اُردو اور فارسی دونوں میں اسدؔ تخلص کرتے تھے۔''

(تحقیق وتدوین: ص..۱۶ تا ۱۷)

کہنے کا مطلب یہ کہ تحقیق کا باب ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔ تحقیق کے باب کے بند ہونے کے معنی انسانی علمی وتہذیبی ترقی کا باب بھی بند ہو گیا۔ تجسس انسانی جبلّت ہے اور تحقیق میں تجسُّس ذہن کو تحریک دینے اور بیدار رکھنے والی کلید ہے جس کے بوتے ہم کسی چیز کو رَد کرتے ہیں یا اس کا اثبات کرتے ہیں۔ محض تردید کوئی معنی نہیں رکھتی دریافت شدہ علم ومعلومات کی از سرِ نَو توثیق وتصدیق بھی اس کے عمل کا ایک حصّہ ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے گورکندن (قبر کھودنے جیسا کام) کہنے والوں پر پھبتی کستے ہوئے تحقیق کے عمل کو ادبی تاریخ کے لئے ناگزیر قرار دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے:

''ادبی تاریخ انسانی ذہن کے سفرِ ارتقا کی ایک اہم دستاویز ہے۔ صدیوں کے انسانوں کی وہ آپ بیتی ہے جو فن کے پردوں میں کہی گئی ہے۔ یہ تاریخ ان ادبی کارناموں کی ہوتی ہے جن میں نہ صرف حُسن اور فطرت کی مدح سرائی ہے بلکہ جن میں بالواسطہ اپنے عہد کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی تاریخ بھی محفوظ ہے۔ تحقیق کو گورکندن کہنے والے حضرات یہ بھول جاتے ہیں کہ کوئی مصنف خلا کی پیداوار نہیں ہوتا اور کسی مصنف کا فلسفہ، خیالات اور احساسات بھی صرف اسی کے ذہن کے مرہونِ منّت نہیں ہوتے، بلکہ مصنّف جس عہد سے تعلّق رکھتا ہے اور جن لوگوں میں رہتا ہے۔ یہ فلسفہ اور خیالات ان میں پہلے ہی موجود ہوتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ عہد کے عوام میں یہ سب کچھ مبہم اور غیر واضح ہوتا ہے اور مصنّف انہیں صاف اور واضح طور پر پیش کرتا ہے۔''

(تحقیق وتدوین: ص...۳۵)

04.04 تنقید کے معنی اور مفہوم

تحقیق کی طرح تنقید بھی ایک ڈِسپلن (Discipline) ہے جس کے اپنے اصول اور اپنے تقاضے ہیں۔ تنقید انگریزی لفظ Criticism کا ترجمہ ہے، اُردو میں جس کے معنی نقد ونظر کرنا یا فیصلہ کرنا ہے۔ تنقید ادب یا کسی ادبی تخلیق کی جانچ پرکھ کرتی اور اس کی قدر و قیمت کا تعین کرتی ہے۔ تنقید کے عمل میں جن امور کو بحث کا موضوع بنایا جاتا ہے وہ حسب ذیل ہیں:

﴿۱﴾ ہر ادبی تخلیق کی ایک لسانی ساخت ہوتی ہے، تنقید کا سفر اس لسانی ساخت کے تجزیے سے شروع ہوتا ہے۔

﴿۲﴾ تنقید لسانی سانچوں کے ساتھ فکری سانچوں پر غور کرتی ہے۔

﴿۳﴾ معنی کی نوعیّتوں کو زیرِ بحث لاتی ہے۔

﴿۴﴾ ادبی تخلیق کے اُسلوب اور ڈکشن یعنی تلفیظ کو اپنی بحث کا حصّہ بناتی ہے۔

﴿۵﴾ ہر تخلیق یا فن پارے کی کوئی ہیئت ہوتی ہے۔ تنقید اس کی نوعیت پر بحث کرتی ہے۔

﴿۶﴾ یہ بھی پتہ لگاتی ہے کہ اس کی تکنیک کیا ہے؟

﴿۷﴾ تخلیق کار نے کن فنی تدابیر Artistic-Devices کا استعمال کیا ہے۔

﴿۸﴾ تخلیق کار نے کتنا روایت سے اخذ کیا ہے اور کتنا اس سے انحراف کرنے کی کوشش کی ہے۔

﴿۹﴾ تنقید یہ دیکھتی ہے کہ کوئی تخلیق اگر اہم یا اچھی ہے تو کیوں ہے؟ اور کم تر ہے تو کیوں؟

﴿۱۰﴾ تنقید، عیب جوئی سے بھی کام لیتی ہے لیکن اس کا مقصد محض عیب جوئی تک مختص نہیں ہے۔

﴿۱۱﴾ تنقید تشریح، تحلیل، تقابل اور درجہ بندی کرتی ہے۔

﴿۱۲﴾ تنقید ادب کا ذوق پیدا کرتی اور اس کی جِلا کاری کرتی ہے۔

تنقید یہ بھی دیکھتی ہے کہ تخلیق کار ذہنی اور فکری طور پر کس ادبی یا غیر ادبی نظریے کو ترجیح دیتا ہے۔

ادب فہمی میں ذاتی پسند و ناپسند کی بھی کم اہمیت نہیں ہے۔ اس تاثر کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا جو براہِ راست مطالعے کی بنیاد پر مرتب ہوتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے فوری تاثر یا تاثرات اور بڑے غور و فکر کے بعد پیدا ہونے والے تاثرات میں بڑا فرق ہے۔ غور و فکر کے بعد جو تاثرات مرتب ہوتے ہیں، ان میں ٹھہراؤ، استقلال اور استحکام ہوتا ہے۔ اگر نقاد صاحب علم اور صاحب نظر ہے اور اسے ادب کی تاریخ اور اس کی روایات، زبان کی باریکیوں اور سماجی و تہذیبی صورتِ حال سے گہری واقفیت ہے تو اس کی اصول سازی میں یہ تمام آگاہیاں ضرور اپنا اثر دکھائیں گی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ادبیت وہ بنیادی کلید ہے جو یہ بتاتی ہے کہ ادب و غیر ادب کے درمیان مابہ الامتیاز کیا ہے۔ لیکن ادبیت محض اس جوہر کا نام ہے جو فن پارے کی روح میں رچا بسا ہوتا ہے اور جس کی کوئی ایک تعریف متعین نہیں کی جا سکتی۔

اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ادبیت کی تشکیل میں تخلیقی زبان، جمالیاتی نظم و ضبط اور تخیل کی نادرہ کاری کا سب سے اہم ہاتھ ہوتا ہے اور یہی وہ عوامل ہیں جو کسی بھی فن پارے کی نامیاتی قدر کو اُجاگر کرتے ہیں تو سوال یہ اٹھتا ہے کہ ادبیت کے باوجود اگر وہ فن پارہ حیات اور کائنات کے بارے میں کوئی اشارہ نہیں کرتا اور بہترین انسانی اقدار کے برخلاف بشریت کشی، تفرقہ پردازی اور انسان سے مایوسی جیسے رویّوں پر ترجیح رکھتا ہے تو ہمارا جواب کیا ہوگا۔ یہاں پہنچ کر ہمیں پھر اس زندگی کی طرف رجوع ہونا پڑے گا جس سے نہ صرف ادیب بلکہ نقّاد کو بھی سابقہ پڑتا ہے۔ اس صورت میں محض انفرادی ذوق یا محض ذاتی پسند و ناپسند کی بنیاد پر جو اصول بنائے جائیں گے وہ ادب فہمی ہی نہیں زندگی فہمی میں بھی ہماری بہت زیادہ مدد نہیں کر سکتے۔ اسلوب احمد انصاری نے لکھا ہے:

''زیادہ اہم کام تو تنقید کے اصولوں کا بنانا اور ان کو قاعدے کے ساتھ پیش کرنا ہے کیوں کہ اس سے ادب کو پوری طرح سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور چوں کہ ان اصولوں کی بنیاد تفکّر اور سوچ پر رکھی جاتی ہے اس لیے ادبی دنیا میں وہ کافی وزن بھی رکھتے ہیں چناں چہ کسی صورت میں بھی ان کو سائنس اور فلسفے سے کم مرتبہ نہیں سمجھا جاسکتا۔''

اس معنی میں اصول سازی ایک بے حد ذمہ دارانہ کام ہے۔ کیوں کہ ان اصولوں کی روشنی میں ادب کی تفہیم کی جاتی ہے۔ ان اصولوں کے لیے یہ لازمی ہے کہ انہیں بڑی معروضیت کے ساتھ تشکیل کیا گیا ہو۔ جب ہی دوسرے بھی انہیں جانچنے کے معیار کے طور پر اخذ کر سکتے ہیں۔ یہاں پھر یہ سوال اُٹھتا ہے کہ کیا اصولِ نقد غیر مبدّل ہوتے ہیں؟ ظاہر ہے تغیّر زندگی کی فطرت ہے، تاریخ انسانی کا مطالعہ بھی یہی بتاتا ہے کہ ہر عہد ذہنی، نفسیاتی، تہذیبی، اخلاقی اور اقتصادی تقاضوں اور مطالبوں کے اعتبار سے دوسرے عہد سے مختلف رہا ہے۔ اسی طرح ادب بھی کبھی ایک ہی جچی تلی سمت میں سفر نہیں کرتا۔

تغیّر، ادب کی بھی فطرت ہے۔ فکر و فن کے لحاظ سے ادب میں جو تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں، ان تبدیلیوں کا اثر تنقید پر بھی پڑتا ہے۔ اسی بنیاد پر ادب کو سمجھنے اور سمجھانے کے ضمن میں تنقید نگار پہلے سے بنے بنائے اور دستیاب اصولوں سے اتنی ہی مدد لیتا ہے جتنی اس کے لیے ناگزیر ہوسکتی ہے۔ اپنے عہد کے ادب کا مطالعہ کبھی اسے بنے بنائے اصولوں میں ترمیم و اضافے کے لیے مجبور کرتا ہے اور کبھی اسے نئے اصولوں کی تشکیل کرنی پڑتی ہے۔ اصولِ نقد میں رنگارنگی اور اختلاف و اتفاق کی بے شمار صورتوں کے پیچھے اس قسم کے عصری مطالبات کا سب سے بڑا دخل ہوتا ہے۔ احتشام حسین نے اصولِ نقد پر بحث کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے:

''فنِ تنقید کی بنیاد تاریخی حقائق پر رکھنے کی بات کچھ بڑی غیر ادبی معلوم ہوتی ہے لیکن اس کے سِوا چارہ بھی نہیں ہے کہ تنقید کو تاریخ کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی جائے اور اس کے اصولوں کو اس طرح مرتب کیا جائے، جس کی مدد سے زیادہ سے زیادہ انسان ادب سے لطف اندوز ہوسکیں، اس کی حقیقت کو بھی سمجھ سکیں اور اسے انسانی مفاد کے کام میں بھی لاسکیں، محض انفرادی پسندیدگی پر تنقید کی بنیاد رکھ کر اصول بنالینا غیر حکیمانہ فعل ہے۔ ایک شخص سڑک کے بیچ میں کھڑا ہوکر گالیاں بکتا ہے تو راہ گیروں میں سے بعض رُک کر اس کی گالیوں کی بھی داد دینے لگتے ہیں۔ تنقید کے ایسے انوکھے اصول بن سکتے ہیں کہ چند انسان اس کی نُدرت اور جدّت پر سر دُھنیں لیکن حقیقتاً اصول وہی ہیں جن کی داد زیادہ سے زیادہ لوگ دے سکیں، جو انسانیت کے لیے زیادہ سے زیادہ مسرّت بخش ہوں اور جو انسانوں کی ایک بڑی تعداد کے لیے ادب سے زیادہ لذّت اندوزی اور اثر پذیری کو آسان بنادیں۔''

تخلیقی ادب زندگی پر اساس رکھتا ہے اور تنقید کی بنیاد ادب پر ہوتی ہے۔ ادب محض فن نہیں ہے اور نہ ہی لفظوں کا کھیل ہے۔ ادب کو زندگی سے جوڑنے والے دوسرے علوم بھی ہیں بلکہ ادب کی ترکیب میں دوسرے علوم کے اثرات بھی شامل ہوتے ہیں۔ اسی لئے تنقید اپنے اَوزار و آلات دوسرے علوم سے بھی اخذ کرتی اور اپنے تجزیوں میں ان سے مدد لیتی ہے۔ اسی لئے ادب کا رشتہ فلسفہ، نفسیات، لسانیات،

عمرانیات سے گہرا ہے۔ یوں بھی ہمارا دَور بین العلومی کا دَور ہے۔ ادب کی معنوی کائنات کو سمجھنے اور اس کی گہرائی تک پہنچنے کے لئے ہمیں بین العلومی طریقۂ کار سے کام لینا پڑتا ہے جب ہی ادب کی تفہیم کا حق ادا ہوسکتا ہے۔

نقاد ادب کا کل وقتی قاری ہوتا ہے۔ اسے ایک صاحبِ علم قاری کہہ سکتے ہیں۔ دوسرا قاری وہ ہوتا ہے جو جز وقتی ہوتا ہے۔ ادب اس کے لئے محض وقت گزاری کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اسے محض اپنے تاثرات سے غرض ہوتی ہے۔ ان تاثرات کی چھان پھٹک اس کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ جب کہ نقّاد کا تاثر ایک صاحبِ علم کا تاثر ہوتا ہے جسے ضبطِ تحریر میں لینے سے پہلے وہ اس کی خوب چھان پھٹک کرتا ہے تب کہیں جا کر وہ کوئی فیصلہ کرتا ہے لیکن نقاد کی بھی اپنی کچھ ترجیحات ہوتی ہیں، زندگی کے بارے میں اس کا بھی کوئی نظریہ ہوتا ہے۔ جو دوسرے لفظوں میں اس کے ذہنی میلان کی دلیل بھی ہوتا ہے اور اس کا تعصب بھی۔ تنقید نگار کی کوئی بھی تحریر اس کے ذہنی تعصب سے محفوظ نہیں رہ سکتی۔ یہی چیز تنقید نگار کے طریقِ فہم کا تعین کرتی ہے اور اس کے فیصلوں پر براہِ راست اثر انداز بھی ہوتی ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ نے ''کیا تنقید داخلی تاثر کا نام ہے یا سائنس ہے'' کے عنوان کے تحت یہ واضح کیا ہے کہ نقاد، ادب کا نقاد ہوتا ہے۔ وہ ریاضی یا سائنس کے مقررہ ضابطوں کے تحت تجزیہ و تحلیل نہیں کرتا بلکہ تنقید کے عمل میں اس کے ذاتی تصوّرات کا درآنا ایک فطری عمل ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''تنقید میں نقّاد کے تعصّب کے وجود سے انکار نہیں کیا جاسکتا، کیوں کہ تنقید بالآخر اور ہر طور مصنّف کے ذاتی میلانات و تعصّبات یا اس کے تأثرات سے متاثر ہوتی ہے۔ یہ توقّع نہیں کی جاسکتی کہ تنقید کرنے والا ریاضی کے مانند ہر ادب پارے پر فارمولوں کا اطلاق کرے معیّن اور قطعی جواب دے دے اور دو+ دو= چار کے اصول پر فیصلہ صادر کردے، یا سائنس دان کی طرح علمی اور تجربی اصولوں کی روشنی میں اَدب پارے کو پرکھ کر، کچھ اس طرح کے جواب دے دے، جیسے قوانین طبعی (Natural-Laws) کی روشنی میں پانی اور ہوا کی خاصیتوں کے بارے میں جواب دیا جاسکتا ہے، یا ریڈیو کی لہروں کے بارے میں ہمارے پاس قطعی وضاحتیں موجود ہیں۔''

(اشاراتِ تنقید: ڈاکٹر سید عبداللہ، ص.۱۴)

سید عبداللہ اس مسئلے پر بحث کرنے کے بعد کہ تنقید کو سائنس یا سائنسی عمل کہا جاسکتا ہے یا نہیں، مولوی عبدالحق اور شبلی نعمانی کی مثال دیتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ: ''دونوں محض باز گوئی سے بہت آگے بڑھ کر ترجیحات اور تعصّبات کا اظہار کرتے ہیں۔ عبدالحق پرانی کتابوں کے بارے میں، دوسرے کی آرا دے کر اپنی ترجیح کا اظہار کرتے ہیں۔ شبلی تبصرہ کرتے ہی اس لئے ہیں کہ انہیں اپنی کسی ترجیحی رائے یا تعصب کا اظہار کرنا ہوتا ہے لیکن یہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جب نقّاد اپنے تصوّرات و نظریات میں سخت ہوتے ہیں تو ان کے تجزیوں میں یکسانیت سی پیدا ہوجاتی ہے۔ وہ ہر ادب پارے کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتے ہیں جس کے باعث ان کے یہاں ذہنی کشادگیاں مفقود ہوجاتی ہیں۔ ادب کا قاری بہت جلد اس قسم کی تحریروں سے اُکتانے لگتا ہے۔

کسی عہد میں کوئی نظریہ یا تھیوری (Theory) معاصر بصیرتوں کی خاص پہچان بن جاتی ہے۔ کسی دوسرے عہد میں کوئی دوسرا نظریہ اس کے وسیع تر تاثر کو مٹا دیتا ہے اور اس طرح نئے کے مقابلے پر پرانا از کار رفتہ نظر آنے لگتا ہے۔ تاریخ کبھی ایک ہی صورت میں اپنے آپ کو نہیں دہراتی بلکہ دہرانے کے عمل کے معنی ہیں بہت سی چھوٹی بڑی تبدیلیوں کے بعد کسی ایک صورت کی بحالی اور بحالی میں ہمیشہ یکساں روی کا عُنصر جلی عنوان کا حکم نہیں رکھتا بلکہ زمان و مکان کی تبدیلی یا طویل و خفیف وقفے کے بعد ہر پرانی صورت کسی نہ کسی سطح پر نئی ہی ہوتی ہے۔ نئی اس لیے کہ اس میں یقیناً بہت سے محسوس و غیر محسوس طور پر نئے عناصر بھی شامل ہو جاتے ہیں بلکہ ہوتے رہتے ہیں، کوئی تنقید کبھی حتمی یا آخری نہیں ہوتی وہ آخری ہو بھی نہیں سکتی۔ کیوں کہ اس کے سلسلۂ عمل کا راست تعلق تاریخ کے عمل سے ہے باوجود اس کے کبھی کبھی بعض ایسی تبدیلیاں بھی رونما ہوتی رہتی ہیں جن کے اسباب اکثر منکشف ہونے سے رہ جاتے ہیں۔ تنقید اسی معنی میں ایک مسلسل حرکت ہے اور جو حقائق و اوصاف نیز تخصیصات کو مناسب اسمائے صفات سے نوازتی رہتی ہے۔

04.05 تحقیق کے عمل اور تنقید کے عمل میں امتیازات کی نوعیت

جس طرح تخلیق و تنقید کے رشتے پر اکثر بحث ہوتی ہے اسی طرح تحقیق و تنقید کے باہمی رشتے کو بھی اکثر موضوعِ بحث بنایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے دونوں شعبوں کا تعلق ادب سے ہے۔ تحقیق و تنقید میں جہاں مماثلتیں ہیں وہیں دونوں کے درمیان طریقۂ کار کا فرق بھی ہے۔ جس طرح تنقید ادب پر اساس رکھتی ہے اسی طرح تحقیق کو بھی اسے رَہ نما بنانا پڑتا ہے۔

دونوں کے درمیان جو امتیازات ہیں درج ذیل جدول کے ذریعے ان کی نشان دہی کی جا سکتی ہے:

تحقیق	تنقید
تحقیق کا کام صحیح اور غلط کی نشان دہی کرنا ہے	: تنقید کھوٹے کھرے کی پہچان کراتی ہے
تحقیق کا تعلق صحتِ متن، صحتِ کتاب اور مصنف سے ہوتا ہے	: تنقید کا مقصد صحیح متن و مصنف کی تلاش نہیں ہوتا، موجود متن ہی اس کے لئے سب کچھ ہے۔
تحقیق دریافت و بازیافت کا عمل ہے	: تنقید معنیاتی، اُسلوبی، ہیئتی اور فکری تجزیے کا عمل ہے
تحقیق کا کام معلوم و نامعلوم دونوں کی جستجو سے عبارت ہے	: تنقید کا کام ادب کی قدر شناسی ہے
تحقیق مصنف کی حیات و شخصیت اور اس سے متعلق واقعات کی جستجو کرتی ہے	: تنقید مصنف کی حیات و شخصیات اور اس سے وابستہ واقعات سے ہمیشہ غرض نہیں رکھتی
تحقیق کا کام حقیقت سے متعارف کرانا ہے	: تنقید کا کام ذوق کی جِلا کاری ہے
تحقیق کے عمل میں صرف اور صرف معروضیت ہی کو بنیاد بنانا پڑتا ہے	: تنقید کے عمل میں معروضیت کے علاوہ اکثر موضوعیت Subjectivity کو بنیاد بنانا پڑتا ہے
تحقیق میں سائنٹفک اصولوں کے مطابق عمل کرنا ضروری ہے	: تنقید اتنی سائنسی نہیں ہو سکتی

تحقیق کے عمل میں ادبی و غیر ادبی نظریات یا تھیوری کی کوئی گنجائش نہیں : تنقید، کسی ادبی یا غیر ادبی نظریے یا تھیوری کو بھی بنیاد بناتی ہے جیسے مارکسی نظریہ، فرائڈی تحلیل نفسی، وجودی فکر یا جمالیاتی ورومانی تصور

تنقید کے بغیر تحقیق اپنا مشن جاری رکھ سکتی ہے۔ : تنقید کو ہمیشہ تحقیق کی ضرورت پیش آتی ہے اور آتی رہے گی

تحقیق کو یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ حقائق و واقعات کی تفتیش میں اپنا تخیل شامل کر کے حقیقت ہی کو مسخ کر دے اور قیاس و مفروضات کو یقین کا درجہ دے دے۔ : تنقید نگار اپنے تخیل کی آمیزش بھی کرتا ہے بلکہ ادب کا تخلیقی کردار کبھی کبھی اتنا سرّی ہوتا ہے کہ نقّاد کو تخیّل سے کام لینا پڑتا ہے اور اس کے باطن کا سراغ لگانا پڑتا ہے۔

انیسویں صدی کے اواخر میں جب تنقید مغربی اصولوں کے تحت لکھی جانے لگی تو تحقیق و تنقید میں چولی دامن کا ساتھ تھا۔ اس روایت کو بہت بعد میں صدمہ پہنچا۔ سید محمد عبداللہ نے یہ واضح کیا ہے کہ:

''اُردو میں ادب کے اوّلین نقّاد بیش تر وہ بزرگ تھے جو ادب کے مؤرّخ تھے۔ مولانا آزاد مؤرّخ پہلے تھے، نقاد بعد میں تھے۔ شبلی کی شعرالعجم تاریخ کی کتاب پہلے ہے، تنقیدی کتاب بعد میں ہے۔ حالی؛ مقدّمہ شعر و شاعری میں تو صرف ناقد کے روپ میں جلوہ گر ہوئے ہیں مگر حیاتِ سعدی، یادگارِ غالب اور حیاتِ جاوید میں ان کی ناقدانہ حیثیت ضمنی ہے، سوانح نگارانہ حیثیت اُصولی ہے۔ چناں چہ ان کتابوں میں امر واقعہ کی تحقیق ہی مقصود بالذات ہے۔ ان وجوہ سے کم و بیش پچاس سال تک تنقید اور تاریخ نگاری تقریباً باہم یک جان رہیں اور امرِ واقعہ کی تحقیق کا رجحان ہماری تنقید میں اس درجہ غالب رہا کہ اُردو کے پہلے نقّاد، محقّق ہی کہلائے۔ پھر اعظم گڑھ کے مصنّفین اور پروفیسر شیرانی وغیرہ نے تو ادبی مباحث سے متعلق اُمور خانہ جستجو کو اس درجہ اپنی توجہ کا مرکز و محور بنالیا کہ ہمارے ملک میں مورخانہ چھان بین ہی تحقیق کی بہترین اور مکمل ترین صورت قرار پائی۔ ان حالات میں جب جدید تنقید نے جنم لیا تو نقادوں کو یہ محسوس ہوا کہ مروّجہ تنقید سے تنقید کا عنصر تقریباً مفقود ہو گیا ہے۔ اس لئے انہوں نے سہولت کے لئے پرانے اندازِ تنقید کا نام ہی تحقیق رکھ دیا اور یوں ان کے نزدیک تحقیق و تنقید؛ دو بالکل الگ الگ شعبہ ہائے عمل قرار پائے۔''

(ارمغان: ص...۶۱ تا ۶۲)

04.06 تحقیق کے عمل اور تنقید کے عمل میں مماثلتیں

تحقیق و تنقید کے مابین جن امتیازات کی نشان دہی کی ہے ان کے برخلاف مماثلتوں کا پلہ بھاری ہے۔ ایک اعتبار سے تحقیق و تنقید ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ تحقیق سے روشنی اخذ کیے بغیر تنقید اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے کے برابر ہے۔ تحقیق کے عمل کے مساوی تنقیدی شعور کا عمل بھی جاری رہتا ہے۔ تحقیق کا تنقیدی شعور جتنا پختہ اور توانا ہوگا اتنے ہی اس کے نتائج بھی اعتبار انگیز ہوں گے۔ جب کہ بعض نقّادوں کو چھوڑ کر بیش تر نقّادانِ ادب محقّقین کے تحقیقی نتائج کے مرہون ہوتے ہیں۔ گیان چند، سید عبداللہ، وہاب اشرفی، رشید

امجد، مولانا عرشی، سحر انصاری اور خلیق انجم وغیرہ کی نظر میں تحقیق وتنقید ایک دوسرے کی تلافی پوری کرتے ہیں۔ یہ خیال ہی غلط ہے کہ دونوں میں دشمنی کا رشتہ ہے یا یہ کہ دونوں ایک دوسرے کے نقیض ہیں۔

گیان چند کا تو یہاں تک کہنا ہے کہ تحقیق کی دست گیری کے بغیر تنقید اپنے مقصد سے عہد برآ ہی نہیں ہوسکتی۔ دونوں ایک دوسرے سے بے تعلّق نہیں رہ سکتے بلکہ ایک دوسرے کی رہ نمائی کرتے اور اعانت کرتے ہیں۔ گیان چند نے لکھا ہے:

''تحقیق حق کی تلاش ہے۔ تخلیق کی نگہداشت کے لئے تنقید کی جس قدر ضرورت ہے اسی قدر تحقیق کی۔ کچھ عرصہ پہلے تنقید اور تخلیق کو ایک دوسرے سے بے نیاز اور بے تعلّق سمجھا جاتا تھا لیکن اب یہ احساس بڑھتا جارہا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی اعانت کے بغیر ہوا میں ہاتھ پاؤں مارنے کے مترادف رہ جاتی ہیں۔ تحقیق کی دست گیری کے بغیر تنقید منزل تک نہیں پہنچ سکتی۔ تنقید میں نہ صرف ادب پارے سے بحث ہوتی ہے بلکہ اس کے خالق کے سماجی ومعاشی ماحول، اس پر اثر انداز ہونے والے گوناگوں عوامل، اس کے ذہنی ارتقا کی بھی کھوج لگائی جاتی ہے۔ ان پہلوؤں کو تحقیق ہی روشن کرسکتی ہے۔ تاریخی تنقید نے نقّاد کے لئے تحقیق کی اہمیت اُجاگر کی۔ مصنّف کے ماحولی تجزیے سے قطعِ نظر بھی جب تک نقّاد تحقیق کا منت کش نہ ہو بعض اوقات فاش اغلاط کا مرتکب ہوسکتا ہے۔''

(تحریریں: ص....۷)

محقق کا مطمحِ نظر متن ہوتا ہے۔ اس کا بنیادی مقصد 'متنِ صحیح' کی تلاش ہے۔ چوں کہ بیش تر صورتوں میں اُنہی متون کی تصحیح ودریافت مطلوب ہوتی ہے جن کا تعلق ماضی قدیم سے ہے یعنی جس پر برسہا برس سے دھول کی موٹی موٹی تہیں جمتی آرہی ہیں، جو جگہ جگہ سے مسخ ہیں اوراق تتر بتر ہوگئے ہیں۔ بعض متون مختلف رسم الخط میں ہوتے ہیں جن کی قرأت اتنی آسان نہیں ہوتی۔ بعض متون کے ابتدائی اور آخری صفحات غائب ہوتے ہیں اور بعض متون الحاق سے بھرے ہوتے ہیں۔ محقّق کا بنیادی منصب صحتِ متن اور ازسرِنَو تدوینِ متن ہوتا ہے۔ گویا اس کا مقصود سچائی کی تلاش کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ وہ متون میں ان مغالطہ آمیز اجزا کی نشان دہی کرتا ہے جن کی بنیاد الحاق پر ہوتی ہے یا جو کسی وجہ سے مسخ ہوگئے ہیں یا جن کی شناخت مشکل ہے۔ محقّق مختلف نسخوں سے موازنہ کرکے اصلیت تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ اکثر قلمی نسخوں اور بہتر کاغذ کی عدم دستیابی کے باعث متون اکثر مسخ ہوجاتے ہیں۔ پتھر کی چھپائی بھی اتنی ترقی یافتہ نہیں تھی۔ اس لئے متون کی صحت و درستی کا مسئلہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر متون ہی صحیح نہیں ہیں اور نقاد اپنی تنقید کی عمارت ہی ٹیڑھی اینٹ پر رکھتا ہے تو اس کی ساری محنت ضائع ہونا یقینی ہے۔ متن تحقیق وتنقید دونوں کا اساسی مسئلہ ہے۔ اس ضمن میں وہاب اشرفی نے یہ واضح کیا ہے کہ:

''ایک غلط فہمی عام ہے کہ نقاد محقق نہیں اور محقق نقاد نہیں ہوسکتا۔ کم از کم اُردو کی حد تک اس تصور کو تقویت پہنچتی رہی ہے کہ تحقیق کے باب میں نقاد اور تنقید جگہ نہیں پاتی اور تنقید کی بحث میں محقق اور تحقیق الگ کردی جاتی ہے۔ حالاں کہ صحیح امر واقعہ تک پہنچنے میں دونوں کی اساس لازمی طور پر متن ہی ہے۔ نقّاد آخر کس چیز کا تجزیہ کرتا ہے اور محقّق کی چھان پھٹک کس شے پر مبنی ہے؟ جواب متن کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ ہاں فرق ہے

تو بس یہ ہے کہ کون کس پر کتنا زور صرف کرتا ہے۔ نقّاد ادبی تخلیق کے جائزے میں متن کی بنیاد پر اس کے اُسلوب، ہیئت اور محتویات پر روشنی ڈالتی ہے، جب کہ محقّق حقیقی فن کے تعیّن میں داخلی و خارجی شواہد کے علاوہ تعیّنِ زمانہ، انتساب، اس کی مختلف جہتوں اور صورتوں، اس سے وابستہ روایتوں وغیرہ کے مرحلے سے گزرتا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ محقق کا یہ کام دائرۂ تنقید سے خارج ہے؟ ٹھیک اسی طرح نقّاد یک سر تحقیقی اُمور سے دامن کشاں نہیں گزر سکتا۔''

ڈاکٹر جمیل جالبی نے محقّق کے چار اصول بتائے ہیں:

﴿۱﴾ موضوع سے پوری طرح واقفیت۔ ﴿۲﴾ غور و فکر کے بعد نقطۂ نظر کا تعین۔

﴿۳﴾ نقطۂ نظر کے لئے حوالوں کی جمع و ترتیب۔ ﴿۴﴾ کیا اس موضوع نے محقق کے وجود میں انہماک پیدا کر کے اظہار کی بے چینی پیدا کر دی ہے۔

ان چاروں اصولوں کی افادیت اپنی جگہ، لیکن جمیل جالبی نے تحقیق کے عمل میں جسے خاص اہمیت دینی چاہیے وہ ہے ''ناقدانہ بصیرت''، متن کے تجزیہ و تحلیل اور صحیح و غلط کے فیصلے اور تحقیقی تحریر کو نظم و ضبط رکھنے اور منصوبہ سازی میں ناقدانہ بصیرت ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ناقدانہ بصیرت بکھرے ہوئے مواد کو یکجا کرنے، انہیں سلیقہ مندی کے ساتھ ترتیب دینے اور مرحلہ بہ مرحلہ کسی نتیجے تک پہنچنے میں معاون ہوتی ہے۔ وہاب اشرفی یہ بھی کہتے ہیں کہ محقّق و نقّاد کے تلاشِ حق کے راستے مختلف ہوتے ہیں لیکن سچائی کی جستجو ایک مقصد کے طور پر دونوں میں مشترک ہوتی ہے، انہوں نے ادب کو بھی سچائی کی تلاش کا نام دیتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ:

''ادب کا بنیادی کام کیا ہے؟ جواب ہے سچائی کی تلاش۔ یہاں سچائی کا مفہوم خاصا وسیع ہے۔ تخلیقی ادب خالق کے دل کے نہاں خانے اور دماغ کی ترتیب و تزئین کی ایک دل کش صورت ہے۔ اس کے سانچے مختلف ہو سکتے ہیں، لیکن ادب کسی حال میں بھی سچائی سے اپنا رشتہ نہیں توڑ سکتا ہے، چاہے خیالات عرش سے پرے خالص رومانی کیف سے عبارت ہوں، اس لئے کہ ایسا کیف بھی اس کے ذہن و دماغ کی گونج ہوگا، جس کا علاقہ بہر طور سچائی پر محیط ہوگا۔ گویا ادیب اپنی تخلیقی سرشت میں جویائے حق ہے۔ نقّاد اس حق اور سچائی کی تشریح و توضیح نیز محاکے کے مشکل کام کو سرانجام دینے کی سعی کرتا ہے۔ ایسی تشریح و توضیح نیز محاکے میں اس کے اصول مختلف النّوع ہوتے ہیں۔ کبھی وہ سرسری طور سے ادب پارے پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈال کر اپنے تنقیدی شعور کا خود مذاق اُڑا کر سطحیت کا شکار ہوتا ہے اور کبھی وہ تشریح اور وضاحت کے لئے ہم رشتہ ادب پاروں سے کسی مخصوص فن پارے کا موازنہ اور مقابلہ کرتا ہے۔ تجزیے اور تحلیل کے جان لیوا مرحلے سے گزرتا ہے۔ اس کے سامنے روایت و جدّت کی کارکردگی آئینہ ہوتی ہے۔ ادب کا ارتقائی اور تاریخی شعور روایت کے مستحسن پہلوؤں سے اُسے آشنا رکھتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ جدّت طرازی کے محرکات اور عوامل کی تفہیم کی سعیِ پیہم میں مصروف ہوتا ہے۔ اس طرح نقّاد جو واقعتاً نقاد کہے جانے کا مستحق ہے، ہر حال میں سچائی کی تلاش میں

سرگرداں ہوتا ہے۔اس حدتک کہ وہ کسی فن پارۂ تحلیل سے فن کار کے ذہن ودماغ میں اُتر جاتا ہے۔تب ہی وہ متعلقہ تخلیقی کاوش کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ کرتا ہے۔اگر نقّاد کا کام حق اور سچائی کی جستجو ہے تو یہی کام محقّق کا بھی ہے۔تحقیق حقیقی صورت واقعہ تک رسائی کا نام ہے۔نقّاد اور محقّق کی تلاشِ حق کے راستے عمومی طور پر ایک جیسے نہیں ہیں، پھر بھی سچائی کی جستجو دونوں ہی کے لئے شغلِ مشترک ہے۔''

متن کی طرف تحقیقی عدمِ توجّہی کے باعث ہمارے نقّادوں سے کس کس قسم کی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں، ان میں سے کچھ مثالیں درج ہیں۔ان کی روشنی میں ہم سمجھ سکتے ہیں کہ ایک طرف نقّاد کی محنت ضائع ہوئی دوسرے وہ قاری گمراہ ہوئے جنہوں نے انہیں اسی طور پر اپنی معلومات کا حصّہ بنایا ہوگا۔یہ مثالیں گیان چند، وہاب اشرفی، سید عبداللہ وغیرہ سے اخذ کی گئی ہیں:

﴿۱﴾ ''لکھنؤ کا دبستانِ شاعری (طبع اوّل) میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے مثنوی 'لذّتِ عشق' کو نواب مرزا شوق کی تصنیف سمجھ کر اسے بیگماتی زبان کا بہترین نمونہ قرار دیا۔حالاں کہ نہ یہ شوق کی تصنیف ہے نہ زبان کے اعتبار سے درخورِ اعتنا ہے۔'' (گیان چند)

﴿۲﴾ سید وقار عظیم نے ''باغ و بہار'' کے تبلیغی اجزا سے میر امّن کی مذہبی ذہنیت پر استدلال کیا اور انہیں عام قارئین سے ستائش طلبی کا مرتکب قرار دیا لیکن جب یہ دیکھا جائے کہ یہ سب اجزا ''باغ و بہار'' کے ماخذ ''نوطرزِ مرصع'' میں بھی موجود ہیں تو میر امّن کی نفسیات کی جو تعمیر کی گئی تھی وہ معدوم ہوجاتی ہے۔'' (گیان چند)

﴿۳﴾ قصّہ چہار درویش کو عمومی طور پر امیر خسرو سے منسوب کیا جاتا تھا۔حافظ شیرانی نے اسے ضیاء الدین خسرو کی تصنیف ثابت کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ:

''باوجودیکہ اس قصّہ کے ایک سے زیادہ متن ہیں۔لیکن ان میں سے کسی ایک کی زبان بھی ایسی نہیں جسے امیر خسرو یا ان کے عہد کی زبان کہا جاسکے۔امیر خسرو کی نثر کے نمونے کافی سے زیادہ ہمارے پاس موجود ہیں جن کی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ حضرت امیر خسرو صنائع و بدائع، دقت پسندی اور پیرایۂ کلام کو پیچ دے کر دشوار فہم بنانے کے عادی تھے۔لیکن یہ نسخہ نہایت سادہ و سلیس اور خوش مذاقی کی حدتک مقفّیٰ اور رنگین عبارت میں مرقوم ہے اس کی املا و انشا و پیرایۂ بیان بالکل اُسی اُسلوب میں ہے جو ہمارے ہاں گزشتہ اور اس سے قبل کی صدی میں رائج تھا۔''

(متنی تنقید: خلیق انجم، ص...۱۳۷)

﴿۴﴾ ڈاکٹر جمیل جالبی نے پروفیسر احتشام کے ایک تسامح کی نشان دہی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''پروفیسر احتشام حسین اُردو کے اہم نقّاد ہیں۔لیکن ان کا رشتہ چوں کہ تحقیق سے قائم نہیں تھا، اس لئے ان کی تحریروں میں بہت سی بنیادی باتیں غلط مفروضات پر کھڑی نظر آتی ہیں۔احتشام حسین صاحب کا ایک مضمون ''غالبؔ کا تفکّر اور اس کا پس منظر ہے'' جس میں غالبؔ کے وسعتِ مطالعہ اور تاریخ سے گہری واقفیت کو غالبؔ کے تفکّر کی بنیاد بتایا ہے۔انہوں نے غالبؔ کے اس فارسی ترجمے کو جو ''مہر نیم روز'' کے نام

سے مشہور ہے، ان کے وسعتِ مطالعہ اور تاریخ دانی کے ثبوت میں پیش کیا ہے۔ اگر وہ یہ بات کہنے سے پہلے اسے تحقیق کی کسوٹی پر پرکھ (کذا) لیتے تو شاید انہیں اپنے مضمون کا بڑا حصّہ خود بے معنی معلوم ہوتا۔ یہ واضح رہے کہ غالبؔ کو تاریخ سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ ''مہر نیم روز'' غالبؔ کی تصنیف نہیں بلکہ ترجمہ ہے جو بادشاہِ وقت کے اصرار پر انہوں نے کیا تھا۔ غالبؔ نے اپنے ایک خط میں ''مہر نیم روز'' کے بارے میں خود لکھا ہے کہ:

''مجھ سے انتخاباتِ حالات ممکن نہیں۔ آپ مدعا کتب سیر سے نکال کر زبان اُردو میں میرے پاس بھیج دیا کیجیے۔ میں اسے فارسی میں کر کے تم کو دے دیا کروں گا۔ انہوں نے ابتدائے آفرینش عالم وظہور سے میرے پاس اُردو مسودہ بھیجا۔''

(نادراتِ غالب، ص...۳۴)

اس سلسلے میں ایک اور جگہ لکھا ہے کہ:

''کارپردازان دفتر شاہی خلاصہ حالات اُردوئے کتب اُردو میں لکھ کر بھیج دیتے ہیں۔ میں اس کو فارسی کر کے حوالے کرتا ہوں، میرے ہاں ایک کتاب بھی نہیں ہے۔ میں اس فن سے اتنا بے خبر ہوں کہ یہ بھی اچھی طرح نہیں سمجھا کہ پنڈت صاحب نے کیا کچھ لیا ہے اور وہ کیا ہے۔'' (نادراتِ غالب، ص.۲۹)

اب دیکھئے کہ غالبؔ کے تفکّر کی بنیاد جس تاریخ دانی پر قائم ہے وہ کتنی کمزور اور بے معنی ہے اور ظاہر ہے کہ اس سے جو نتائج اخذ کیے گئے ہیں وہ کتنے بے بنیاد اور غیر ذمہ دارانہ ہوں گے۔ غالب کیا کہہ رہے ہیں اور ہمارے محترم پروفیسر صاحب کیا کہہ رہے ہیں؟'' (پاکستانی ادب، تنقید، ص...۱۴۴)

(تحقیق وتدوین سمت ورفتار: ڈاکٹر محمد موصوف احمد، ص۲۹۰ تا۲۹۱)

اُردو کے قدیم نسخوں میں الحاقی کلام کا مسئلہ خاصا اہم ہے۔ اکثر نسخوں میں دانستہ یا غیر دانستہ دوسرے شعرا کا شامل ہے۔ نسیم احمد نے لکھا ہے کہ:

''اس قسم کا اشتباہ یا اختلاط عموماً شاعر کے نام یا تخلص کی مطابقت، ردیف وقافیے کے اشتراک، مضامین کی مماثلت، کاتب کی بے توجہی اور لاعلمی کی بنا پر وقوع پذیر ہوتا ہے۔ بعض اوقات اہل مطابع نے بھی تجارتی فائدے کے پیش نظر کمتر درجے کے شاعروں کا کلام مشاہیر کے نام یا نومشقوں کے اشعار اساتذۂ فن کے کلام کے ساتھ شائع کر کے تدوینی اُلجھنوں میں اضافہ کیا ہے۔ شعرائے اُردو کے دواوین میں ایک دوسرے کے کلام کا خلط ملط ہو جانا عام بات ہے۔ لیکن سوداؔ کے کلیات میں ان کے معاصرین اور شاگردوں کا کلام جس کثرت سے شامل ہوا ہے اس کی مثال اُردو شاعری کی تاریخ میں کہیں اور نہیں ملتی۔ صرف سوزؔ کی ایک

سوچھتیس ۱۳۶ غزلیں مع ایک مطلع اور مقطع کے کلیات سوداؔ کے مطبوعہ نسخوں کے علاوہ بعض قلمی نسخوں میں بھی شامل ہوگئی ہیں۔''

سوداؔ کی ''کلیات'' میں سب سے زیادہ الحاقی صورتیں پائی گئیں۔اس ذیل میں ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے لکھا ہے:

''قائم کی بعض مثنویاں اور اشعار جو سوداؔ کے مطبوعہ کلیات میں شامل ہوگئے ان کی نشان دہی اس طور پر کی جاسکتی ہے: مثنوی در شدّتِ سرما، جس کا مطلع ہے

اب کے سردی پڑے ہے اتنی شدید صبح نکلے ہے کانپتا خورشید

یہ مثنوی سوداؔ کی نہیں، قائم کی ہے۔اس کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ یہ کلیات قائم کے قدیم قلمی نسخے میں موجود ہے، علاوہ بریں میر حسن اور قدرت اللہ شوق نے جو سوداؔ کے ہم عہد تذکرہ نگار ہیں اسے قائم ہی سے منسوب کیا ہے۔طرفہ تر یہ کہ یہ سوداؔ کے ان قلمی نسخوں میں بھی موجود نہیں ہے جو ان کی زندگی میں ترتیب دیے گئے۔ہاں، مطبوعہ کلیات میں یہ باختلاف روایت موجود ہے۔

یہی صورت مثنوی ''طفل پتنگ باز'' کی ہے جس کا مصرع اوّل ہے:

ایک لونڈا اپتنگ کا ہے کھلاڑ

یہ بھی سوداؔ کے قلمی نسخوں میں موجود نہیں۔شوقؔ نے اپنے تذکرے میں اسے بھی قائمؔ سے منسوب کیا ہے اور اس کے چوبیس شعر پیش کیے ہیں اس کے علاوہ گیارہ شعر کی ایک حکایت بطرزِ مثنوی جس کا پہلا مصرع یہ ہے:

سنا ہے کہ اک مرد اہل غرض

اور تیس شعروں پر مشتمل ایک اور حکایت جو اس شعر سے شروع ہوئی ہے:

سلف کے زمانے کا تاریخ داں یہ لکھتا ہے احوالِ وارفتگاں

اور سولہ شعر کی ایک اور حکایت جس کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے:

سنا ہے کہ اک مرد آزادہ طَور جز اپنے نہ رکھتا تھا اسباب اور

نیز وہ حکایت جو اس شعر سے شروع ہوتی ہے:

سنا جائے ہے اک مہوس کا حال کہ رکھتا تھا نت کیمیا کا خیال

وغیرہ۔یہ سب حکایتیں سوداؔ کی نہیں قائمؔ کی ہیں اور ان کے دیوان کے قلمی نسخوں میں موجود ہیں۔ان کے ماسوا تین سو اُنسٹھ شعر کی ایک طویل مثنوی حکایت مردِ درویش کمیاب بھی جو سوداؔ کے مطبوعہ کلیات میں موجود ہے اور قلمی نسخوں کے اَوراق جس سے خالی ہیں، قائم ہی کی ہے۔''

(اُصولِ تحقیق و ترتیب متن، ص...۱۰۷تا۱۰۹)

مظفر علی سیّد نے تحقیق وتنقید کے رشتے کو فعّال بنانے اور اس کی افادیت واہمیت کو سمجھنے پر زور دیتے ہوئے چند نکات پر زور دیا ہے۔ ان کا حوالہ پروفیسر رشید امجد نے اپنے مضمون تحقیق اور تنقید کا باہمی رشتہ میں بھی دیا۔ درج بالا گفتگو اور بحث کا اسے نچوڑ کہا جاسکتا ہے:

﴿۱﴾ علوم وفنون کی دنیا میں خود احتسابی کا عمل جاری رہنا چاہیے۔ لیکن جب یہ عمل طوائف الملوکی کا نقشہ پیش کرنے لگے تو علمی وادبی مشاغل کا تہذیبی کردار فراموش ہو کر رہ جاتا ہے۔

﴿۲﴾ تحقیق اور تنقید کا تقابل اور ان کے روابط کا تعیّن کسی مشترک حوالہ سے ہی ممکن ہے۔

﴿۳﴾ اب ہماری تحقیق میں تدوینِ متن کو اور اہمیت مل رہی ہے جو اسے روزِ اوّل سے ملی ہوتی تو آج تحقیق ہی نہیں، زبان شناسی، لغت نگاری، تاریخِ ادب اور نقدِ ادب کی صورتِ حال خاصی بہتر ہوتی۔

﴿۴﴾ تنقید کسی بھی قسم کی ہو، متن سے بہت دُور نکل جائے تو تنقید نہیں رہتی۔

﴿۵﴾ تحقیق وتنقید کا رابطہ محض اتنا نہیں کہ تحقیق، تنقید کے لئے مسالہ فراہم کرتی ہے۔ یہ تو خادم ومخدوم کا رشتہ ہے۔

﴿۶﴾ ہر محقّق میں ایک جزوی نقّاد اور ہر نقّاد میں ایک جزوی محقّق کا وجود لازم ہے۔

﴿۷﴾ ایک مشترکہ تہذیبی ہدف کو سامنے رکھ کر تنقید وتحقیق میں ایک تعاون کی گنجائش پیدا ہونا چاہیے۔

04.07 خلاصہ

تحقیق وتنقید کے درمیان بعض امتیازات ضرور ہیں لیکن امتیازات سے زیادہ مماثلتیں ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تنقید اور تحقیق میں ایک دوسرے سے دشمنی کا رشتہ نہیں ہے اور نہ یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں بلکہ ایک دوسرے کی کمی پوری کرتے ہیں۔ تحقیق کا مسئلہ بھی متن ہے اور تنقید کا مسئلہ بھی متن ہوتا ہے لیکن تحقیق نے جس متن کو صحیح ثابت کر دیا ہے، نقّاد کو اسی متن کو اپنی تنقید کی بنیاد بنانا چاہیے۔ جب متن ہی صحیح نہیں ہوگا اور اس کے مصنف کا صحیح علم نہیں ہوگا تو تنقید بھی صحیح نہیں ہوگی۔ اسی طرح محقّق کو تدوین وتحقیق کے کام کو منصوبہ بند طریقے سے پیش کرنا پڑتا ہے۔ اگر اس میں ناقدانہ بصیرت ہے تو وہ اپنے بکھرے ہوئے تحقیقی مواد کو سلیقے کے ساتھ مرتب کر سکتا ہے۔ ناقدانہ فہم اور ناقدانہ بصیرت سے اگر وہ بہرہ وَر ہے تو اس کی تحقیق میں ایک ایسی نظم وضبط کی صورت بھی پیدا ہوگی جو اس مواد کو شیرازہ بند رکھے گی۔ تحقیق میں آرائشی اور تخیّل آمیز زبان سے پرہیز کرنا چاہیے۔ علمی اور تنقیدی زبان ہی تحقیق کے لئے سب سے مناسب اور مفید مطلب ہے۔

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی ''تحقیق وتنقید'' کے باہمی تعلق پر تفصیلی بحث کے بعد خلاصے کے طور پر اس نتیجے تک پہنچتے ہیں۔

> ''ہمیں یہ حقیقت بھی نہ بھولنا چاہیے کہ تحقیق معمولی کاوش کا نام نہیں ہے۔ اس کے لیے ہم کو اپنے تئیں پورے طور پر وقف کر دینا ہوگا اور یہ یاد رکھنا ہوگا کہ تحقیق تقلید کی ضد ہے اس لیے کہ تقلید ذہن کی وسعت اور نظر کی آزادی پر ایک پردہ ہے۔ جب تک اس پردہ کو چاک نہیں کیا جائے گا اس وقت تک تحقیق کی روح تک پہنچنا ممکن نہیں۔ بعض لوگوں نے غلط فہمی کی بنا پر یہ سمجھ لیا ہے کہ اگر محض چھان بین سے چند واقعات یکجا کر دیں تو تحقیق کا فرض انجام پا جائے گا لیکن ہم کو یہ نہ بھولنا چاہیے کہ ایک اچھے محقّق کے لیے ناقدانہ نظر کی بے حد ضرورت ہے۔''

04.08 فرہنگ

اغلاط	:	غلط کی جمع، کوتاہی	جَدول	:	ٹیبل
بین العلومی	:	دو یا دو سے زیادہ علوم کی سطح پر	جِلا کاری	:	چمکانا
تحلیل	:	تجزیہ	خیرہ کُن	:	حیرت میں ڈالنے والا/ والی
تسامحات	:	تسامح کی جمع، غلطی	لسانیات	:	زبان کا علم
تشہیر	:	شہرت	متون	:	متن کی جمع، تحریر
تصحیح	:	درستی، صحیح کرنا	مماثلتیں	:	مماثلت کی جمع، یکسانیت، ایک جیسا پن
تعیّن	:	مقرّر	موازنہ	:	تقابل، مقابلہ
تلفیظ	:	زبان و بیان	ودیعت کردہ	:	بخشی ہوئی

04.09 سوالات

مختصر سوالات

سوال نمبر۱ : تنقید کی تعریف کیجیے۔

سوال نمبر۲ : تحقیق کی تعریف کیجیے۔

سوال نمبر۳ : تحقیق کیوں ضروری ہے؟

سوال نمبر۴ : کیا تحقیق و تنقید میں دشمنی کا رشتہ ہے؟

تفصیلی سوالات

سوال نمبر۱ : تحقیق میں متن کی کیا اہمیت ہے؟

سوال نمبر۲ : تنقید کے معنی اور مفہوم پر بحث کیجیے۔

سوال نمبر۳ : تحقیق و تنقید میں مماثلتوں کی نوعیت پر بحث کیجیے۔

سوال نمبر۴ : تحقیق اور تنقید کے مابین امتیازات پر روشنی ڈالیے۔

معروضی سوالات

سوال نمبر۱ : الفریڈ نارتھ وہائٹ ہیڈ کا کیا کہنا ہے؟

(الف) ہر صداقت مکمل صداقت ہے (ب) تمام صداقتیں آدھی صداقت ہیں (ج) جھوٹ ایک اضافی قدر ہے (د) کل کی دریافت کبھی غلط ثابت نہیں ہوسکتی

سوال نمبر۲ : ''قصہ چہار درویش'' کا اصل مصنف کون ہے؟

(الف) میر امّن (ب) عطا حسین خاں (ج) ضیاء الدین خسرو (د) امیر خسرو

سوال نمبر۳ : تحقیق وتنقید میں کسے بنیادی اہمیت حاصل ہے؟

(الف) مصنف (ب) متن (ج) عہد (د) املا

سوال نمبر۴ : اس مقبولِ عام روایت کو کس نے مسترد کیا کہ غالبؔ نے فارسی کلام میں صرف غالبؔ تخلص استعمال کیا ہے۔

(الف) امتیاز علی عرشی (ب) قاضی عبدالودود (ج) ابومحمد سحر (د) مالک رام

معروضی سوالات کے جوابات

جواب نمبر۱ : (ب) تمام صداقتیں آدھی صداقت ہیں جواب نمبر۳ : (ب) متن

جواب نمبر۲ : (ج) ضیاءالدین خسرو جواب نمبر۴ : (ج) ابومحمد سحر

04.10 حوالہ جاتی کتب

۱۔	متنی تنقید	از	خلیق انجم
۲۔	اصولِ تحقیق وترتیب متن	از	تنویر احمد علوی
۳۔	تحریریں	از	گیان چند
۴۔	تحقیق کے طریقۂ کار	از	ش.اختر
۵۔	باغ وبہار	مرتبہ	رشید حسن خاں
۶۔	تنقید کی جمالیات (جلد اوّل)	از	مرتبہ: عتیق اللہ
۷۔	اشاراتِ تنقید	از	سید محمد عبداللہ

اکائی 05 : اُردو کے اہم محقّقین

ساخت :

05.01 : اغراض ومقاصد

05.02 : تمہید

05.03 : اُردو کے اہم محقّقین

05.04 : خلاصہ

05.05 : فرہنگ

05.06 : سوالات

05.07 : حوالہ جاتی کتب

05.01 اغراض ومقاصد

اس اکائی کے مطالعے سے طلبا تحقیق کے اصول وفن، طریقۂ کار، اہمیت اور ضرورت کے ساتھ ساتھ اُردو کے سبھی اہم محققین کی تحقیقی کاوشوں، خدمات، طریقۂ تحقیق اور ان کے مقام ومرتبے سے متعلق ضروری واقفیت حاصل کرسکیں گے اور بخوبی اندازہ لگاسکیں گے کہ اُردو ادب میں تحقیق اور اس کے معیار ومزاج نیز پہلوؤں کی نوعیت کیا ہے؟ وہ کون سے ادیب یا محققین ہیں جنھوں نے اپنی بے مثال تحقیقی کاوشوں سے اُردو تحقیق کو ایسا وقار واعتبار عطا کیا ہے جس پر عمل پیرا ہوکر یا جن کی تقلید کرکے نئی نسل کے ریسرچ اسکالرس اور محقّقین اپنی تحقیق کو معیاری بناسکیں گے۔

05.02 تمہید

زبان وادب کے فروغ کے ساتھ شعرا واُدبا کی حیات، ادبی خدمات سے صحیح واقفیت حاصل کرنے اور ادبی فن پاروں کا تحقیقی تجزیہ کرکے ان کا معیار متعیّن کرنے اور فنکاروں کے مقام ومرتبے کا صحیح تعین کرنے میں تنقید کی طرح تحقیق بھی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ تحقیق و تنقید کا تعلّق بہت گہرا اور قریبی ہے۔ دونوں ہی ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم کی حیثیت رکھتی ہیں۔

تحقیق کے لغوی معنی کسی شئے کی حقیقت کا اظہار ہے۔ تحقیق کا مقصد حقائق کی بازیافت یا حقیقت کو دریافت کرنے کی کوشش ہے۔ تحقیقی طریقۂ عمل میں فنکار کے سوانحی کوائف اور ماحول اور طرزِ فکر وعمل کے علاوہ فن پارے کی نوعیت، اہمیت، ماخذ، موضوع، سببِ تصنیف، سالِ تصنیف، عوامل ومحرکات، علمی، ادبی، سماجی پس منظر، نیز اسالیب کا تحقیقی جائزہ لے کر نتائج اخذ کرکے صحیح رائے قائم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تحقیق کی ضرورت اور اہمیت ہر عہد میں محسوس کی جاتی رہی ہے لیکن موجودہ سائنسی اور بین العلومی عہد میں اس کی اہمیت اور ضرورت میں مزید اضافہ ہوگیا ہے۔ جامعات میں حصولِ سند کے لیے بھی تحقیق کی جاتی ہے اور نجی شوق اور احتیاج کے طور پر بھی تحقیقی سرگرمیوں کا سلسلہ جاری ہے۔

تحقیق ایک صبر آزما، ذمے دارانہ علمی فریضہ ہے جو محقّق کے وسیع المطالعہ ہونے کے ساتھ ساتھ اس سے باریک بینی، عرق ریزی، محنت وریاضت، حقیقت پسندی، غیر جانب داری، منصفانہ طریقِ رسائی، احساسِ توازن، منطقی استدلال، سائنسی عقل پسندی، اعتدال پسندی کا مطالبہ کرتی ہے۔ تحقیق میں حرفِ آخر کا گزر نہیں۔ یہ ایک ایسا مسلسل عملِ جاریہ ہے جس میں ہر آن نئی بات، نئی معلومات محقّق کے سامنے آتی رہتی ہے۔ تحقیق کا اصل مقصد حقائق کی بازیافت ہے۔ محقق کو اپنے مہیا کردہ مواد اور استخراج کردہ نتائج کی بنیاد پر فیصلے لینا پڑتے ہیں۔ تلاش وتفحص اور تحقیق انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔

''ضرورت ایجاد کی ماں ہے'' کا مصداق انسان فطرتاً تحقیق پسند واقع ہوا ہے۔ اشرف المخلوقات اور عقل وشعور وفکر کا حامل ہونے کے سبب انسان میں مشاہدے (Observation)، تجربے (Experience)، تجزیے (Analysis)، موازنے (Comparison) اور تجسّس (Curiosity) کی صلاحیتیں ابتدا ہی سے موجود رہی ہیں اور نجی اُمور سے لے کر علمی، ادبی نیز دیگر علوم وفنون میں تحقیقی صلاحیتوں کے ذریعے اس نے نہ صرف نئے جہانوں کی سیر کی ہے بلکہ اختراع وایجاد وترقی کی منازل طے کر کے آنے والی نسلوں کی رَہ نمائی بھی کی ہے اور اسے نئے حقائق، نئے براہین، نئے زاویہ ہائے نظر، نئی حکمتِ عملی، نئی فکر، نئی جہتوں سے باخبر کر کے غور وخوض نیز مزید تحقیق وتفتیش پر آمادہ کیا ہے۔

محقّق کے لیے ضروری نہیں ہے کہ وہ کسی اچھوتے یا نئے موضوع پر تحقیق کرے، پرانے موضوعات پر نئی معلومات کا اضافہ یا پرانی معلومات کی اصلاح کا عمل بھی تحقیق کے دائرہ کار میں شامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک محقّق کا کام جہاں ختم ہو جاتا ہے وہیں سے نئے محقّق کی ذمے داری شروع ہو جاتی ہے۔ تحقیق میں حرفِ آخر کو دخل نہیں یہ مسلسل جاری رہنے والا عمل ہے۔ حق وناحق کے درمیان فرق قائم کرنا ہی تحقیق کا اصل مقصد ہے۔ تحقیق کے ذریعے انسان کے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ واقعات کی بازیافت، ناقدانہ عمل اور مکمل تحقیقی بصیرت اعلیٰ تحقیق کے رَہ نما اصول ہیں۔ ان کے علاوہ تشکیک بھی ضروری ہے۔

اُردو تحقیق کا نقطۂ آغاز تذکرہ نگاری سے ہوتا ہے لیکن اس کی باقاعدہ ابتدا ہماری دیگر جدید اصناف ادب کی طرح سرسیّد احمد خاں اور ان کے رفقا کے عہد اور کاوشوں سے ہوتی ہے۔ سرسیّد احمد خاں، علامہ شبلی نعمانی، محمد حسین آزاد، امداد امام اثر اور مولوی عبدالحق کی تحقیقی کاوشوں سے اُردو ادب میں باقاعدہ طور پر تحقیق کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا اسے علامہ سید سلیمان ندوی، حافظ محمود شیرانی، وحیدالدین سلیم، غلام رسول مہر، مسعود حسن رضوی ادیب، ڈاکٹر اعجاز حسین، نصیرالدین ہاشمی، محی الدین قادری زور، قاضی عبدالوَدود، گیان چند جین، مالک رام، مولانا امتیاز علی خاں عرشی، ڈاکٹر سید عبداللہ، ابواللیث صدیقی، نورالحسن ہاشمی، صباح الدین عبدالرحمٰن، نجیب اشرف ندوی، خواجہ احمد فاروقی، مسعود حسین خاں، عبدالستار صدیقی، مشفق خواجہ، کالی داس گپتا رضا، عبدالقوی دسنوی، عبدالستار دُلوی، گوپی چند نارنگ، رشید حسن خاں، حنیف نقوی، خلیق انجم، شیام لال کالرا، عابد رضا بیدار، مرزا خلیل احمد بیگ وغیرہ نے اپنی ژرف نگاہی، عرق ریزی اور کاوشِ فکر ونظر سے تحقیق کی روایت کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

مذکورہ محقّقین نے تحقیق وتدوین کی مبادیات، اصول ومسائل پر ہی اظہارِ خیال نہیں کیا بلکہ اپنی عملی تحقیق سے غیر جانب داری، حقیقت پسندی، اعتدال پسندی، احتیاط پسندی اور مضبوط دلیلوں سے اُردو تحقیق کو وقار اور اعلیٰ معیار عطا کیا ہے۔

05.03 اُردو کے اہم محقّقین

اس اکائی کی تمہید کے آخری حصّے میں اُردو کے تمام قابلِ ذکر محقّقین کے نام تحریر کیے گئے ہیں۔ یہ موضوع بجائے خود کتاب کا متقاضی ہے لہٰذا اس اکائی میں اُردو کے اہم ترین صرف ان ہی محققین کا مختصر تعارف اور ان کی تحقیقی خدمات کا جائزہ پیش کیا جائے گا جنھوں نے تمام عمر تحقیق کی خارزار راہوں میں صرف کر کے اہم تحقیقی کام انجام دیے اور جن کی بنیادی پہچان محقّق کے بطور ہوتی ہے۔ اُردو کے بیشتر وہ ابتدائی محقّقین تذکرہ نگار یا لسانی اور تاریخی محقّقین کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ انہیں باقاعدہ ادبی محقّق قرار نہیں دیا جاسکتا ہے۔ ایسے ابتدائی محقّقین میں گارساں دتاسی، گل کرسٹ، انشا اللہ خاں انشاؔء، سرسید احمد خاں، مولانا محمد حسین آزادؔ، علامہ شبلی نعمانی، الطاف حسین حالیؔ، امداد امام اثرؔ، علامہ سید سلیمان ندوی، عبدالستار صدیقی، نورالحسن ہاشمی، ابواللیث صدیقی، نصیرالدین ہاشمی، مسعود حسین خاں، محی الدین قادری زور وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ اُردو کے باقاعدہ اہم ادبی محقّقین میں حافظ محمود شیرانی، مولوی عبدالحق، قاضی عبدالودود، مسعود حسن رضوی ادیبؔ، امتیاز علی خاں عرشیؔ، مالک رام، گیان چند جین، مشفق خواجہ، عبدالقوی دسنوی، رشید حسن خاں، حنیف نقوی وغیرہ کے نام بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔

﴿۱﴾ بابائے اُردو مولوی عبدالحق ۱۸۷۰ء..۱۹۶۱ء

مولوی عبدالحق کا شمار اُردو تحقیق کے معمارِ اوّل کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ انہوں نے بے شمار مقدمے، دیباچے، تبصرے، مکاتیب، ادبی انتخابات، لغت و قواعد، اداریے، خاکے، خطبات اور تحقیقی، تنقیدی مضامین تحریر کیے لیکن ان کا اصل طبعی میلان، ادبی میدان تحقیق کی جانب رہا ہے اور ان کی ادبی پہچان محقّق کی ہے۔ انہوں نے کئی قدیم ادبی موضوعات پر دادِ تحقیق دے کر اُردو زبان و ادب میں وسعت و وقار پیدا کیا ہے۔ قدیم اُردو ادبی سرمایہ خصوصاً دکنی ادب کا اہم حصّہ انہیں کی تحقیقی کوششوں کے سبب منظرِ عام پر آیا۔ ریاستِ حیدرآباد میں طویل مدّتی قیام کے دَوران انہوں نے کئی وقیع فن پاروں سے نئی نسل کو متعارف کرایا۔

مولوی عبدالحق نے دکن کے علاوہ شمالی ہند کی جن کتابوں کو مرتب کر کے ادبی حلقوں میں متعارف کرایا ہے ان میں میر امّن کی باغ و بہار، رانی کیتکی کی کہانی، ذکرِ میرؔ اور اُردو کے شعرا کے قدیم تذکروں میں چمنستانِ شعرا، مخزنِ نکات، ریختہ گویاں، مخزنِ شعرا، تذکرہ ہندی، تذکرہ فارسی گویاں، تذکرہ ہندی گویاں، نکات الشعرا، تذکرہ گل عجائب وغیرہ کے علاوہ قواعدِ اُردو، دریائے لطافت، انتخابِ کلامِ میرؔ، مثنوی خواب و خیال، اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا حصّہ، مرحوم دہلی کالج، دیوانِ تاباںؔ، انتخابِ داغؔ، اُردو زبان میں علمی اصطلاحات اور قدیم اُردو سب رَس وغیرہ کے مصنّفین، مآخذ و متن کا تحقیقی تجزیہ کر کے ادبی حلقوں میں متعارف کرایا اور ایک اہم لغت مرتب کی۔

مولوی عبدالحق کا شمار اُردو کے ان ابتدائی محقّقین میں ہوتا ہے جنھوں نے اُردو زبان و ادب سے متعلق مختلف نایاب و اہم موضوعات، کمیاب مسودات اور کتب کو تلاش کر کے ان کا فنی اور متنی تحقیقی تنقیدی تجزیے کر کے نئے نئے موضوعات پر تحقیقی مضامین تحریر کر کے شعرا کے دوّاوین مرتب کر کے تالیفات، مقدمات اور خطبات کے ذریعے اُردو تحقیق کا باقاعدہ آغاز کیا بلکہ اُردو ادب میں قابلِ قدر اضافے بھی کیے ہیں۔ مولوی عبدالحق نے محض ترتیبِ متن، تصحیحِ متن سے متعلّق تحقیقی کام ہی انجام نہیں دیا ہے بلکہ تحقیقی مقدمات لکھ کر نئی ادبی اور لسانی مباحث کا بھی آغاز کیا ہے۔

انہوں نے انجمن ترقی اُردو کی جانب سے تحقیقی رسالہ ''اُردو'' بھی جاری کیا جو کہ ایک تحقیقی جریدہ تھا، جس میں اہم تحقیقی موضوعات پر مضامین و مقالات شائع کیے جاتے تھے۔ بابائے اُردو نے نئی نسل کو اُردو تحقیق کی جانب متوجہ کرنے، ان میں تحقیقی ذوق وشوق پیدا کرنے، ان کی علمی، لسانی اور ذہنی تربیت کرنے میں جو تاریخ ساز کردار ادا کیا ہے اس کے لحاظ سے انہیں اُردو تحقیق کا اہم اور اوّلین محقّق قرار دیا جانا غلط نہ ہوگا۔ عبدالحق کا ایک کارنامہ اُردو انگلش ڈکشنری کی اشاعت بھی ہے۔

﴿۲﴾ حافظ محمود شیرانی:

اُردو تحقیق میں بابائے اُردو مولوی عبدالحق کے بعد دوسرا بڑا نام حافظ محمود شیرانی کا ہے جو کہ دبستانِ لاہور سے تعلق رکھتے تھے۔ شیرانی صاحب تحقیق وتنقید میں سخت اصولوں کو ملحوظ رکھتے تھے۔ وہ ''دو اور دو چار'' کے قائل تھے۔ وہ تحقیقی کاموں میں غفلت یا عدمِ احتیاط کو روَا نہیں رکھتے تھے۔ حقائق کے اظہار میں صاف گوئی، بے باکی اور جرأت مندی ان کا وصفِ خاص تھا۔ انہوں نے شبلی، آزاد، سید سلیمان ندوی وغیرہ کی تصانیف پر بغیر کسی لاگ لپیٹ کے اپنی تحقیقی آرا کا اظہار کیا ہے۔ شیرانی جیسے محقّقین کے سخت تحقیقی رویّے کے سبب اُردو تحقیق کا معیار ابتدا ہی سے بلند اور معتبر رہا ہے۔ بقول مالک رام:

> ''اُردو میں واقعی وسیع پیمانے پر تحقیقی کام مغربی بلکہ زیادہ صحیح طور پر انگریزی تعلیم کی دین ہے..... محمود شیرانی اور محمد شفیع کو بجا طور پر اس میدان میں ایک طرح سے اوّلیت کا فخر حاصل ہے۔ ان اصحاب کی دیکھا دیکھی دوسرے لوگوں میں بھی تحقیق کا شوق پیدا ہوا''۔

رشید حسن خاں، حافظ محمود شیرانی کو اُردو تحقیق کا معلّمِ اوّل تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے بقول:

> ''شیرانی صاحب کو اُردو میں تحقیق کا معلّمِ اوّل مانتا ہوں۔ ان کی تحریروں کو پڑھ کر ہم لوگوں نے تحقیق کے آداب سیکھے ہیں اور اس لحاظ سے ان کو استاد بلکہ استادالاساتذہ کہنا چاہیے۔''

حافظ محمود شیرانی سچے، محنتی اور کھرے محقّق تھے۔ ان میں وہ تمام اوصاف موجود تھے جو کہ ایک معیاری اور اچھے محقّق میں ہونا ضروری ہوتا ہے۔ ان کی تحقیقی تحریروں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے موضوعات کا مطالعہ گہری اور پینی نظر سے کیا تھا ان کا مطالعہ وسیع تھا۔ ان کی طبیعت میں جدّت اور اُپج تھی۔ محنت وریاضت اور مطالعہ ان کے ایسے جوہر تھے جن کے سبب ان کی تحقیق میں گہرائی اور گیرائی، حقائق کا عرفان اور قوّتِ فیصلہ کا حُسن نمایاں نظر آتا ہے۔ تحقیق میں جانب داری اور جذباتیت کو دخل نہیں ہے۔ مولوی عبدالحق اور حافظ محمود شیرانی کے تحقیقی طریق کار میں مذکورہ دونوں باتیں شامل نظر نہیں آتیں۔ لفّاظی، خطابت، رنگین عبارت آرائی بھی ان کی تحقیق میں دکھائی نہیں دیتی۔ سادگی، حقیقت بیانی اور دوٹوک انداز ان کی تحقیق کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

حافظ محمود شیرانی کا تحقیقی طریقۂ کار:

حافظ محمود شیرانی کی تحقیقی تحریروں اور تصنیفات کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک کامیاب، ذمّے دار اور معیاری محقّق تھے۔ واقعات یا حقائق کی دریافت میں وہ محض ناقدانہ توجیہ اور تشریح پر ہی اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ متعلّقہ موضوع کا گہرا مطالعہ کر کے اس سے متعلق تمام تر اُمور پر اظہارِ رائے کرتے تھے۔

ابتداً وہ موضوع کا تعارف کراتے پھر اس کا ناقدانہ تجزیہ کرتے پھر اس سے متعلق پیش رو ادیبوں کی آرا سے تحقیقی فیصلوں کو مستند بنا کر اس پر فیصلہ کن رائے ظاہر کرتے تھے۔ ان کی تحقیق میں داخلی شہادت کے ذرائع کو بھی خاص دخل حاصل ہے۔ حافظ محمود شیرانی کے تحقیقی طریقِ کار کی مثال ایک عدالتی مقدمے کی کاروائی کی سی ہوتی ہے۔ جس طرح مقدمے میں عنوان، تمہید، دعویٰ، جواب دعویٰ، استفسارات، شہادتیں، بحث واستدلال شامل ہوتے ہیں اسی طرح شیرانی صاحب کی تحقیق میں بھی مذکورہ بالا عوامل شامل ہوتے تھے۔ اس لحاظ سے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اُردو زبان وادب کے تحقیقی طریقِ کار میں قانونی انداز تحقیق وتفحص کو سب سے پہلے شیرانی صاحب نے ہی متعارف کرایا تھا۔ اپنے تحقیقی مضامین میں انہوں نے ایک ماہرِ قانون کا انداز اختیار کر کے قارئین ادب کو تحقیقی فیصلے سنائے ہیں۔ انہوں نے سبھی اہم تحقیقی موضوعات پر ٹھوس شہادتوں کی بنیاد پر منطقی استدلال کے ذریعے اپنے تحقیقی نتائج کا اظہار کیا ہے۔ ان کا تحقیقی طریق کار حقیقت پسندانہ اور معروضی اور مفکّرانہ غور وفکر کا حامل رہا ہے۔ ان کے متعلق احمد ندیم قاسمی کا یہ خیال درست ہے کہ:

> ''انہوں نے مستقبل کے محققین کو تلاش، جستجو، کُرید، محنت اور ذمّے داری کا درس دیا اور کسی بات کے ذہن میں آنے سے لے کر اسے نوکِ قلم پر لانے تک ایسے مراحل مقرّر کیے کہ کوئی اس انتہا کی سخت کوشی اور جگر کاوی سے کام لینے کے لیے تیار ہو تو محقّق بنے ورنہ کوئی اور مفید کام کرے..... سہل پسندی کسی بھی فن کے لیے سمِ قاتل کا حکم رکھتی ہے.... حافظ صاحب نے اس رجحان کو علوم وفنون کے دیووں سے ٹکرا کر ختم کیا اور اس سہل پسندی کی نہایت سخت الفاظ میں حوصلہ شکنی کی۔''

حافظ محمود شیرانی کا شمار ماہرِ لسانیات میں بھی ہوتا ہے لیکن ان کے کئی کام معیاری تحقیق کا اعلیٰ نمونہ بھی ہیں۔ ''پنجاب میں اُردو، شاہنامے سے فردوسی کے حالات، مُلّا دوپیازہ اور جعفر زٹلی کی مروّجہ سوانح عمریوں کا جائزہ اور تنقید'' وغیرہ تصانیف اور مقالے شیرانی صاحب کی اعلیٰ تحقیق کا نمونہ ہیں۔ انہوں نے ''مجموعۂ نغز'' کو بھی مرتب کیا ہے۔

﴿۳﴾ سید مسعود حسن رضوی ادیبؔ ۱۸۹۳ء-۱۹۷۵ء:

آپ کا شمار اُردو کے نامور ادیب اور محقّق کے طَور پر ہوتا ہے۔ وہ ماہر انیسیات بھی تسلیم کیے جاتے ہیں۔ اُردو کے ابتدائی ڈرامے اور اندر سبھاؤں پر بھی انہوں نے وقیع تحقیقی کام انجام دیے ہیں۔ انہوں نے مختلف موضوعات پر ۳۰/ کتابیں تصنیف وتالیف ومرتب کیں اور ۶۰/ تحقیقی مضامین ومقالات بھی تحریر کیے ہیں۔ ان کی تحقیقی کتب میں ہماری شاعری ۱۹۲۷ء، مجالسِ رنگین ۱۹۲۹ء، فیض میر ۱۹۲۹ء، فائز دہلوی ۱۹۴۶ء، تذکرۂ نادر ۱۹۵۷ء فسانۂ عبرت ۱۹۵۴ء، لکھنؤ کا شاہی اسٹیج ۱۹۵۷ء، لکھنؤ کا عوامی اسٹیج ۱۹۵۸ء، اُردو ڈراما اور اسٹیج ۱۹۵۸ء، گلشنِ سخن ۱۹۶۵ء، اندر سبھا ۱۹۶۸ء، اُردو زبان اور اس کا رسم الخط ۱۹۴۸ء، اسلاف میر انیسؔ ۱۹۷۰ء اور سلطان عالم واجد علی شاہ ۱۹۷۴ء وغیرہ اہم اور قابلِ ذکر ہیں۔

مسعود حسن رضوی ادیب نے مذکورہ بالا تحقیقی کتب میں طویل مقدمے اور حواشی بھی تحریر کیے ہیں اور متعلّقہ تحقیقی موضوعات پر سیر حاصل تحقیقی مواد اہلِ ادب کے لیے پیش کیا ہے اور متن کے ماخذوں کی نشان دہی بھی کی ہے۔ یوں تو مسعود حسن رضوی ادیبؔ کی ہر کتاب تحقیق کا اعلیٰ معیار پیش کرتی ہے لیکن ان کی تحقیقی کتاب ''اُردو ڈراما اور اسٹیج'' ان کا شاہکار تسلیم کی جاتی ہے جس میں انہوں نے ابتدائی دَور کے ڈراموں کے اوّلین نقوش کو محقّقانہ صحت کے ساتھ متعارف کرایا ہے۔

مسعود حسن رضوی ادیبؔ نے واجد علی شاہ کے ڈرامے ''رادھا کنھیّا'' کے متعلق لکھا ہے کہ وہ ۱۸۴۳ء میں کھیلا گیا تھا اور اسے اُردو کا پہلا ڈراما ثابت کیا گیا ہے اور اس دَور کے لکھنؤ کے تہذیبی تناظر میں ''اندر سبھا'' کی ادبی وفنی اہمیت پر بھی اظہارِ خیال کیا ہے۔ ''فسانۂ عبرت'' اور ''تذکرۂ نادر'' بھی ان کی قابلِ قدر تحقیقی تصنیف وتالیف ہیں۔ اسی طرح 'متفرّقاتِ غالبؔ' میں غالبؔ کے بعض خطوط، نظمیں اور ایک غزل کو پہلی بار اہلِ اُردو سے متعارف کرایا ہے۔ ''فیض میر'' میں میرؔ کے فارسی دیوان کا وہ کلام شامل ہے جو کہ پہلی بار اُردو والوں کے سامنے آیا ہے۔ ''مجالسِ رنگین'' پر لکھا گیا طویل مقدّمہ بھی تحقیق کی اعلیٰ مثال پیش کرتا ہے۔ ''رزم نامۂ انیس'' بھی ان کی منفرد اور انوکھی تحقیقی کاوش ہے۔ رضوی ادیبؔ کی دیگر تحقیقی کاوشوں میں غالبؔ کی مثنوی، مثنوی بادِ مخالف، قواعد کلیہ بھاکا، ناٹک بزمِ سلیمان، فرہنگِ امثال اور جواہرِ سخن کے نام پیش کیے جاسکتے ہیں۔

﴿۴﴾ مولانا امتیاز علی خاں عرشیؔ:

مولانا امتیاز علی خاں عرشیؔ کا شمار اُردو کے اہم ادیبوں، محقّقین، متنی نقّاد، مرتّب اور حواشی نگار کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ انہوں نے کئی کتابیں مرتب کیں اور کئی ادبی متون پر مقدمے اور حواشی قلم بند کیے ہیں۔ مکاتیبِ غالب ۱۹۳۷ء، انتخابِ غالب ۱۹۴۳ء، نادر شاہی، سلکِ گوہر ۱۹۴۸ء، دیوانِ غالب ۱۹۵۸ء، تاریخِ اکبری المعروف بہ تاریخ قندھاری ۱۹۶۲ء، تاریخِ محمدی ۱۹۶۰ء وغیرہ عرشیؔ صاحب کی اہم تحقیقی، تنقیدی کتابیں ہیں۔ مذکورہ بالا کتب میں شامل مقدموں، اشاریوں اور حواشی کی تحقیقی اہمیت مسلّم ہے کہ جن کے مطالعے سے مصنف کے وسیع المطالعہ اور عالم ہونے کا ہی اندازہ نہیں ہوتا بلکہ کئی نئی معلومات کا بھی علم ہو جاتا ہے۔

﴿۵﴾ قاضی عبدالودود:

قاضی عبدالوَدود عالمِ باعمل تھے۔ وہ عربی، فارسی، انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور لاطینی زبانیں جانتے تھے۔ ان کا شمار اُردو کے سب سے اہم مستند اور بلند مرتبہ محقّق کے بطور ہوتا ہے۔ رشید حسن خاں نے انھیں تحقیق کا ''معلّمِ ثانی'' تسلیم کیا ہے۔

رشید حسن خاں کے بقول:

> ''قاضی عبدالوَدود کو اُردو میں تحقیق کا معلّمِ ثانی کہنا چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ نئی نسل، تحقیق کے آداب اور انداز سے قاضی صاحب کے توسّط سے آشنا ہوئی ہے۔ پچھلے پچیس، تیس برسوں میں احتیاط پسندی کا جو رجحان بڑھا ہے، شک کرنے یا یوں کہیے کہ مضبوط دلیلوں کے بغیر دعووں کو قبول کرنے کا انداز جس طرح فروغ پذیر ہوا ہے اور منطقی استدلال نے جس طرح اہمیت حاصل کی ہے اور زود یقینی اور خوش اعتقادی نے جس طرح کم اعتباری کی سند پائی ہے، اُس میں قاضی صاحب کی تحریروں کا بہت بڑا حصّہ ہے۔ ان کی بے لچک شخصیت، اُن کے بے جھجک اندازِ گفتگو اور ان کے سخت گیر احتساب نے اس زمانے میں تحقیق کے طالب علموں کی ذہنی تربیت کی ہے اور ان کی تحریروں نے یہ بتایا ہے کہ تحقیق کی زبان اور پیرایۂ اظہار میں انشا پردازی، مرصّع کاری اور الفاظ کے بے محابہ استعمال کی مطلق گنجائش نہیں۔ انہوں نے سچ بولنا سکھایا مگر اس سے بڑا کام یہ کیا کہ سچ بولنے کا مطالبہ کرنے کو لازم قرار دیا۔''

(ارمغان، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی: ۲۰۱۲ء۔ ص...۲۷۹)

قاضی عبدالودود بنیادی طور پر محقّق تھے۔ابتداہی سے ان کا طبعی رجحان تحقیق کی جانب رہا اور انہوں نے مختلف اہم ادبی موضوعات پر بکثرت تحقیقی مضامین قلم بند کیے۔ان کے مخصوص ومنفرد طریقِ تحقیق کے سبب اُردو تحقیق لازوال اور بے مثال ماڈل بن گئی۔ان کی بات، ان کے دعوے، ان کے استدلال اور نتائج کو تحقیقی وقار، معیار اور اعتبار کا درجہ حاصل ہوگیا۔ان کی حق گوئی اور بیباکانہ اظہارِ بیان کے سبب کئی تحقیقی نتائج باطل ثابت ہوئے۔انہوں نے بت شکنی کی روایت قائم کر کے اُردو تحقیق کو اعلیٰ اور نمایاں وصف سے ہمکنار کر کے اُردو تحقیق میں ایک نئے دَور کا آغاز کیا۔ان کے سبب اُردو تحقیق نئے رنگ وآہنگ اور نئے مزاج سے روشناس ہوگئی۔اُردو تحقیق کے لیے وہ ایک عہد آفریں اور عہد ساز شخصیت ثابت ہوئے۔

قاضی صاحب کی تحقیق میں وزن ووقار پیدا کرنے میں محض ادبی موضوعات کا انتخاب ہی شامل نہیں تھا بلکہ صحیح اور اصل متن تک ان کی رسائی، ان کا گہرا مطالعہ، گہری نظر، منطقی استدلال، تحقیقی دُروں بینی، تنقیدی اور تقابلی تجزیہ، استصواب رائے، قوتِ فیصلہ، غیر جانب دارانہ، حقیقت پسندانہ طریق رسائی اور سادہ مگر مؤثر اُسلوب نے ان کی تحقیق کو اعلیٰ و بلند تر اور معیاری بنا دیا ہے۔رنگینی اور مرصّع کاری سے عاری ان کی سادہ زبان نے اُردو تحقیق کے منصب اور مقصد کو نقطۂ عروج پر پہنچا دیا۔الفاظ کے تصرّف اور استعمال میں بھی انہوں نے موضوع کی مناسبت اور اظہار کی ضرورت کو ملحوظ رکھا۔ان کی نظر میں رنگین بیانی اور استعاراتی زبان نتائج تک پہنچنے میں مانع ثابت ہوتی ہے۔قاضی صاحب کی تحریروں میں الفاظ کی کفایت شعاری اور سنجیدہ اور محتاط انداز نمایاں نظر آتا ہے۔ان کی تحقیقی تحریروں میں ذومعنی پن یا ابہام نظر نہیں آتا۔جدید اُردو تحقیق میں سادگیِ بیان، مناسب الفاظ کا استعمال دراصل قاضی عبدالوَدود کی ہی دین ہے۔اُردو تحقیق میں تشکیک کا عمل بھی قاضی صاحب کے زیرِ اثر پیدا ہوا ہے۔

قاضی صاحب کا بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے تحقیق کی مشکل پسندی کو آسان پسندی کے قریب بھٹکنے نہیں دیا۔اور ادبی تحقیق کو سائنسی مزاج کا خوگر بنا دیا۔قاضی صاحب کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے اہلِ ادب کو بہت سے نئے متون، نئے حقائق اور نئے ماخذوں سے بھی پہلی بار روشناس کرایا ہے۔قاضی صاحب معیاری اُردو تحقیق کا ماڈل بن چکے ہیں۔یہ سچ ہے کہ قاضی صاحب نے تحقیقی موضوع پر کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی ہے لیکن میرؔ، انشاؔ، مصحفیؔ، جرأتؔ، سوداؔ، غالبؔ، شادؔ وغیرہ پر انہوں نے اتنے زیادہ تحقیقی مضامین لکھے ہیں کہ ہر موضوع پر ایک کتاب تیار کی جاسکتی ہے۔میرؔ اور غالبؔ ان کا محبوب موضوع تھا۔انہوں نے چار سَو سے زیادہ مضامین تحریر کیے ہیں۔

ان کا طویل مقالہ ''غالبؔ بہ حیثیت محقق'' مشمولہ ''نقدِ غالب'' ان کی فارسی دانی اور غالبؔ شناسی کا بیّن ثبوت ہے۔قاضی صاحب نے کئی اہم ادبی موضوعات پر تحقیقی مضامین تحریر کرنے کے علاوہ کئی اہم ادبی کتب پر تبصرے بھی تحریر کیے ہیں۔ان کے تبصرے عام تبصروں سے قطعی منفرد ہیں کہ ان میں عالمانہ شان کے ساتھ تحقیق کے اہم رموز ونکات بھی شامل نظر آتے ہیں۔قاضی صاحب کے سبھی مضامین اور تبصرے نئی اور وقیع معلومات کا خزانہ ہیں۔ان کے کئی مضامین ومقالات خود ایک مکمل کتاب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ان کی تحریروں نے متعلّقہ موضوع پر قابلِ قدر اضافے کیے ہیں۔ان کا ہر طویل مقالہ یا تبصرہ مستقل کتاب کا درجہ رکھتا ہے۔جس کے مطالعے سے فنِ تحقیق کے اصل اور اعلیٰ اصولوں اور طریقِ کار کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔قاضی صاحب اپنے مضامین اور تبصروں میں صرف اعتراضات ہی نہیں کرتے، صرف غلطیاں ہی نہیں گناتے بلکہ متعلّقہ موضوع سے متعلق سچ یا سچی بات کی جانب واضح اور مدلّل نشان دہی بھی کرتے تھے۔

انہوں نے سیاہ وسفید کے مابین فرق کو علمی براہین اور استدلال کے ساتھ واضح کر کے بہت سے مفروضات سے پردے اُٹھائے ہیں، بہت سی غلط فہمیوں کو دُور کر دیا ہے۔ ان کی بے مثال تحقیقی کاوشوں سے ان کے بعد کے محققین، اساتذہ، طلبا اور ریسرچ اسکالرس نے خاطر خواہ استفادہ کیا ہے۔ تحقیق کے اصول اور طریقۂ کار سیکھے ہیں۔ معیاری تحقیق اور اس کی اہمیت وضرورت سے واقفیت حاصل کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قاضی صاحب اُردو کے سب سے اہم، معتبر، بلند مرتبہ اور قابلِ قدر محقّق تسلیم کیے جاتے ہیں۔

قاضی عبدالودود کا تحقیقی طریقۂ کار:

قاضی صاحب نے اپنی تحقیق کو معیاری، حقیقی اور معتبر بنانے میں جن اُمور کو پیشِ نظر رکھا تھا وہی ان کے تحقیقی طریقۂ کار ہیں۔ قاضی صاحب نے سبھی اہم موضوعات کو تحقیق کا عنوان بنایا۔ متعلقہ موضوع پر وہ مطالعے کی گہرائی کے قائل تھے۔ انہوں نے اصل ماخذ کو اپنی تحقیق کی بنیاد بنایا اور ثانوی ماخذات سے احتراز کیا۔ دوسروں کے فیصلوں پر بھروسہ کرنے کے بجائے حقائق کی روشنی میں اپنی رائے قائم کی یا اپنا فیصلہ سنایا۔ فن کار یا تصنیف کے عہد اور پس منظر پر خاص توجہ صرف کی تا کہ صحیح نتائج تک رسائی ہو سکے۔ فنی اور عروضی خامیوں کی جانب بھی توجہ دی اور دلائی تا کہ فن پارے کی معیار بندی میں آسانی ہو سکے۔ جانب داری، مروّت اور جذباتیت کو کبھی منہ نہیں لگایا کہ اس سے تحقیق کے معیار کو متعیّن کرنا دشوار ہو جاتا ہے اور صحیح رائے قائم نہیں ہو پاتی ہے۔ اپنے اُسلوب کو سلیس، سادہ اور حقیقت پسندانہ بنائے رکھا تا کہ بات صاف صاف انداز میں کہی جا سکے۔ غرض یہ کہ قاضی صاحب نے محقّقین کو تحقیق کے آداب سکھائے، تحقیقی اصولوں کا عرفان عطا کیا۔ ذمّے داری اور احتیاط کا سلیقہ سکھایا۔ انہوں نے عملی تحقیق کے تمام تر آداب واصول وشرائط ونکات ولازمی پہلوؤں کو متعیّن کر دیا ہے۔ قاضی صاحب کی عملی تحقیق سبھی محقّقین کے لیے رَہ نما اصول کی حیثیت رکھتی ہے۔ بقول پروفیسر مختارالدین احمد:

''قاضی صاحب نے تحقیق کو اُس پایہ تک پہنچا دیا جس سے آگے کا تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔''

﴿۶﴾ مالک رام:

مالک رام کا شمار اُردو کے نامور محقّقین میں ہوتا ہے۔ غالبؔ اور ابوالکلام آزادؔ اُن کے خاص موضوعات رہے، جن پر انہوں نے اظہارِ خیال کیا۔ مالک رام مزاجاً محقّق ہی تھے۔ تحقیق اور تحقیقی کاموں سے انہیں خاص لگاؤ تھا۔ تحقیق کے اسی لگاؤ کے سبب انہوں نے نہ صرف کئی تحقیقی مضامین اور مقالات اور تبصرے لکھے بلکہ ایک معیاری رسالہ ''تحریر'' کے نام سے جاری کیا جو کہ طویل مدت تک پابندی سے شائع ہوتا رہا۔ یوں تو تحریر کے بیشتر مشمولات تحقیقی نوعیت کے حامل ہوتے تھے لیکن اس میں شامل آخری مستقل کالم ''وفیات'' کے نام سے شائع ہوتا تھا جس میں اہم مرحوم قلم کاروں کے سوانحی کوائف اور ادبی کارناموں اور خدمات کے ساتھ سنہ وفات سے متعلق اہم تحقیقی مواد شامل ہوتا تھا۔

تحریر کے اسی خاص کالم کو وسعت دے کر مالک رام نے ''تذکرۂ معاصرین'' کے نام سے چار ضخیم جلدوں میں کتابی صورت میں شائع کیا۔ جس کو ادبی حلقوں خصوصاً تحقیق کرنے والوں نے قدر کی نگاہ سے دیکھا اور حسبِ ضرورت استفادہ بھی کیا اور آئندہ بھی کرتے رہیں گے۔ مالک رام نے ابوالکلام آزادؔ کا تحریر کردہ تذکرہ ''غبارِ خاطر'' اور ''ترجمان القرآن'' کو بھی مرتب کر کے اور ان پر مقدّمہ تحریر کر کے شائع کیا۔ متنی تحقیق کے اعتبار سے ''دیوانِ غالبؔ'' (صدی ایڈیشن) کی ترتیب ان کا خاص تحقیقی کارنامہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ مالک رام نے اپنے ترتیب شدہ کاموں میں سائنٹفک اندازِ تحقیق سے کام لیا ہے۔

''دیوانِ غالبؔ'' کے ابتدائی صفحات میں غالبؔ کی بعض اہم تصاویر اور خود نوشت غزلوں کے اشعار بھی شامل کیے ہیں تا کہ غالبؔ کو سمجھنے میں اور ان کے متعلّق صحیح رائے قائم کرنے میں آسانی پیدا ہو سکے۔ ''دیوانِ غالبؔ'' میں شامل ''مقدّمہ'' خالص تحقیقی نوعیت کا حامل ہے، جس میں غالبؔ کی زندگی کے اہم واقعات، شعر گوئی کی ابتدا، شاعری کے عوامل و محرکات پر اہم تحقیقی مواد پیش کیا گیا ہے۔ اس دیوان میں مالک رام نے نسخۂ حمیدیہ میں شامل کلامِ غالبؔ کا انتخاب بھی شامل کیا ہے اور حواشی تحریر کر کے مختلف دیوانِ غالبؔ کے مختلف ایڈیشنوں کی نشان دہی بھی کی ہے۔ مرزا غالبؔ کا مرتب کردہ کم یاب مخطوطہ ''گل رعنا'' کو مالک رام نے از سرِ نَو مرتب کر کے ۱۹۷۰ء میں کتابی شکل میں شائع کیا۔ ''گلِ رعنا'' میں مالک رام کے مقدمے کے علاوہ تحقیقی حواشی نے اس کتاب کی اہمیت میں اضافہ کر دیا ہے۔

مذکورہ بالا متنی تحقیقی کاموں کے علاوہ مالک رام نے سوانحی تحقیق سے متعلق دو اہم کتابیں (۱) ''ذکرِ غالب'' اور (۲) ''تلامذۂ غالب'' یادگار چھوڑی ہیں۔ مالک رام کے ان کاموں کے سبب ان کا شمار ماہرِ غالبیات کے بطور ہونے لگا۔ کئی محقّقین و ناقدین ان کے ان کاموں کو غالبیات میں اضافہ متصوّر کرتے ہیں۔ غالبیات کے سلسلے میں لکھی گئی ان کی کتاب ''فسانۂ غالبؔ'' بھی ایک اہم کتاب ہے جس میں شامل کئی مضامین تحقیقی نوعیت کے حامل ہیں۔ مالک رام کے فنِ تحقیق سے متعلق دو اہم مضامین بعنوان ''عصری تحقیق کے کچھ اصول'' اور ''اُردو میں تحقیق'' شائع ہو چکے ہیں۔ پہلے مضمون میں مالک رام نے تحقیق کے فن، اصول، طریقۂ کار، اہمیت و ضرورت پر اہم مواد پیش کیا ہے اور ترتیب، تدوین، حوالے اور حواشی سے متعلّق بھی اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ دوسرے مضمون میں اُردو ادب میں تحقیق کے آغاز و ارتقا پر اس طرح سیر حاصل روشنی ڈالی گئی ہے کہ اُردو تحقیق کی پوری تاریخ کا احاطہ ہو جاتا ہے۔ اس مضمون میں اُردو تحقیق اور بعض محقّقین سے متعلق نئی معلومات بھی فراہم کی گئی ہے۔

مالک رام کا تحقیقی طریقۂ کار:

﴿۱﴾ سنجیدہ تحقیقی مضامین میں رنگین عبارت آرائی سے گریز

﴿۲﴾ اصل ماخذ کی تلاش اور اصل ماخذ پر انحصار

﴿۳﴾ استفادے کی صورت میں اعتراف کے بہ طور حوالہ دیے جانے پر زور

﴿۴﴾ تحقیق کو ہمہ گیر بنانے کے لیے بین العلومیت کی ضرورت پر اصرار

مالک رام نے اپنی تحقیق میں مذکورہ بالا تمام نکات کو ملحوظِ خاطر رکھنے کی سعی کی ہے۔ وہ اپنے تحقیقی نتائج کو سیدھے سادے لفظوں میں دلائل کے ساتھ پیش کرنے کے قائل تھے۔ ان کی تحقیقی تحریروں میں منطقی استدلال کے ساتھ توازن اور گہرائی کا امتزاج ملتا ہے۔ یہی وہ تمام اوصاف ہیں جو کہ مالک رام کو معتبر و مستند و اہم محقق ثابت کرتے ہیں۔

﴿۷﴾ گیان چند جین:

گیان چند جین کا شمار اُردو کے اہم ترین ادیب اور محقّق کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ تحقیق سے انہیں فطری مناسبت تھی، وہ بنیادی طور پر محقّق ہی تھے۔ ان کی بیشتر تصانیف، مقالے اور مضامین، تحقیقی نوعیت کے حامل ہیں۔ ان کی بعض تصانیف لسانیات سے متعلق بھی ہیں اور کئی مضامین و کتب میں تحقیق و تنقید کا متوازن امتزاج پایہ کا ہوتا ہے۔

ان کے متعلق لکھا گیا ہے کہ ''ان کے تنقیدی مضامین میں محقّق کی بصارت اور تحقیقی کاوشوں میں نقّاد کی بصیرت کا پہلو غالب ہے''۔

حقیقت یہ ہے کہ گیان چند جین ایک حقیقت پسند، محنتی اور ذمّے دار محقّق ہیں ان کی تحقیقی کاشوں میں خاصا تنوّع ملتا ہے۔انہوں نے اُردو داستانوں، مثنویوں، لسانیات، غالبؔ، اقبالؔ اور دیگر کئی اہم موضوعات پر معیاری تحقیق کی مثالیں پیش کی ہیں۔''اُردو کی نثری داستانیں، اُردو مثنوی شمالی ہند میں، لسانی مطالعے، پہچان اور پرکھ، اقبالؔ کا ابتدائی کلام، تحریریں، تحقیق کا فن'' وغیرہ ان کی اہم تحقیقی کتابیں ہیں۔یوں تو ان کی سبھی کتابیں معیاری اور معلومات افزا ہیں لیکن ان کا سب سے اہم اور وقیع کام اُردو داستانوں اور مثنویوں سے متعلق ہے۔کتاب ''اُردو کی نثری داستانیں'' دراصل ڈی فل.کی سند کے حصول کے لیے لکھا گیا طویل تحقیقی مقالہ ہے جس پر انہیں الٰہ آباد یونی ورسٹی نے ۱۹۴۸ء میں سند عطا کی تھی۔اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔اس کتاب میں جین صاحب نے عہد قدیم کے افسانوی ادب کی جملہ اقسام، پس منظر اور اُردو کی نثری داستانوں کا تحقیقی، تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔

داستان گوئی کے فن، تکنیک، اصول، اسالیب اور اجزائے ترکیبی پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے اور اس کے ارتقا نیز فروغ و زوال کے اسباب پر بھی روشنی ڈالی ہے اور اُردو داستانوں کے مقام و مرتبے نیز قدر و قیمت کا تعین کیا ہے۔اُردو داستانوں پر کئی لوگوں نے تحقیقی کام انجام دیے ہیں لیکن جین صاحب کی اس کتاب کو سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ڈی لٹ.کی سند کے حصول کے لیے لکھے گئے تحقیقی مقالے ''اُردو مثنوی شمالی ہند میں'' کی تحقیقی اہمیت بھی مسلم ہے۔اس مقالہ میں مثنوی کی صنف، اس کے آغاز و ارتقا اور شعری و ادبی اہمیت کے ساتھ تمام اہم اُردو کی بارہ سو مثنویوں کا تحقیقی تنقیدی تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔کئی مثنویاں ایسی بھی ہیں جن سے پہلی بار تعارف حاصل ہوتا ہے۔کتاب ''لسانی مطالعے'' میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے لسانیات کے موضوع پر اہم مضامین شامل ہیں۔بقیہ مجموعۂ مضامین میں بھی اہم ادبی موضوعات پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔گیان چند جین نے اصل ماخذات اور نجی مطالعے اور تجزیے کے بعد اپنے فیصلے صادر کیے ہیں اس لیے ان کی تحقیق میں وقعت بھی ہے، معیار بھی اور نئی معلومات سے آگاہی بھی ہوتی ہے۔

''تحقیق کا فن'' جین صاحب کی اہم ترین کتاب اس لیے بھی تسلیم کی جاتی ہے کہ انہوں نے تحقیق کے فن، اصول و ضوابط، طریقۂ کار، اُسلوب، تلاش و تفحص، محنت و ریاضت، اقتباسات، انتخابات کے طریقوں، معیاری تحقیق کے لیے سبھی ضروری شرائط، ضمیمہ، فرہنگ، اشاریہ، حواشی اور حوالہ جات سے متعلق اہم مواد پیش کیا ہے۔نئی نسل کے محققین خصوصاً پی ایچ.ڈی.، ایم فل.اور ڈی لٹ.کی اسناد حاصل کرنے والے ریسرچ اسکالرس کے لیے یہ کتاب رَہ نما اصول کی حیثیت رکھتی ہے۔

﴿۸﴾ مشفق خواجہ:

مشفق خواجہ نے طنزیہ مزاحیہ کالم اور تنقیدی مضامین بھی لکھے، شاعری بھی کی لیکن ان کی اصل پہچان بحیثیت محقق کے ہوتی ہے کہ بنیادی طور پر وہ محقّق ہی تھے اور ان کا اصل کام تحقیقی اُمور سے متعلّق ہے۔یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مشفق خواجہ کی اصل ادبی کاوشیں تحقیق و تنقید کی معیار بندی اور معیار گری کی حامل ہیں۔ان کے تحقیقی یا ادبی کاموں میں خاصا تنوّع ملتا ہے۔تاریخ شعر و ادب اور اُردو فارسی تذکرۂ مخطوطات کی تحقیق ان کا خاص میدان رہا ہے۔انہوں نے قدیم و جدید دونوں ادبی موضوعات پر قابلِ قدر، معیاری اور تحقیقی کام انجام دیے ہیں۔''تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا، جائزۂ اُردو مخطوطات، تحقیق نامہ، غالبؔ اور صفیرؔ بلگرامی، کلیات یگانہ'' وغیرہ ان کے اہم تحقیقی کام ہیں۔

مولوی احمد دین کی کتاب ''آفتاب'' کی ترتیب وتدوین اور کئی کتابوں پر مقدمے اور حواشی، کئی موضوعات پر تحقیقی وتعارفی مضامین کے مطالعے سے ان کی تحقیقی بصیرت، تحقیقی طریقِ کار، تحقیقی اصول اور تحقیقی معیار کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ مشفق خواجہ نے محض قدیم کتب اور مخطوطات کا تعارف ہی نہیں کرایا ہے بلکہ کئی گمنام اہم ادبی مخطوطات، کتب اور نئے قلم کاروں کو بھی متعارف کرا کے ان کے مقام ومرتبے کا تعیّن کیا ہے۔ عمیق مطالعہ، گہرا مشاہدہ، تنقیدی تجزیہ، عرق ریزی اور تلاش وتفحص کے ساتھ اصل اور نئے ماخذوں تک رسائی اور ان پر تحقیق کرنا مشفق خواجہ کا خاص تحقیقی وصف رہا ہے۔ انہوں نے کئی ادبی موضوعات مثلاً قزلباش خاں امیدؔ، جسونت سنگھ پروانہ، ثناءاللہ، فضل علی ممتاز، خواجہ احسن اللہ بیان وغیرہ پر تحقیقی مقالات لکھ کر اہم تحقیقی کام انجام دے کر، گم شدہ کڑیوں کا پتا لگا کر قابلِ قدر تحقیقی کام کیے ہیں۔ احمد دین کی کتاب ''سرگذشتِ الفاظ'' ایک اہم ادبی کتاب ہے جسے متعارف کراتے ہوئے مشفق خواجہ نے لکھا ہے:

''اس موضوع پر اُردو میں یہ پہلی کامیاب کوشش ہے۔ اپنے موضوع پر یہ واحد کتاب ہے۔ اُردو میں سائنٹفک انداز سب سے پہلے انہوں نے اختیار کیا۔''

علامہ اقبال پر لکھی گئی احمد دین کی پہلی کتاب ''اقبالؔ'' کا تعارف بھی مشفق خواجہ نے ہی کرایا۔ مشفق خواجہ نے اپنے ہر تحقیقی کام میں گہرے مطالعے، تنقیدی تجزیے، محنت وریاضت اور وسعتِ نگاہ سے کام لیا ہے۔ وہ ایک معتبر ومستند محقق تسلیم کیے جاتے ہیں۔

ان کے متعلق یہ خیال درست ہے:

''وہ ایسے موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں جو اپنی اہمیت کی بنا پر ہماری ادبی تاریخ کے کسی نہ کسی خلا کو پُر کرتے ہیں۔''

(غالبؔ نامہ: ص....۸)

﴿۹﴾ رشید حسن خاں ۱۹۲۵ء-۲۰۰۶ء:

رشید حسن خاں اُردو کے معتبر، مستند، مقتدر اور دیدہ ور محقّق تھے۔ انہوں نے حافظ محمود شیرانی اور قاضی عبدالوَدود کی تحقیقی روایت کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ رشید حسن خاں خالص محقّق تھے۔ ان کے موضوعات اور تحقیقی خدمات کا دائرہ خاصا وسیع اور وقیع ہے۔ اُردو تحقیق کے فن، اُصول، طریقِ کار پر لکھے گئے ان کے مضامین، قدیم ادبی وشعری متون پر لکھے گئے تحقیقی مقدمات، حواشی، اشاریے، حوالے، فرہنگیں اور قواعد اُردو املا سے متعلق ان کے مضامین اور کتب اور خطوط اُردو تحقیق میں اضافے کی حیثیت ہی نہیں رکھتے ہیں بلکہ تحقیق و تدوین وترتیب کے اعلیٰ اور معیاری مثالیں بھی پیش کرتے ہیں۔ متنی تحقیق کی ترتیب وتدوین، اصلی ماخذات کی رسائی، منطقی استدلال کے نتائج، تقابل وتجزیہ اور صحیح دلائل وبراہین کے ساتھ تحقیقی فیصلوں نے اُنہیں معاصرین میں سب سے اہم اور سب سے معتبر محقق بنا دیا ہے۔

رشید حسن خاں نے فسانۂ عجائب، باغ وبہار، گلزارِ نسیم، مثنویاتِ شوقؔ لکھنوی، مثنوی سحرالبیان اور جعفر زٹلی کا کلام ''زٹلی نامہ'' مرتب کر کے ان پر تحقیقی مقدمے اور حواشی قلم بند کر کے پوری ذمّے داری، معیار اور صحت کے ساتھ جس طرح شائع کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ مذکورہ بالا تمام اہم متون کے اصل ماخذ، مختلف نسخوں اور جلدوں اور ان سے متعلق ادبی کاموں کا عمیق مطالعہ اور تجزیہ کر کے رشید حسن خاں نے حقائق، دلائل اور براہین کی روشنی میں اپنے فیصلے صادر کیے ہیں اور مذکورہ بالا ادبی متون اور مصنّفین سے متعلق کئی غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کیا ہے۔

رشید حسن خاں کی دیگر کتب میں مضامین کے مجموعے ''تلاش وتعبیر'' اور ''تفہیم'' میں اور زبان وقواعد سے متعلق کتب ''اُردو املا، زبان وقواعد'' کے علاوہ ان کے خطوط میں بھی اہم تحقیقی، تنقیدی مواد، اہم معلومات اور اہم فیصلے شامل ہیں جن کے مطالعے سے نئی نسل کے محقّقین خصوصاً اُردو اساتذہ، طلبا اور ریسرچ اسکالرس کی رَہ نمائی میں بڑی مدد ملتی ہے۔

رشید حسن خاں نے مذکورہ بالا مرتب کردہ دیوانوں کے علاوہ درج ذیل کتابیں بھی مرتب کی ہیں:

﴿۱﴾ انتخابِ نظیر اکبرآبادی ﴿۲﴾ انتخابِ شبلی ﴿۳﴾ انتخاب مراثیِ انیس و دبیر

﴿۴﴾ انتخابِ سودا ﴿۵﴾ انتخابِ ناسخ ﴿۶﴾ اُردو کیسے لکھیں

﴿۷﴾ ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ ﴿۸﴾ انشا اور تلفظ ﴿۹﴾ انشاے غالب

﴿۱۰﴾ کلاسیکی ادب کی فرہنگ (جلد اوّل)

انہوں نے مذکورہ بالا کتب کے علاوہ علمی، ادبی موضوعات پر متعدد تحقیقی مقالے بھی قلم بند کیے ہیں۔

رشید حسن خاں ذہین اور وسیع المطالعہ محقق تھے۔ انہوں نے اپنی تحقیق کے لیے خود ہی کئی اصول وضوابط مقرر کیے تھے، جن کی روشنی میں یا جن پر عمل پیرا ہو کر وہ تحقیقی نتائج یا فیصلے صادر کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی علمیت اور بصیرت سے عملی تحقیق کے جو معیاری نمونے پیش کیے ہیں وہ نئی نسل کے محققین کے لیے رَہ نما اصول کا درجہ رکھتے ہیں۔ تحقیق کے فن، اصول اور منصب سے متعلق اُن کی حسب ذیل آرا سے ان کے طریقِ تحقیق کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

﴿۱﴾ حقائق کی بازیافت تحقیق کا مقصد ہے۔

﴿۲﴾ تحقیق، کسی امر کو اس کی اصل شکل میں دیکھنے کی کوشش ہے۔

﴿۳﴾ ادبی تحقیق کے طریق کار اور اس کے اصولوں کو صحیح طور پر سمجھنے اور سمجھانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اطلاقی تحقیق کے شعبے کو وسعت دی جائے۔

﴿۴﴾ تاویلات اور قیاسات کا اطلاق حقیقت پر نہیں کیا جاسکتا۔

﴿۵﴾ تحقیق ایک مسلسل عمل ہے۔ تحقیق میں اصلیت کا تعیّن اس وقت تک حاصل شدہ معلومات پر مبنی ہوتا ہے۔ تحقیق میں دعوے سند کے بغیر قابلِ قبول نہیں ہوتے۔

﴿۶﴾ زندہ لوگوں کو موضوعِ تحقیق بنانا غیر مناسب ہے۔

﴿۷﴾ وہ ماخذ ومصادر جن سے استفادہ کیا جائے قابل اعتماد ہوں۔

﴿۸﴾ روایت کے سلسلے میں اس کی بڑی اہمیت ہے کہ راوی کون ہے؟؛ حوالہ مشکوک نہ معلوم ہوتا ہو؛ دلیل، منطق کے خلاف نہ ہو؛ اگر ماخذ قابل حصول ہو تو براہِ راست استفادہ کرنا چاہیے؛ تعبیرات کو واقعات نہیں کہا جاسکتا؛ تحقیق کے ذریعے علم میں اضافہ ہوتا ہے؛ تحقیق ذاتی اثرات سے پرے ہو۔

رشید حسن خاں نے مذکورہ بالا باتوں اور اُصولوں کو پیشِ نظر رکھ کر تحقیق کو معیاری اور معتبر بنا دیا ہے۔

﴿۱۰﴾عبدالقوی دسنوی ۱۹۳۰ء-۲۰۱۱ء:

پروفیسر عبدالقوی دسنوی اُردو کے معروف ادیب، نقّاد، مرتب اور محقّق تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ان کا شمار غالبؔ شناس، اقبالؔ شناس، ابوالکلام آزادؔ کے ماہر اور اشاریہ ساز کی حیثیت سے بھی ہوتا ہے۔ انہوں نے کئی کم یاب متون کو مرتب بھی کیا ہے اور ان پر مقدمے اور حواشی بھی تحریر کیے ہیں۔ انہوں نے غالبؔ پر چار کتابیں، اقبالؔ کی شخصیت اور فکر وفن پر پانچ کتابیں، ابوالکلام آزادؔ کی شخصیت اور ادبی خدمات پر آٹھ کتابیں تصنیف کیں، سات اشاریے مرتب کیے، حسرتؔ موہانی، علامہ سید سلیمان ندوی، مہدی افادی پر وقیع کتابیں لکھیں۔ ان کے علاوہ سولہ کتابیں مرتّب کیں اور مختلف ادبی، علمی موضوعات پر ۳۰۰/ سے زیادہ مضامین اور تبصرے تحریر کیے ہیں۔

اہم شخصیات میں مُلّا سجاد حسین، مُلّا فخرالدین، تخلص بھوپالی، غالبؔ اور اقبالؔ پر کتابیں مرتب کی ہیں۔ بھوپال اور غالبؔ، علامہ اقبالؔ بھوپال میں، نسخۂ بھوپال اور نسخۂ بھوپال ثانی، اقبالؔ اور دلّی، معاصر و متعلقات آزادؔ اور حیات ابوالکلام آزادؔ اُن کی تصنیف کردہ ایسی خالص تحقیقی کتابیں ہیں جن میں پہلی بار موضوع سے تعلق نیا اور وقیع تحقیقی مواد پیش کیا گیا ہے اور جن کے سبب دسنوی صاحب کو غالبؔ شناس، اقبالؔ شناس اور ماہرِ ابوالکلام آزادؔ تسلیم کیا جاتا ہے۔

دسنوی صاحب بنیادی طور پر محقّق تھے لیکن اپنے تحقیقی عمل نیز فیصلوں کو معیار و اعتبار عطا کرنے اور فن پارے یا موضوع کے صحیح تعیّن قدر کے لیے وہ اصل ماخذ سے رجوع کرنے کے علاوہ تنقیدی تجزیے سے بھی کام لیتے تھے۔ معروضیت، وضاحت، شفافیت اور صحیح دلائل پر مبنی استخراج نتائج ان کی تحقیقی تحریروں کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ وہ فن اور فن کار سے متعلق جملہ اُمور یعنی سماجی، تہذیبی پس منظر، فنی خصوصیات، اصل ماخذ و مصادر کو بنیاد بنا کر اپنی رائے کا اظہار کرتے تھے۔ اُردو تحقیق میں انہوں نے کئی نئے موضوعات کا اضافہ کیا ہے۔ ان کی وقیع تحقیقی خدمات سے آنے والی نسلیں کسبِ فیض کرتی رہیں گی۔

﴿۱۱﴾سید حنیف احمد نقوی ۱۹۳۶ء- ۲۰۱۲ء:

اُردو کے نامور ادیب، شاعر، عالم اور اہم محقّق پروفیسر حنیف نقوی بنیادی طور پر محقّق ہی تھے۔ تحقیق سے انہیں فطری مناسبت تھی یا یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ان کا مزاج لڑکپن ہی سے محقّقانہ تھا۔ مطالعہ، مشاہدہ، غور وفکر، محنت و ریاضت، تلاش و تفحص ان کی عادتِ ثانیہ تھی۔ حافظہ اتنا اچھّا تھا کہ جو پڑھ لیتے تھے وہ ہمیشہ یاد رہتا تھا۔ انہوں نے قدیم اور جدید فن پاروں، ادبی کتابوں کا مطالعہ عمیق نظر سے کیا تھا۔ مشرقی شعریات، کلاسیکی ادب اور تذکروں پر ان کی گہری نگاہ تھی۔ وہ سچے اور معتبر محقق تھے اس لیے روایت یا سنی سنائی بات پر یقین کرنے کے بجائے اصل متن و ماخذ کے مطالعے اور تجزیے کے بعد ہی وہ اس سے متعلق رائے کا اظہار کرتے تھے۔ زمانۂ طالب علمی ہی سے وہ تحقیق کی جانب مائل ہوگئے تھے اور آخری سانس تک وہ تحقیقی سرگرمیوں میں مصروف رہے۔ ان کے تحقیقی مزاج، ذہن اور قلم سے کئی اہم تحقیقی کام منظر عام پر آئے اور اُردو ادب میں اضافے کا سبب بنے۔ وہ ایک محقق اور عالم تھے، ان کی تحریروں نے اُردو تحقیق کو وقار و اعتبار عطا کیا۔ معیاری تحقیق کے متعلق ان کا خیال تھا:

''تحقیق کے دوران محقق کو جن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے اس میں دو مرحلے خاص اہم ہوتے ہیں۔
پہلا مرحلہ انکشافِ حقائق، دوسرا استخراج نتائج کا''۔

دوٹوک اندازِ بیان اور بے لاگ رائے کا اظہار ان کی تحقیق کا نمایاں وصف ہے۔ ''شعرائے اُردو کے تذکرے'' ان کا سب سے اہم اور وقیع تحقیقی کام ہے۔ غالبؔ بھی ان کا پسندیدہ موضوع تھا۔ غالبؔ کی شخصیت، سوانح، عہد اور خدمات سے متعلق انہوں نے ۶ رکتابیں تصنیف کی ہیں۔ ان میں ''غالبؔ احوال و آثار'' اور ''مآثر غالبؔ'' کو ادبی حلقوں میں بطورِ خاص پسند کیا گیا ہے۔ حنیف نقوی کی دیگر تصنیفات میں ''تلاش وتعارف، رجب علی بیگ سرورؔ، چند تحقیقی مباحث، دیوانِ ناسخؔ، رائے بنی نرائن دہلوی، میرؔ و مصحفیؔ، انتخاب کربل کتھا، تحقیق و تدوین مسائل اور مباحث، تذکرہ شعرائے سہسوان'' کے علاوہ انہوں نے ۱۵۰ رتحقیقی مضامین بھی تحریر کیے ہیں۔

05.04 خلاصہ

اُردو ادب میں تحقیق کی روایت بہت وقیع ہے۔ تحقیق حقائق کی بازیافت بھی ہے اور علم و معلومات میں اضافے کا سبب بھی۔ اُردو میں تحقیق کا آغاز تذکرہ نگاری سے ہوتا ہے لیکن اس کا با قاعدہ آغاز سرسیّد احمد خاں ان کے معاصرین اور ان کی تعلیمی و ادبی تحریک کے زیرِ اثر ہوا۔ سرسیّد احمد خاں، حالیؔ، شبلیؔ، محمد حسین آزادؔ، امداد امام اثرؔ وغیرہ کی علمی، تاریخی اور سوانحی تصانیف کے ذریعے اُردو میں با قاعدہ طور پر تحقیق کا آغاز ہوا اور پھر اس سلسلے کو حافظ محمود شیرانی، مولوی عبدالحق، سید سلیمان ندوی، عبدالستار صدیقی، نورالحسن ہاشمی، سید عبداللہ، ابواللیث صدیقی، نصیر الدین ہاشمی، محی الدین قادری زورؔ، مسعود حسین خاں، امتیاز علی عرشیؔ، قاضی عبدالودود، مالک رام، گیان چند جین، سید مسعود حسن رضوی ادیبؔ، مشفق خواجہ، رشید حسن خاں، عبدالقوی دسنوی، شیام لال کالرا، خلیق انجم اور حنیف احمد نقوی وغیرہ نے نہ صرف آگے بڑھایا بلکہ اپنی تحقیقی بصیرت اور عملی طریقِ کار سے اُسے اعتبار و وقار عطا کیا۔ حافظ محمود شیرانی، مولوی عبدالحق، قاضی عبدالودود، امتیاز علی خاں عرشیؔ، مالک رام، مسعود حسن رضوی ادیب، رشید حسن خاں، مشفق خواجہ، عبدالقوی دسنوی اور حنیف احمد نقوی ایسے محقّق ہیں جنھوں نے مستقل طور پر طویل عرصے تک اپنی تحقیقی سرگرمیوں کو جاری رکھ کر اُردو تحقیق میں قابلِ قدر اضافے کیے ہیں۔

تحقیق کرنے والا محقّق کہلاتا ہے۔ تحقیق حقائق کی بازیافت ہے۔ یہ ایک صبر آزما، محنت طلب، ذمے دارانہ فریضہ ہے۔ حافظ محمود شیرانی، مولوی عبدالحق، امتیاز علی خاں عرشیؔ، سید مسعود حسن رضوی ادیبؔ، مالک رام، گیان چند جین، قاضی عبدالودود، مشفق خواجہ، رشید حسن خاں، عبدالقوی دسنوی اور حنیف احمد نقوی کا شمار اُردو کے اہم ترین اور قابلِ قدر محققین میں ہوتا ہے۔ رشید حسن خاں نے حافظ محمود شیرانی کو اُردو تحقیق کا معلّمِ اوّل اور قاضی عبدالودود کو معلّمِ ثانی کہا ہے۔

اُردو میں تحقیق کا نقطۂ آغاز تذکرہ نگاری سے ہوتا ہے لیکن اس کا با قاعدہ آغاز سرسید احمد خاں کے عہد سے ہوا۔ بابائے اُردو مولوی عبدالحق کو اُردو تحقیق کا معمارِ اوّل کہا جاتا ہے۔ مالک رام نے تحقیقی رسالہ ''تحریر'' کے نام سے جاری کیا تھا۔ رسالہ اُردو کے مدیر مولوی عبدالحق تھے۔ اصل متن اور ماخذ سے استفادہ، محنت و ریاضت، عرق ریزی، گہرا مطالعہ و مشاہدہ، غور و فکر، تنقیدی تجزیہ، تقابلی جائزہ، تفحص و تلاش، صحیح حوالے اور حواشی، منطقی استدلال نتائج، معیاری تحقیق کے لیے لازمی جزو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اُردو میں تحقیق کی روایت نہایت وقیع ہے۔ تحقیق و تلاش و تجزیہ کے سبب اُردو زبان و ادب کے دامن میں خاصی وسعت پیدا ہوگئی ہے۔ تحقیق کا عمل ہر آن جاری رہتا ہے۔ اس میدان میں حرفِ آخر کو دخل نہیں۔ تحقیق نئے جہانوں کا پتا دیتی ہے۔ اس سے علم و معلومات اور ادبی سرمائے میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ حقیقت کے عرفان اور شعور کے لیے تحقیقی عمل بے حد اہم اور ضروری ہے۔

05.05 فرہنگ

احتراز	:	گریز، دوری	جدّت	:	نیاپن
احتیاج	:	ضرورت	جگرکاوی	:	محنت وریاضت
اختراع	:	کسی نئی چیز کی ایجاد	خارزار	:	کانٹوں بھری
اسالیب	:	اُسلوب کی جمع، طرزِتحریر	خوگر	:	عادی
استدلال	:	دلیل	رُموز	:	رمز کی جمع، بھید
اطلاق	:	لاگو، انطباق	ژرف نگاہی	:	گہری نظر
امتزاج	:	میل جول، آمیزش	عرفان	:	علم
اوصاف	:	وصف کی جمع، خوبی	عرق ریزی	:	بہت زیادہ محنت کرنا
بازیافت	:	حاصل، حصول	کاوش	:	کوشش
براہین	:	برہان کی جمع یعنی دلیل	کوائف	:	حالات، کیفیات
بے محابہ	:	بلاجھجک	مانع	:	رکاوٹ
بیّن	:	پختہ، کھلا ہو	متعین کرنا	:	طے کرنا
تصرّف	:	استعمال، برتنا	متون	:	متن کی جمع
تفحص	:	تلاش	معمار	:	تعمیر کرنے والا
تقلید	:	پیروی، نقل	نکات	:	نکتے کی جمع
تنوع	:	نیاپن	وقیع	:	باوقعت، قیمتی

05.06 سوالات

مختصر سوالات

سوال نمبر۱ : اُردو تحقیق کا معمارِاوّل کسے کہا گیا ہے؟

سوال نمبر۲ : اُردو تحقیق کا نقطۂ آغاز کس صنف سے ہوتا ہے؟

سوال نمبر۳ : اُردو تحقیق کا باقاعدہ آغاز کس کے عہد سے ہوا؟

سوال نمبر۴ : رشید حسن خاں نے اُردو تحقیق کا معلمِ اوّل کسے کہا ہے۔

تفصیلی سوالات

سوال نمبر۱ : اُردو کے اہم محققین کی تحقیقی خدمات پر روشنی ڈالیے۔

سوال نمبر۲ : عبدالقوی دسنوی کی تحقیقی خدمات پر اظہارِ خیال کیجیے۔

سوال نمبر۳ : سید مسعود حسن رضوی ادیبؔ کے تحقیقی کارناموں پر روشنی ڈالیے۔

سوال نمبر۴ : معیاری اور معتبر اُردو تحقیق کے لیے کون سی باتیں نہایت ضروری ہیں؟

سوال نمبر۵ : مولوی عبدالحق کی تحقیقی خدمات اور ان کے طریقِ کار پر اظہارِ رائے کیجیے۔

معروضی سوالات

سوال نمبر۱ : اُردو تحقیق کا نقطۂ آغاز ہے:

(الف) داستانیں (ب) تذکرہ نگاری (ج) حکایات (د) ملفوظات

سوال نمبر۲ : اُردو تحقیق کا باقاعدہ آغاز کس کے عہد سے ہوتا ہے؟

(الف) سرسید احمد خاں (ب) غالبؔ (ج) میر امّن (د) ان میں کوئی نہیں

سوال نمبر۳ : اُردو تحقیق کا ''معلّمِ اوّل'' کسے کہا گیا ہے؟

(الف) سرسید احمد خاں (ب) مالک رام (ج) حافظ محمود شیرانی (د) مسعود حسین

سوال نمبر۴ : ''پنجاب میں اُردو'' کے مصنف کون ہیں؟

(الف) حافظ محمود شیرانی (ب) محمد حسین آزادؔ (ج) حالیؔ (د) نصیر الدین

سوال نمبر۵ : ''بابائے اُردو'' کسے کہا جاتا ہے؟

(الف) سرسید احمد خاں (ب) مولوی عبدالحق (ج) شبلیؔ نعمانی (د) عبدالقوی دسنوی

سوال نمبر۶ : کس محقق نے اُردو، انگلش ڈکشنری مرتب کی ہے؟

(الف) حافظ محمود شیرانی (ب) قاضی عبدالودود (ج) مولوی عبدالحق (د) مالک رام

سوال نمبر۷ : کتاب ''اُردو ڈراما اور اسٹیج'' کے مصنف کون ہیں؟

(الف) سید مسعود حسن رضوی ادیب (ب) مالک رام (ج) رشید حسن خاں (د) رام بابو سکسینہ

سوال نمبر۸ : تحقیق کا ''معلّمِ ثانی'' کسے کہا گیا ہے؟

(الف) امتیاز علی خاں عرشیؔ (ب) قاضی عبدالودود (ج) حنیف نقوی (د) عبدالحق

سوال نمبر۹ : رسالہ ''تحریر'' کے مدیر کون تھے؟

(الف) عبدالحق (ب) عبدالقوی دسنوی (ج) مالک رام (د) مشفق خواجہ

سوال نمبر۱۰ : ''جائزۂ اُردو مخطوطات'' کس کی کتاب ہے؟

(الف) مشفق خواجہ (ب) عبدالقوی دسنوی (ج) حنیف نقوی (د) مولوی عبدالحق

معروضی سوالات کے جوابات

سوال نمبر۱ : (ب) تذکرہ نگاری	جواب نمبر۶ : (ج) مولوی عبدالحق
جواب نمبر۲ : (الف) سرسید احمد خاں	جواب نمبر۷ : (الف) مسعود حسن رضوی ادیب
جواب نمبر۳ : (ج) حافظ محمود شیرانی	جواب نمبر۸ : (ب) قاضی عبدالودود
جواب نمبر۴ : (الف) حافظ محمود شیرانی	جواب نمبر۹ : (ج) مالک رام
جواب نمبر۵ : (ب) مولوی عبدالحق	جواب نمبر۱۰ : (الف) مشفق خواجہ

05.07 حوالہ جاتی کتب

۱۔	تذکرۂ فارسی گویاں	از مولوی عبدالحق
۲۔	تذکرۂ ہندی گویاں	از مولوی عبدالحق
۳۔	اُردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیا کرام کا حصّہ	از مولوی عبدالحق
۴۔	اُردو زبان میں علمی اصطلاحات اور قدیم اُردو	از مولوی عبدالحق
۵۔	لسانی مطالعے	از گیان چند جین
۶۔	تحقیق کا فن	از گیان چند جین
۷۔	ادبی تحقیق۔ مسائل اور تجزیہ	از رشید حسن خاں
۸۔	تلاش و تعبیر	از رشید حسن خاں
۹۔	پنجاب میں اُردو	از حافظ محمود شیرانی
۱۰۔	تحقیق نامہ	از مشفق خواجہ

بلاک نمبر 02

اکائی 06	مولوی عبدالحق	پروفیسر سید عتیق اللہ
اکائی 07	محمود شیرانی	پروفیسر سید عتیق اللہ
اکائی 08	خواجہ احمد فاروقی	ڈاکٹر شریف احمد قریشی
اکائی 09	امتیاز علی خاں عرشی	ڈاکٹر شریف احمد قریشی
اکائی 10	مسعود حسین خاں	پروفیسر محمد نعمان خاں
اکائی 11	ڈاکٹر گیان چند جین	پروفیسر محمد نعمان خاں

اکائی 06 : مولوی عبدالحق

ساخت :

06.01 : اغراض ومقاصد
06.02 : تمہید
06.03 : مولوی عبدالحق سوانح وشخصیت
06.04 : انجمن ترقی اُردواور مولوی عبدالحق
06.05 : جامعہ عثمانیہ اور مولوی عبدالحق
06.06 : مولوی عبدالحق کی متنی تنقید
06.07 : مولوی عبدالحق کی تنقید نگاری
06.08 : مولوی عبدالحق کے متفرق کارنامے
06.09 : چند ہم عصر اور لغت نویسی
06.10 : خلاصہ
06.11 : فرہنگ
06.12 : سوالات
06.13 : حوالہ جاتی کتب

06.01 اغراض ومقاصد

مولوی عبدالحق ایک نامور ادیب، محقّق، نقّاد، مرقّع نگار، ماہر دکنیات، لغت نویس، قواعد نویس اور ادیب وصحافی تھے۔ اُردو زبان و ادب کی تاریخ میں وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے ادب کے مختلف صیغوں کو فکر وخیال کے اظہار کا وسیلہ ہی نہیں بنایا، اُردو کی توسیع وترقی کے لئے عملاً اپنی خدمات کو پوری طرح وقف بھی کر دکھایا۔ وہ اُردو کے پرستار ہی نہ تھے، اُردو کی ایک تحریک بھی تھے۔ مولوی عبدالحق کی ادبی شخصیت کی مندرجہ بالا جہات سے روشناس کرانا ہی اس سبق کا مقصد ہے تا کہ اُردو طلبا مولوی عبدالحق صاحب کی گراں قدر خدمات کے بارے میں علم حاصل کر سکیں۔ اس سبق کے بعد طلبا درج ذیل معلومات سے بھی بہرہ اندوز ہو جائیں گے:

﴿۱﴾ مولوی عبدالحق: سوانح وشخصیت ﴿۲﴾ انجمن ترقی اُردو اور مولوی عبدالحق ﴿۳﴾ جامعہ عثمانیہ اور مولوی عبدالحق
﴿۴﴾ مولوی عبدالحق کی متنی تنقید ﴿۵﴾ مولوی عبدالحق کی تنقید نگاری ﴿۶﴾ مولوی عبدالحق کے متفرق کارنامے
﴿۷﴾ چند ہم عصر اور لغت نویسی

06.02 تمہید

مولوی عبدالحق کی ادبی اور عملی شخصیت کے کئی پہلو تھے۔انہوں نے ایک ایسے عہد میں اپنا ادبی سفر شروع کیا جب ادبی سطح پر تو اُردو معاشرہ سرگرم تھا لیکن اُردو زبان کے تحفّظ اور اس کی ترقّی کی طرف کسی کی توجّہ نہ تھی۔انہیں اس بات کا شدید احساس تھا کہ اُردو علم وادب کی روایت صدیوں پر محیط ہے۔ ہندوستان کی سرزمین پر اُردو کے اَنکُر پھوٹے اور یہیں وہ پروان چڑھی۔اُردو زبان وادب کا سرمایہ انتہائی قیمتی اور ثروت مند ہے۔ یہ ایک قومی میراث ہے جس کے تحفّظ ،توسیع اور ترقّی کی ذمّے داری ہم سب پر فرض ہے۔انہیں کسی بھی زبان سے کوئی کدورت نہ تھی اُردو کو ایک تحریک کی شکل دینے کے باوجود وہ کبھی لسانی تعصّب کا شکار نہ ہوئے۔انہوں نے محسوس کیا کہ بہت سے گوشے ایسے ہیں جو ابھی ہماری توجہ کے مستحق ہیں جیسے اُردو تحقیق کی رفتار بے حد سُست ہے۔ بالخصوص دکنی ادبیات کے سلسلے میں تحقیق وتدوین کے کام میں بھی تیزی نہیں آسکی۔مولوی عبدالحق سے قبل محی الدین قادری زور،عبدالقادر سروری اور نصیرالدین ہاشمی نے جو کام کیے تھے وہ بھی بے حد قیمتی ہیں لیکن مخطوطات کا ایک بڑا سرمایہ اب بھی اربابِ علم کی توجّہ کا مستحق تھا، یہ ایک بے حد دِقّت اور صبر طلب کام تھا۔تحقیق کا عمل یوں بھی صبر طلب ہوتا ہے۔تحقیق اسی کا منصب بھی بن سکتی ہے جس میں خدمت کا جذبہ ہو،ادبی تاریخ کا جسے گہرا علم ہو، بے لوثی جس کی فطرت میں ہو، دلیل وتعقّل اور معروضیت سے جس کا سروکار ہو۔ یہ تمام چیزیں مولوی عبدالحق میں یکجا تھیں۔

مولوی عبدالحق ایک نقّاد بھی تھے لیکن وہ اصلاً میدانِ تحقیق کے مرد تھے۔آپ نے کئی تذکروں کی تدوین کی اور ان کے تقابلی مطالعے کیے۔کئی ادبی رسائل کی ادارت کی اور اربابِ فکر ونظر کو تحقیق وتنقید کی طرف مائل کرنے کی کوشش کی۔شمالی ہند کے بعض دواوین اور کلاسیکی تصنیفات جیسے دریائے لطافت (انشا اللہ خاں انشؔا) کی تدوین کی۔علاوہ ان کے دکنی ادبیات کی تحقیق وتدوین کو انہوں نے اپنا خاص مشن بنا لیا تھا۔مولوی صاحب نے ان مخطوطات کو ڈھونڈھ نکالا جن کے محض ناموں ہی سے اُردو دنیا واقف تھی۔مولوی صاحب نے ان کی تدوین کی، مقدمات لکھے،فرہنگ تیار کیں۔ یہ محض تحقیق کی گراں قدر مثالیں نہیں ہیں بلکہ ان کا شمار متنی تنقید میں بھی کیا جاسکتا ہے۔مولوی عبدالحق نے خاکے لکھے،میرؔ کی غزلوں کا انتخاب مقدمے کے ساتھ ترتیب دیا،اُردو کے مقصد کو ایک مشن اور ایک تحریک میں بدلا۔انجمن ترقّی اُردو کی تصوّر سازی بھی کی اور اسے ایک عملی صورت بھی بخشی۔۱۹۴۸ء میں وہ پاکستان منتقل ہوگئے،لیکن انجمن ترقی اُردو کی بنیادیں اتنی مستحکم تھیں کہ وہ آج بھی قائم ہے۔مختلف صوبوں میں اس کی کئی شاخیں قائم ہیں اور اپنے اپنے طور پر اُردو کی توسیع وترقی کے عمل پر کاربند ہیں۔

06.03 مولوی عبدالحق سوانح وشخصیت

مولوی عبدالحق ۱۸۷۰ء میں ہاپوڑ (اتر پردیش) کے نزدیک سراوہ نام کی ایک چھوٹی سی بستی میں پیدا ہوئے۔گویا محمود شیرانی ۱۸۸۰ء مسعود حسن رضوی ۱۸۹۳ء، قاضی عبدالودود ۱۸۹۷ء اور امتیاز علی عرشی ۱۹۰۴ء جیسے محققین میں وہ سب سے سینئر ہیں۔ان تمام محققین کے تحقیق و تدوین کے کام بلاشبہ بڑے وقیع ہیں۔مولوی صاحب کی شخصیت کئی گوشوں میں بٹی ہوئی تھی۔انہوں نے وہ کام کرنے کی ٹھانی جن کو تا ہنوز کسی نے توجہ کے لائق نہیں سمجھا تھا۔شمالی ہند کے کسی محقّق نے دکن کے اس قیمتی سرمائے کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا جو گرد وغبار سے اَٹا ہوا تھا اور انسانی لمس کا منتظر تھا۔ وہ مولوی صاحب ہی تھے جنہوں نے محض کسی ایک موضوع پر اکتفا نہیں کیا۔ان کی عاشقی صبر طلب تھی اور تمنا بے تاب جو انہیں کھینچ کر جنوبی ہند کی سرزمین کی طرف لے گئی۔ جہاں انہوں نے ہر آرام وآسائش سے پرے ہوکر دربدری کو حاصل زندگی بنا

لیا۔مولوی صاحب کے طفیل اُردو ادب کی تاریخ پہلے سے زیادہ ثروت مند ہوئی اور بعض دوسرے حضرات بھی دکنی ادب کی تلاش وجستجو کی طرف راغب ہوئے لیکن مولوی عبدالحق جیسی بے لوثی، اُن جیسا جذبۂ خدمت بے مثال ہے۔

عبدالحق کے والد کا نام شیخ علی حسین تھا جو ۱۸۸۵ء میں اِس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے اس وقت عبدالحق کی عمر پندرہ سال کی تھی۔ سراوہ گاؤں یا ہاپوڑ میں اعلیٰ تعلیم کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ابتدائی تعلیم کے بعد انہیں فیروز پور (پنجاب) منتقل ہونا پڑا۔ جہاں انہوں نے مڈل تک تعلیم پائی، بعد ازاں ۱۸۸۸ء میں وہ اعلیٰ تعلیم کی غرض سے علی گڑھ چلے آئے۔ جہاں جاننے اور سیکھنے کی تڑپ میں اور شدّت پیدا ہو گئی۔ علی گڑھ آہستہ آہستہ تعلیم کا بہت اہم مرکز بنتا جا رہا تھا۔سرکاری تعاون کے علاوہ مختلف صوبوں کے زمین داروں، جاگیرداروں اور تعلقہ داروں نے بھی سرسید کے مشن کو تقویت پہنچائی۔ بھوپال، حیدرآباد اور رام پور کے نوابوں نے بھی خاطر خواہ دامے درہمے مدد کی۔آغاز میں ایم.او.کالج علی گڑھ میں ان بچوں کے داخلے زیادہ ہوئے جو ترقی پسند خیالات کے حامل تھے اور جو وقت کے تقاضوں کی فہم زیادہ رکھتے تھے۔عبدالحق کے گھرانے کا رجحان دین کی طرف زیادہ تھا لیکن جدید تعلیمات کی طرف علی گڑھ نے انہیں بھی راغب کیا۔

مولوی عبدالحق اس وقت علی گڑھ وارد ہوئے جب علی گڑھ تحریک اپنے عروج پر تھی۔ جہاں ملک کے مختلف صوبوں کے طلبا کے خیالات اور ان کے ذوق وشوق کا یہیں علم ہوا۔ پروفیسر آرنلڈ، سرسید، حالؔی اور شبلؔی کی صحبتیں بھی انہیں میسر آئیں۔سرسید کی شخصیت، ان کی بے لوثی، قوم کے درد، جذبۂ خدمت، منصوبہ سازی اور اس کے اطلاق کے طریقوں سے وہ بے حد متاثر ہوئے۔انہوں نے محسوس کیا کہ یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم جیسی قدروں سے سرسید کی شخصیت کی تشکیل ہوئی ہے۔یہی وہ قدریں ہیں جنہیں عبدالحق نے بھی اپنی گرہ میں باندھ لیا اور تا زندگی انہیں پر قائم رہے۔سرسید کے تحقیق وتدوین کے کاموں سے بھی وہ بے حد متاثر ہوئے بلکہ اُردو تحقیق وتدوین کی تاریخ میں اپنے لئے ایک مستقل جگہ بنائی۔حالؔی کے صبر وتحمّل، ایثار نفسی، سادگی وبردباری کے جوہر نے عبدالحق کے طرزِ زندگی کو بھی ایک خاص سانچے میں ڈھال دیا۔حالؔی کے اندازِ نثر سے وہ اس قدر متاثر ہوئے کہ یہی اندازِ نثر ان کی تحریروں کی بھی ایک واضح شناخت کہلاتا ہے۔

عبدالحق گریجویشن کر کے بمبئی میں محسن الملک کے سیکریٹری بنے۔بعد ازاں حیدرآباد میں ''افسر'' کی ادارت کی، اُردو لغت کی تیاری ان کے سپرد کی گئی۔ترجمے کے کام پر مامور ہوئے۔جامعہ عثمانیہ کی بنیاد سازی میں بھی ان کی مساعی کا خاص دخل رہا۔دکن کی سرزمین انہیں اس قدر راس آئی کہ انہوں نے عمرِ عزیز کا ایک بڑا دَور وہاں گزار دیا۔عبدالحق کی ذہن سازی جس طور پر سرسید وشبلؔی کے ذریعے ہوئی تھی اسی نے انہیں ایک ایسے صاحبِ عمل کردار میں بدل دیا جس کا مقصدِ حیات صرف اور صرف اُردو کی ترویج واشاعت کو مختص ہو کر رہ گیا۔

ایجوکیشنل کانفرنس کے تحت انجمن ترقی اُردو ۱۹۰۲ء میں قائم ہوئی جس کے پہلے معتمد کے طور پر شبلؔی نعمانی مقرّر رہوئے۔ان کے بعد مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی اور پھر عزیز مرزا۔چوتھے معتمد کے طور پر ۱۹۱۲ء میں عبدالحق کا جب تقرّر رہوا تو انجمن کی سست رفتاری میں تیزی آ گئی۔مولوی عبدالحق اورنگ آباد میں محکمۂ تعلیمات میں سرگرم کار تھے۔۱۹۴۲ء میں گورنمنٹ کالج میں پرنسپل کے عہدے پر ان کا تقرّر رہو گیا۔ ۱۹۲۹ء میں سبکدوش ہونے کے بعد جامعہ عثمانیہ میں اُردو کے استاد ہوئے۔انہوں نے اورنگ آباد ہی میں انجمن کا دفتر قائم کیا اور ۱۹۲۹ء تک یہیں خدمات انجام دیتے رہے۔ بعد ازاں دِلّی میں انجمن کے ساتھ منتقل ہو گئے۔آزادی کے بعد کراچی چلے گئے جہاں آخر تک اس سے وابستہ رہے۔

مولوی عبدالحق نے اُردو زبان کی ترقّی وتحفّظ کے لئے اپنے آپ کو پوری طرح وقف کر دیا تھا۔ان کی غیر معمولی خدمات کے پیشِ نظر انہیں ''بابائے اُردو'' کے اعزاز سے بھی سرفراز کیا گیا،جس کے وہ مستحق تھے۔عبدالحق پاکستان میں بھی آخر عمر تک اُردو کی ترویج واشاعت کے لئے کوشاں رہے۔آزادی کے بعد ان کا سارا وقت کراچی میں گزرا اور وہیں پیوندِ خاک ہوئے۔

06.04 انجمن ترقی اُردو اور مولوی عبدالحق

مولوی عبدالحق اور انجمن ترقّی اُردو دونوں لازم وملزوم ہیں۔انجمن سے قبل مجلس تحفظ اُردو (Urdu Defence Association) کے مقاصد میں اُردو کی ترقی وتوسیع کا مقصد سرِ فہرست تھا،لیکن مجلس ایک تحریک میں نہیں بدل سکی۔محسن الملک نے اس سلسلے میں جو مساعی کی تھیں وہ بھی بارآور ثابت نہیں ہوسکیں۔ان کے صدارت کے عہدے سے سبک دوش ہونے کے بعد مجلس منتشر ہوکر رہ گئی۔مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سولہواں اجلاس جب دہلی میں منعقد ہوا تو شدّت کے ساتھ اُردو کے کاز پر بحث ہوئی اور انجمن ترقّی اُردو ۱۹۰۲ء کے نام سے ایک نئے شعبے کا قیام عمل میں آیا۔شبلی جس کے پہلے سکریٹری مقرر ہوئے۔انجمن کا جو لائحۂ عمل تیار کیا گیا تھا اس میں اُردو کی ترویج واشاعت،اس کے تحفّظ اور ترقّی وتوسیع کے مقاصد کو خاص اہمیت دی گئی۔انجمن کا ایک بڑا مقصد یہ بھی تھا کہ وہ ایک تحریک کے طور پر ملک گیر پیمانے پر لسانی بیداری کا کام کرے گی۔اس کے عہدیداران میں اپنے دَور کی قابلِ ذکر شخصیات شامل تھیں:

﴿۱﴾ پروفیسر تھامس آرنلڈ صدر ﴿۲﴾ شمس العلماء مولوی نذیر احمد نائب صدر

﴿۳﴾ شمس العلماء مولوی ذکاءاللہ نائب صدر ﴿۴﴾ مولانا الطاف حسین حالؔی نائب صدر

﴿۵﴾ شمس العلما شبلی نعمانی سیکریٹری

شبلی نے ''انجمن'' کی بنیادوں کو مستحکم کیا۔وہ ایک عالم تھے اور ان کے پاس کئی منصوبوں کا خاکہ تیار تھا۔بالخصوص ''سیرت النبی ﷺ'' کو وہ مکمل کرنے کے درپے تھے۔انہوں نے تقریباً دو برس تک انجمن کو ایک ایسے مقام پر پہنچا دیا تھا کہ بعد کے مراحل طے کرنا اتنا مشکل نہ تھا، لیکن اس کے لئے جس سوزِ دل اور سوزِ جاں کی ضرورت تھی وہ دوسروں میں پیدا کرنا آسان نہ تھا۔شبلی نے دوسری مصروفیتوں کے پیشِ نظر ۱۹۰۵ء میں استعفیٰ دے دیا۔شبلی کے بعد حبیب الرّحمٰن شیروانی کو سیکریٹری بنایا گیا،جو ۱۹۱۰ء تک اپنے عہدے پر قائم رہے۔ان کے بعد مولوی عزیز مرزا اور پھر ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے سجاد مرزا بیگ نے یہ عہدہ سنبھالا لیکن شبلی کے بعد سست رفتاری کا سلسلہ قائم رہا۔بالآخر ۱۹۱۲ء میں معتمد (سیکرٹری) کے طور پر مولوی عبدالحق کو مقرّر کر دیا گیا۔مولوی عبدالحق نے سرسید اور شبلی کے کام کرنے کے طریقوں کا بغور مشاہدہ کیا تھا۔انہیں اس بات کا علم واحساس تھا کہ کوئی بھی مقصد روز وشب کی جاں فشانی اور قربانی کے بغیر حاصل نہیں کیا جاسکتا۔

عبدالحق ابھی ۲۷/ برس ہی کے تھے۔انہوں نے ایک مضبوط اور ہمہ جہت لائحۂ عمل بنایا۔سرسید کی طرح اپنے حوصلوں کو قائم رکھا۔ انجمن میں جو اضمحلال اور گرانی پیدا ہوگئی تھی اس کے اسباب پر مسلسل غور کیا،مالیات کے مسئلے کو بھی پیشِ نظر رکھا کیوں کہ شبلی کے بعد یہی وہ مسائل تھے جن کے باعث انجمن زوال کے کگار پر تھی۔عبدالحق نے علی گڑھ یا دہلی کے بجائے اورنگ آباد ہی میں اس کا دفتر قائم کیا کیوں کہ وہ ان دنوں محکمۂ تعلیمات سے منسلک تھے اور سبک دوشی کے بعد وہیں گورنمنٹ کالج کے پرنسپل مقرّر کر دیے گئے تھے۔علاوہ اس کے ان کا ایک اہم مقصد یہ بھی تھا کہ انجمن ایک تحریک کے منصب پر پورا اُترے۔

اس لئے انہوں نے ملک گیر سطح پر اس کی شاخیں قائم کرنے کی طرف توجہ دی۔ اورنگ آباد کو مستقر بنانے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ وہ دکن کے ان بیش قیمت مخطوطات کا پتہ لگا سکیں اور ان کی تدوین کر سکیں جو تا ہنوز پردۂ خفا میں تھے اور جن کی تحقیق وتدوین سے تاریخ اُردو ادب کو زیادہ سے زیادہ ثروت مند بنایا جا سکتا ہے۔ اُردو کی تین سو برس کی روایت پوری ایک تاریخ تھی، جس کی کڑیاں بکھری ہوئی تھیں۔ عبدالحق نے انجمن سازی کے ساتھ تاریخ کے اس تقاضے کو بھی اپنا مطمحِ نظر بنایا۔

ابتدائی سطح پر حیدرآباد اور پٹنہ میں اس کی شاخیں قائم ہوئیں۔ دِلّی کالج اور سرسید نے تراجم کی جو روایت قائم کی تھی۔ انجمن نے اس سلسلے کو برقرار رکھا۔ عبدالحق کی سربراہی میں انجمن نے جو منصوبہ بنایا تھا اسے وہ درجہ بدرجہ عملی صورت بھی دیتی گئی۔ مثلاً:

﴿۱﴾ مختلف علوم کی کتابوں کے تراجم کرائے گئے اور ان کی اشاعت کی گئی۔ ﴿۲﴾ ''تذکرۂ شعرائے اُردو'' کی ترتیب وطباعت کی گئی۔ ﴿۳﴾ اصطلاحات سازی کی طرف توجہ دی گئی۔ ﴿۴﴾ طریقۂ تعلیم کی اصلاح اور نئی تدابیر سازی کے تحت طریقۂ ہجّا کی اصلاح اور اعراب کے استعمال کے صحیح اور سہل طریقے پر زور دیا گیا۔ ﴿۵﴾ لوگوں کے قومی وملی جذبات کو اُبھار کر مالی تعاون کی سبیل نکالی گئی جو بے حد کارگر ثابت ہوئی۔ ﴿۶﴾ اُردو زبان کو عمومی سطح پر رواج دینے اور اُردو تعلیم کے فروغ کی ضرورت پر اصرار کیا گیا۔ ﴿۷﴾ ہر سال متعدّد علمی کتابیں لکھوائی گئیں۔ اصولِ وضع اصطلاحاتِ علمیہ، علم حشرات الارض جیسی کتابیں بھی اسی سلسلے کی کڑی ہیں۔ ﴿۸﴾ ادبی کتابوں میں نکات الشعرا (میر) مثنوی خواب وخیال، قواعدِ اُردو، انتخابِ میر، کلیات ولی، تاریخ ادبیاتِ ایران، ذکر میر وغیرہ معہ مقدمات شائع ہوئے۔

مولوی عبدالحق نے کئی دکنی نایاب کتابیں شائع کیں۔ انجمن کے جتنے منصوبے تھے وہ انہیں کے وضع کردہ تھے۔ انہوں نے دارالعلوم کے نصاب کی روشنی میں مختلف علوم پر کتابیں تیار کروائیں تاکہ طلبا کو وہ دستیاب ہو سکیں۔ مولوی صاحب کا دائرۂ کار وسیع تھا اور ان کے حوصلے ہمیشہ تازہ دَم رہے۔ ۱۹۴۸ء میں جب وہ کراچی چلے گئے اُردو کی ترقّی وترویج کے سلسلے کو بڑے جوش وخروش کے ساتھ وہاں بھی جاری رکھا۔

06.05 جامعہ عثمانیہ اور مولوی عبدالحق

مولوی عبدالحق صاحبِ علم وعمل اور صاحبِ کردار تھے۔ ان کے سامنے مقاصد کی لمبی فہرست تھی اور ہر مقصد ان کے نزدیک وقت کی اہم ضرورت کے طور پر تھا۔ وہ ایسے انسان نہ تھے جو راستے کی رکاوٹوں اور مشکل ترین مراحل کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتے۔ موسم کتنا ہی سخت ہو، اور مسائل کتنے ہی پیچیدہ ہوں، ان کے لئے استقلال واستقامت نسخۂ کیمیا تھا۔ اسی نسخۂ کیمیا کو انہوں نے چراغِ راہ نما بنایا اور تیز گامی سے مفر اختیار نہیں کیا۔ مولوی عبدالحق نے دکن کی سرزمین کو اس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک وہاں جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں نہیں آیا۔

انہوں نے دکنی مخطوطات کی تلاش وتعارف کو مقصدِ زیست بنا لیا تھا۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایک کے بعد کئی مخطوطوں کی چھان پھٹک کی۔ ان کے ذہن میں اُردو کے تحفّظ، ترقّی اور اشاعت کے لئے ہمیشہ کوئی نہ کوئی منصوبہ ہوتا۔ انہیں منصوبوں میں جامعہ عثمانیہ کا منصوبہ بھی ان کی ذہنی اختراع تھا۔ انہوں نے اُردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے پر زور دیا۔ سرسید اُردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے لئے اس وجہ سے تیار نہ تھے کہ اُردو میں علمی کتابوں کا فقدان ہے۔ عبدالحق نے وضع اصطلاحات کو ترجیح دی اور علمی کتابوں کے ترجمے کرائے تاکہ اعلیٰ تعلیم کا منصب پورا ہو سکے۔ عبدالحق وہ پہلے مدبّر تھے جنہوں نے ''مادری زبان'' کو ذریعۂ تعلیم بنانے پر اصرار کیا اور نظام سرکار کو قائل کر کے رہے۔

عبدالحق نے جامعہ عثمانیہ کا جو خاکہ بنایا تھا اسی کے تحت:

﴿۱﴾ جامعہ عثمانیہ میں اُردو کو ذریعۂ تعلیم بنایا گیا۔

﴿۲﴾ وضع اصطلاحات کے لئے کمیٹی قائم کی گئی۔

﴿۳﴾ تراجم کے لئے ''دارالترجمہ'' جیسا شعبہ قائم کیا گیا۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں، مولوی عبدالحق ہی کو جامعہ عثمانیہ کا بنیاد گزار قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں عثمانیہ یونی ورسٹی کا اصل بانی مولوی عبدالحق کو سمجھتا ہوں۔ جب حیدر نواز جنگ (سر اکبر حیدری) ایجوکیشنل سکریٹری ہوئے تو مولوی عبدالحق جو اُن کے مزاج میں دخیل تھے۔ اُردو زبان کے ذریعے سے اعلیٰ تعلیم دینے کی تجویز ان کے رُوبرو پیش کی۔ حیدر نواز جنگ کی تحریک پر میر عثمان علی خاں نظام ریاستِ حیدرآباد نے اس تجویز کو شرفِ قبولیت بخشا۔''

(بابائے اُردو مولوی عبدالحق کی خدمات قیامِ اورنگ آباد کے دوران: ڈاکٹر مسرّت فردوس، ص..۳۸۱)

مولوی عبدالحق کے علاوہ اور بھی کئی اہم شخصیات یونی ورسٹی کے قیام کا خواب دیکھ رہی تھیں۔ لیکن سرکارِ عالیہ کو اس کے لئے تیار کرنے کا سہرا بابائے اُردو کے سر ہی جاتا ہے۔ بابائے اُردو محکمۂ تعلیمات کے مختلف عہدیداروں کی ذہن سازی کرتے رہے۔ نصابات اور اصلاحِ تعلیم کے سلسلے میں مسلسل کوشاں رہے۔ سر اکبر حیدری کی مساعی اس ضمن میں ناقابلِ فراموش ہیں لیکن مولوی عبدالحق اگر ان کی مہم میں پیش پیش نہ ہوتے تو اس خواب کو پایۂ تعبیر تک پہنچنے میں کچھ اور وقت لگ سکتا تھا۔ سر اکبر حیدری نے اس تاثر کا اظہار کرتے ہوئے عبدالحق کی عملی جدوجہد کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اُردو ذریعۂ تعلیم کی جامعہ قائم کرنے کی سب سے مؤثر مہم حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کی جانب سے چلائی گئی۔''

اس ضمن میں حبیب اللہ رشدی کا بھی یہی کہنا ہے کہ ''جامعہ کا نام بھی مولوی صاحب کے دماغ کا اختراع تھا۔'' (مولوی عبدالحق کی خدمات)۔ بعض لوگوں نے جامعہ کے لئے نظام یونی ورسٹی یا حیدرآباد یونی ورسٹی تجویز کیا لیکن بابائے اُردو کا تجویز کردہ عثمانیہ یونی ورسٹی نام ہی میر عثمان علی خاں فرماں روائے دکن کو پسند آیا جس سے ان کی دل چسپی تادمِ آخر قائم رہی۔ ۲۸/اگست ۱۹۱۹ء کا دن حیدرآباد کی تاریخ میں یادگار کہلائے گا کہ اسی دن عثمانیہ کا افتتاح ہوا۔ عبدالحق یونی ورسٹی کی ہر کمیٹی میں شریک کار رہے۔ سید ساجد علی نے اس سلسلے میں لکھا ہے:

''مولوی صاحب میں کام کرنے والوں کو جمع کرنے کا بڑا ملکہ تھا۔ چناں چہ جب جامعہ عثمانیہ کو معلّمین کی ضرورت ہوئی تو پورے ہندوستان کو چھان مارا اور جہاں سے جو ڈھب کا آدمی ملا اسے بلا لیا مگر چوں کہ اُردو زیادہ تر یوپی اور پنجاب کی زبان تھی۔ اس لئے دو صوبوں سے زیادہ موزوں اشخاص فراہم ہوئے۔''

(بابائے اُردو مولوی عبدالحق کی خدمات قیام اورنگ آباد کے دوران: ڈاکٹر مسرت فردوس، ص...۳۹۰)

ڈاکٹر مسرّت فردوس بھی اس ضمن میں لکھتی ہیں:

''جامعہ عثمانیہ اور اس کے نصابی اغراض اور امتحانات سے لے کر دارالترجمہ اور اس کے توسط سے نصابی کتابوں کی اشاعت غرض ہر معاملہ میں مولوی عبدالحق کی بھرپور نمائندگی کی وجہ سے جامعہ عثمانیہ اور دارالترجمہ کی ایک ایسی ہیئت تھی جس پر آج بھی اُردو دنیا کے افراد فخر کرتے ہیں۔ یہ تمام کارنامے مولوی عبدالحق کی توجہ کے مرہونِ منّت تھے۔''

(ایضاً،ص۳۹۱....۳۹۲)

مولوی عبدالحق نے عثمانیہ یونی ورسٹی کے لئے جو کام انجام دیے۔حسب ذیل ہیں:

﴿۱﴾علمی کتابوں کے تراجم پر زور دیا اور تقریباً ہر جدید علم کی کتاب کا ترجمہ کرایا۔اس کے لئے دارالترجمہ نے باقاعدہ اصول مرتب کیے۔عبدالحق جس میں پیش پیش تھے۔

﴿۲﴾اصلاحِ نصاب کی ضرورت اور اہمیت کی طرف توجہ دلائی۔

﴿۳﴾وضعِ اصطلاحات کو وقت کی ایک اہم ضرورت اور ایک اہم تقاضے کے طور پر اخذ کیا اور اس کے لئے کمیٹی بنائی۔مولوی عبدالحق نے جس کے لئے ملک کے دیگر علاقوں سے ماہرین کو دعوت دی۔

﴿۴﴾اُردو لغت تیار ہوئی لیکن طباعت سے قبل ہی تقسیم وطن کے فسادات کی نذر ہوگئی لیکن بعض مضبوط و مقفل الماریوں میں اس کے مسودات بچ گئے تھے۔انہیں کو از سرِ نَو ترتیب دینے کی کوشش کی گئی۔تاہم یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔

اورنگ آباد سے سبک دوش ہونے کے بعد عثمانیہ یونی ورسٹی میں صدر شعبۂ اُردو کے طور پر ان کا تقرّر رہوگیا۔جہاں وہ ترجمے اور لغت کے کاموں کے علاوہ مجلسِ تحقیقات علمیہ کے نگراں بھی تھے۔جس کے تحت شیخ چاند کا اہم تحقیقی کارنامہ ''سودا'' ۱۹۳۶ء شائع ہوا۔رسالہ ''جریدہ'' کا اجرا عمل میں آیا۔مولوی صاحب کا کتابچہ ''اُردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا حصہ'' کی اشاعت بھی اسی کے تحت عمل میں آئی۔اس طرح ''بابائے اُردو'' کی جدوجہد سرسید کی جدوجہد کے سلسلے ہی کی ایک کڑی ہے۔نہ تو سرسید کا پھر کوئی ثانی پیدا ہوا اور نہ عبدالحق کے بعد عبدالحق ثانی کی کوئی صورت پیدا ہوئی۔

06.06 مولوی عبدالحق کی متنی تنقید

متنی تنقید کو انگریزی میں **Textual-Criticism** کہتے ہیں۔تنقید اور تحقیق ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ایک محقّق میں اگر تنقیدی بصیرت ہے تو وہ قدرے بہتر طور پر اپنے دلائل کو ایک خاص تنظیم دے سکتا ہے اور بڑی حد تک قابل قبول نتائج تک پہنچ سکتا ہے۔تنقید نگار کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ وہ متن کے صحیح رغلط یا غیر الحاقی ہونے کا پہلے پتہ لگائے جیسے سوداؔ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کے کلیات میں الحاقی کلام کی کثرت ہے۔جس کی طرف کئی محققین نے اشارے بھی کیے ہیں۔اسی طرح معین الدین عقیل اور کالی داس گپتا رضا نے غالبؔ کے کلام کو تاریخ وار ترتیب دینے کی کوشش کی ہے جس کے بعد یہ واضح ہوگیا ہے کہ کون سی غزلیں ۱۸۵۷ء سے قبل کی ہیں اور کن کا تعلق بعد کے زمانے سے ہے۔اس تحقیق سے پہلے اکثر نقّادوں نے غالبؔ کے بہت سے اشعار کو ۱۸۵۷ء کے سانحے کا نتیجہ بتایا تھا۔جو

غلط ثابت ہوا۔متنی نقّاد متن کو اوّلیت دیتا ہے۔دوسرے قلمی نسخوں یا مطبوعات سے تقابل کر کے متن کو حتمی شکل دینے کی کوشش کرتا ہے۔اگر چہ سرسید پہلے متنی نقّاد ہیں لیکن انہوں نے ادبی نسخوں کی تدوین نہیں کی تھی۔پھر بھی متنی تنقید کی تاریخ میں ان کی حیثیت نقشِ اوّل کی ہے۔مولوی عبدالحق (بابائے اُردو) نقشِ ثانی ہیں۔سحر انصاری نے انہیں سرخیل یعنی نقیب یا پیش سوار کہا ہے۔

وہ لکھتے ہیں:

''اُردو کا خاصا بڑا سرمایہ قلمی کتب اور خطی نسخوں پر مشتمل ہے۔بیسویں صدی کا اُردو ادب اس اعتبار سے بھی یاد رکھا جائے گا کہ اس کے اکابر اہلِ قلم اور محقّقین نے ترتیبِ متن کے شاندار کارنامے انجام دیے اور اسی ضمن میں متنی تنقید کی بھی ایک مستحکم روایت قائم ہوئی۔اکابرِ ادب و تحقیق میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق کا نام بہت اہمیت کا حامل ہے۔متنی تنقید کے سلسلے میں مولوی عبدالحق کو اعلیٰ مقام حاصل ہے جو کسی سرخیل کے حصّے میں آتا ہے۔''

(تحقیق وتدوین،سمت ورفتار:ص..۳۰۱)

مولوی عبدالحق نے قدیم قلمی نسخوں کی جو چھان پھٹک کی تھی اور انہیں زیادہ سے زیادہ صحت و درستی کے ساتھ ازسرِ نَو مرتب کرنے کی کوشش کی تھی اسے ان کی تحقیقی وتنقیدی بصیرت کے ساتھ مربوط کر کے دیکھنا چاہیے۔قدیم مخطوطات کے زیادہ تر نسخے بوسیدہ اور جگہ جگہ سے مسخ بھی تھے۔املا کو سمجھنے کے لئے بھی ایک خاص اہلیت کی ضرورت ہے اور سب سے اہم بات یہ کہ مختلف مطبوعات یا قلمی نسخوں کے حصول اور ان کے تقابل کے بغیر کسی ایک بے میل متن کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔عبدالحق نے تدوین کی اصول سازی نہیں کی اور نہ مغربی اصولوں کا انہیں علم تھا۔ان میں فطری صلاحیت تھی،صحیح اور غلط کو سمجھنے کی فہم تھی،امتیازات قائم کرنے کی اہلیت تھی اور فیصلہ کرنے کی قابلیت تھی۔یہی سبب ہے کہ انہیں کسی پیش رو اصول کو رہ نما بنانے یا اس سے کسبِ فیض کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔مظفر علی سید نے یہ درست لکھا ہے کہ متن کی تدوین کا فن صرف اصولوں کی پابندی سے ادا نہیں ہوتا۔بقول ''جمیل جالبی'' دنیا کے سارے اصول بے معنی اور بیکار ہیں جب تک ان اصولوں پر چلنے والوں میں پیدا شدہ صلاحیت،کام کرنے کی دُھن اور اپنی منزل تک پہنچنے کا عزم نہ ہو۔'' مولوی عبدالحق کے درج ذیل متنی تنقید کے کارنامے اسی طرح کی صلاحیت،اہلیت اور قابلیت کے مظہر ہیں:

نکات الشعرا (میر تقی میرؔ)،تذکرہ ریختہ گویاں (سید فتح علی گردیزی)،مخزن نکات (قائمؔ چاند پوری)،گل عجائب (تمنّاؔ اورنگ آبادی)،عقد ثریا،تذکرہ ہندی،ریاض الفصحا (مصحفیؔ)،مخزن الشعرا (نورالدین فائق) قطب مشتری،سب رس (مُلّا وجہیؔ)،چمنستانِ شعرا (شفیقؔ اورنگ آبادی)،کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی (انشا اللہ خاں انشاؔء)،دریائے لطافت (انشاؔ)،خواب و خیال (میر اثرؔ)،ذکر میر (میر تقی میرؔ)،معراج العاشقین جسے خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے نام سے اس اشتباہ کے ساتھ مرتب کیا کہ امکان ہے یہ ان کا کارنامہ نہ ہو۔حفیظ قتیل نے اسے مخدوم شاہ حسینی کا کارنامہ ثابت کیا ہے۔عبدالحق نے دیوانِ اثر (میر اثرؔ) اور عبدالحئ تاباں کا دیوان بھی مرتب کیا ہے۔جنگ نامۂ عالم علی خاں (غضنفر حسین) وغیرہ جیسے تدوین

کے کاموں کی ایک لمبی فہرست ہے۔عبدالحق نے اپنی عمرِ عزیز کا ایک بڑا حصّہ ان نسخوں کی دریافت میں کھپایا تھا۔جوان کی لگن اور تڑپ کو ظاہر کرتے ہیں۔

سحر انصاری نے ان کے بنیادی متن کو اہمیت دینے کے رویّے پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

''مولوی عبدالحق ایک متنی نقاد اور محقق کی بیش تر صفات سے متّصف تھے۔سب سے پہلی خوبی تو یہ تھی کہ غیر جذباتی ہوکر پوری لگن اور انہماک سے کام کرتے تھے جسے پتّا مارنے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔اس کے علاوہ نظم ونثر کے تمام اصناف واسالیب سے انہیں گہری واقفیت تھی۔تہذیب،تاریخ،زبان،قواعد صرف ونحو، اشتقاقیات،تنقید وتحقیق کے اصول۔یہ سب کچھ ان کی علمی وتحقیقی کاوشوں کا حصّہ تھا۔ٹی.ایس.ایلیٹ نے نقاد کے منصب پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا ہے کہ اسے زیرِ تنقید نظم یا فن پارے کا اس طرح غائر مطالعہ کرنا چاہیے جس طرح ایک منجھا ہوا وکیل اپنے مقدمے کا مطالعہ کرتا ہے۔مولوی عبدالحق کا اندازِ تحقیق بھی ایسا ہی تھا۔وہ ایک وکیل ہی کی طرح متن میں سے بہت سے حقائق اخذ کر لیتے ہیں۔ان کے قیاسات اور فیصلے ذاتی پسند ناپسند پر نہیں بلکہ جرح،تعدیل اور تنقیح کے اصولوں پر مبنی ہوتے تھے۔وہ متن کو جزئیات کی نگاہ سے دیکھتے اور نتائج کے استنباط میں ایسے فقروں کو بھی بہت اہمیت دیتے تھے جو شاید صاحبِ متن کے قلم سے یوں ہی نکل گئے ہوں۔''

(تحقیق وتدوین سمت ورفتار:ص.....۳۰۵...۳۰۶)

اپنی اس رائے کے ثبوت میں انہوں نے اس کی ایک مثال ''نکات الشعرا'' کی تدوین سے پیش کی ہے:

''میر صاحب نے اپنے تذکرے کے سنہ تالیف کے متعلق کہیں کوئی صراحت نہیں کی۔البتہ آنند رام مخلص کے حال میں یہ فقرہ ان کے قلم سے ایسا نکل گیا ہے جس سے اس کی نسبت قیاس قائم ہوسکتا ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ ''قریب یک سال است کہ درگزشت''یعنی جس وقت یہ تذکرہ زیرِ تالیف تھا،مخلص کو مرے ہوئے ایک سال ہوا تھا۔مخلص کا سنہ وفات ۱۱۶۴ھ ہے۔''

(ملاحظہ ہو خزانۂ عامرہ،مطبوعہ نول کشور،ص ۴۲۵)(تحقیق وتدوین،سمت ورفتار:،ص..۳۰۶)

06.07 مولوی عبدالحق کی تنقید نگاری

مولوی عبدالحق کی ادبی شخصیت کئی جہتوں کو محیط تھی۔وہ ایک ممتاز محقّق وتدوین کار ہی نہیں تھے۔ادبی تنقید کا بھی شستہ مذاق رکھتے تھے۔تنقید وتحقیق ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ایک دوسرے کی ضد نہیں۔تنقیدی شعور کے بغیر محقّق اپنے دلائل اور دریافت کردہ نکات کو بہتر طور پر مرتّب ہی نہیں کرسکتا اسے بھی کسی نتیجے پر پہنچنے کے لئے تقابل کے مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے۔گزشتہ دریافتوں کو صحیح وغلط ثابت کرنے کے لئے تنقیدی بصیرت سے کام لینا پڑتا ہے۔

سحر انصاری نے بھی تنقید و تحقیق کے رشتے پر بحث کرتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ:

''ادبی تنقید کے متعدد دبستانوں کی اہمیت کو تسلیم کیا جاتا رہا ہے لیکن کسی تحریر یا تصنیف کے متن (Text) کو اس کی تمام تر صحت کے ساتھ مرتب کرنا علمی و ادبی تحقیق کی دنیا میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ متن کی ترتیب و تدوین کے دوران جس بصیرت، شعور، ندرت فیصلہ کی ضرورت ہوتی ہے، اسی سے تنقید کا وہ رخ سامنے آتا ہے، جسے اصطلاحی طور پر متنی تنقید (Textual-Criticism) قرار دیا گیا۔''

(تحقیق و تدوین سمت و رفتار: ص....۳۰۱)

اُردو تدوین کاری کی تاریخ میں اگر سرسید نقشِ اوّل تھے تو بلاشبہ مولوی عبدالحق نقشِ ثانی تھے۔ محمود شیرانی، قاضی عبدالودود، امتیاز علی عرشی، رشید حسن خاں، حنیف نقوی، مختارالدین آرزو وغیرہ کو خالص تحقیق و تدوین کے زمرے میں رکھا جاسکتا ہے لیکن عبدالحق کا ذہن کئی شعبوں کو محیط تھا۔ وہ محقق و تدوین کار کے علاوہ نقّاد بھی تھے۔ انتخابِ میر کا مقدّمہ، تنقیداتِ عبدالحق کے مضامین، ماورا کے تبصرے میں ن.م. راشد کے زبان و بیان پر اظہارِ خیال، مختلف مدوّن نسخوں میں جو مقدمات ہیں وہ تحقیق و تنقید کے بہترین امتزاج کی مثال ہیں۔

عبدالحق نے تنقید کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے جن اُمور کی طرف اشارہ کیا ہے ان کی معنی خیزی مسلم ہے:

''تنقید پر صرف وہی شخص لکھ سکتا ہے اور دوسروں کو ہدایت کرسکتا ہے جس کا تجربہ وسیع، مطالعہ گہرا اور نظر دور بین ہو، جو صرف ذوق صحیح نہ رکھتا ہو بلکہ دنیائے ادبیات کا شناور ہو جس نے ایک مدّت کے مطالعے اور غور و فکر کے بعد ان اُمور کے متعلق خاص رائے قائم کی ہو اور وہ اس رائے کو بیان کرنے کی قدرت رکھتا ہو، اور دوسروں کے دل نشیں کرسکتا ہو۔''

(اُردو تنقید پر ایک نظر: کلیم الدین احمد، ص...۱۳۳)

گویا مولوی عبدالحق کی نظر میں تنقید ایک بے حد ذمّہ داری کا فن ہے۔ انہوں نے تنقید نگار کے لئے ایک مدت کے مطالعے اور غور و فکر کے بعد ان اُمور کے متعلق خاص رائے قائم کرنے کی بات کہی ہے۔ عبدالحق کا معاصر، پیش رَو اور قدیم شاعری کا مطالعہ گہرا تھا۔ وہ ادب شناسی کا شستہ ذوق رکھتے تھے۔ فوری طور پر محض تاثراتی نوعیت کی رائیں قائم کرنے میں جس طرح کی عجلت سے کام لیا جاتا ہے اور ان آرا کو فیصلہ کن قدر شناسی سے تعبیر کیا جاتا ہے، ایک گم راہ کن عمل ہے۔ عبدالحق نے حالؔی کی تنقید اور بالخصوص حالؔی کی قدر شناسی کے طریق اور ان کی علمی لیکن متاثر کن زبانی بیان کو اپنے رَہ نما اصولوں میں جگہ دی تھی۔ حالؔی کا دائرہ وسیع تھا اور وہ بلاشبہ صاحبِ وِژن (Vision) تھے۔ تنقید میں دلائل کو پورے اعتماد کے ساتھ مرتّب کرنا اور قاری کو اپنی طرف مائل و قائل کرنے کا ان کا اپنا انداز تھا۔ عبدالحق کئی میدانوں کے مرد تھے اس لئے محض تنقید اُن کا مطمحِ نظر نہیں تھا لیکن ان کی ہر تحریر ان کے تنقیدی شعور اور ان کے گہرے مطالعے کی غمّاز ہے۔

مولوی عبدالحق کے عہد میں ادب اور زندگی، ادب اور معاشرے، ادب اور اقتصادیات، ادب اور شخصیت کے رشتے عمومی مباحث کے موضوع تھے۔ حالؔی کے بعد ترقّی پسند تحریک نے ادب اور زندگی، ادب اور سماج کے رشتوں پر مارکسی نظریے کے تحت بحث و مباحثے کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ جدید نفسیات کے تحت ادب اور شخصیت کے مسئلے کو خاص عنوان بنایا گیا۔ مولوی عبدالحق نے کسی تحریک سے روشنی اخذ نہیں کی

اور نہ کسی کو اپنا حوالہ بنایا لیکن ان کی تحریروں میں روحِ عصر، تاریخی پس منظر، شاعر کی شخصیت وسوانح اور اس کے ماحول کو بنیاد بنا کر جو تبصرے و تجزیے کیے گئے ہیں ان سے عبدالحق کے گہرے عصری شعور کا پتہ چلتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ:

﴿۱﴾ پہلے شعر ہے اور اس کے بعد عروض، اس طرح پہلے زبان ہے اور اس کے بعد صرف ونحو ہو یا منطق، عروض ہو یا موسیقی یہ سب ہماری بنائی ہوئی چیزیں ہیں۔ اٹل نہیں، تغیر پذیر ہیں۔ جیسے ن.م.راشد کے مجموعہ کلام ''ماورا'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

''انہوں نے طرزِ بیان اور خیالات میں بھی جدّت دکھائی ہے۔ بعض نظمیں عاری (یعنی بلینک ورس) میں لکھی ہیں:

اُڑ کے پہنچوں میں وہاں روح کے طیّارے میں سرعتِ نور سے یا آنکھ کے پلکارے میں

''پلکارے'' کا لفظ نیا ہے اور خوب بنایا ہے۔''

(تنقیداتِ عبدالحق، ص..۱۳۶)

﴿۲﴾ الفاظ کا صحیح استعمال اور ان کی خاص ترتیب وترکیب زبان میں موسیقی پیدا کر دیتی ہے۔

﴿۳﴾ یہ ممکن نہیں کہ کوئی شاعر اور اس کی شاعری اپنے عہد کے حالات سے متاثر ہوئے بغیر رہ سکے۔ عہدِ میر پر وہ کہتے ہیں:

''اس وقت دِلّی تاریخ میں خاص حیثیت رکھتی تھی۔ وہ ہندوستان کی جان اور سلطنتِ مغلیہ کی راجدھانی تھی۔ مگر ہر طرف سے آفات کا نشانہ تھی، اُس کی حالت اُس عورت کی سی تھی، جو بیوہ تو نہیں، پر بیواؤں سے کہیں زیادہ دکھیاری ہے۔''

(انتخابِ کلامِ میر، ص....۱۲)

﴿۴﴾ جب ہم شعر یا شاعری کی تاریخ لکھنے بیٹھیں تو ہمارا فرض ہے کہ شاعر کی زندگی کے حالات، اس کی طبیعت، اس کے خصائص اور عادت پر نظر ڈالیں، جیسے ''شگفتگی اور زندہ دلی میر صاحب کی تقدیر میں نہ تھی۔ وہ سراپا یاس وحرماں تھے اور یہی حال ان کے کلام کا ہے گویا ان کا کلام ان کی طبیعت وسیرت کی ہو بہو تصویر ہے۔''

﴿۵﴾ اصل بات یہ ہے کہ ملک کی شاعری اس کے تمدّن کے تابع ہوتی ہے جو سوسائٹی جس رنگ میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہے اس کی جھلک اس کی نظم ونثر میں آجاتی ہے (جیسے) ہم اس زمانے کے لکھنؤ کو دیکھیں اور اس کے تمدّن پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ اہلِ لکھنؤ کے کھانے پینے، رہنے سہنے، لباس، آداب واطوار، غرض تمام طرزِ معاشرت میں سراسر تصنّع اور تکلّف پایا جاتا ہے۔

﴿۶﴾ ''الفاظ بھی ایک طرح جان دار ہیں۔ وہ بھی انسان کی طرح پیدا ہوتے، بڑھتے اور گھٹتے ہیں۔ ہر لفظ اپنے ساتھ ایک تاریخ رکھتا ہے جو خود اس کی ذات میں پنہاں ہے۔ وہ گذشتہ زمانے کی تہذیب اور معاشرت کی یادگار ہے۔ وہ قومی ترقّی کے ساتھ ترقّی کرتا اور قومی تنزّل کے ساتھ تنزّل کرتا ہے۔ یہ بھی انقلابِ زمانہ سے انسان کی طرح کبھی ادنیٰ سے اعلیٰ اور اعلیٰ سے ادنیٰ، شریف سے رذیل اور رذیل سے شریف ہو جاتا ہے لیکن ہر لفظ ایک منصب رکھتا ہے اور اس کے صحیح استعمال پر وہی قادر ہو سکتا ہے جو اس کی سیرت سے آگاہ ہے۔ یہ انشا پردازی کا بڑا گُر ہے۔''

مولوی عبدالحق جہاں مشرقی شعریات کو قابل قدر سمجھتے ہیں اسی طرح شاعر کی شخصیت اس کے ماحول، اس کے تاریخی پس منظر کے اثرات کی معنویت کا بھی انہیں احساس ہے۔ اقبال کے کلام میں وہ جن خصوصیات کی نشان دہی کرتے ہیں ان میں تخیل کی بلندی، تشبیہات و استعارات لفظی، ترکیبی عمل نمایاں ہیں۔ کہیں کہیں وہ تقابل سے بھی کام لیتے ہیں اور اقبال کی نظموں میں زبان کا جو تخلیقی اور صنّاعانہ عمل ہے وہ اسے غالبؔ کے اثر کا نتیجہ کہتے ہیں۔ عبدالحق جدید تقاضوں کا بھی احترام کرتے تھے۔ روایتی ہیئتی سخت گیری کے وہ بھی قائل نہ تھے۔ وہ عبدالحق ہی تھے جنہوں نے بلینک ورس کا ترجمہ نظمِ معرّیٰ تجویز کیا تھا اور شعرا نے جس کی تائید و تشہیر کی تھی۔

مولوی عبدالحق، حالیؔ، شبلیؔ یا بجنوریؔ کے پائے کے نقاد نہ سہی لیکن اُردو تنقید کی تاریخ میں ان سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ کلیم الدین احمد کا خیال بجا ہے کہ ان کی تنقید مشرقی فضا میں سانس لیتی ہے، اور یہ کہ:

> ''وہ مشرقی ادب کی محدود اور مقامی مشرقی معیار سے جانچتے ہیں اور کھرے کھوٹے میں امتیاز کرتے ہیں۔ تنقید میں بھی تحقیق کا رنگ جھلکتا ہے جس کتاب پر تنقید لکھتے ہیں اس پر کامل عبور کے بعد قلم اُٹھاتے ہیں اور عموماً بے لاگ رائیں دیا کرتے ہیں۔ کتاب کی خوبیوں اور خامیوں دونوں پہلوؤں کا بیان کرتے ہیں اور غیر جانب داری سے کام لیتے ہیں۔ اپنی تنقید کو مثالوں سے جامع کرتے ہیں اور کج فہمی اور کوتاہ نظر سے اپنے دامن کو آلودہ نہیں کرتے ہیں۔''

(اُردو تنقید پر ایک نظر، ص...۱۲۸)

06.08 مولوی عبدالحق کے متفرق کارنامے

مولوی عبدالحق کے متفرّق کارناموں میں قواعدِ اُردو ۱۹۱۴ء، مرحوم دِلّی کالج ۱۹۳۳ء، اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام ۱۹۳۷ء، چند ہم عصر ۱۹۳۷ء اور دی اسٹینڈرڈ انگلش اُردو ڈکشنری ۱۹۳۷ء ہیں۔

ان کے علاوہ کئی اہم مقالات بھی ان کی تنقیدی و تحقیقی بصیرت کے مظہر ہیں۔ افسر اور اُردو جیسے جرائد کی انہوں نے ادارت بھی کی تھی جن کی تاریخی حیثیت مسلّم ہے۔ ''قواعد اُردو'' ۱۹۱۴ء میں شائع ہوئی۔ مولوی صاحب نے اس سے قبل اس موضوع پر جو کام ہوئے تھے ان کا ذکر اپنے مقدمے میں کیا ہے۔ خصوصاً انشا اللہ خاں انشاؔ کی ''دریائے لطافت'' کو انہوں نے مدِّنظر رکھا تھا۔ عربی و فارسی صرف و نحو کی اصطلاحات کو ترجیح دینے کے باوجود انہیں اس بات کا شدید احساس تھا کہ اُردو ایک ہندوستانی زبان ہے اور اس کے نحو اور بیش تر افعال ہندوستانی ہیں۔

وہ لکھتے ہیں:

> ''اُردو کے ہندی نژاد ہونے میں کچھ شبہ نہیں کیوں کہ بیرونی زبانوں کا اثر صرف اسماء و صفات میں ہوا ہے۔ ورنہ زبان کی بنیاد یہیں کی زبان پر ہے۔ ہمارے ہاں اب تک جو کتابیں قواعد کی رائج ہیں ان میں عربی صرف و نحو کا تتبع کیا گیا ہے اُردو خالص ہندی زبان ہے اور اس کا شمول آریائی السنہ میں ہے بخلاف اس کے عربی زبان کا تعلق سامی السنہ سے ہے۔''

(مولوی عبدالحق کی خدمات، ص...۲۴۰)

اس میں کوئی شک نہیں کہ مولوی صاحب کو لسانیات و معنیات کا باقاعدہ علم نہ تھا، روایتی قواعد کے اصولوں اور اصطلاحات ہی کو انہوں نے بنیاد بنایا تھا۔ بس یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایک ایسی منظّم اور مرتّب قواعد ہے جو گزشتہ قواعد کی کتابوں کے مقابلے میں زیادہ مفید مطلب ثابت ہوئی۔ علامات اوقاف اور عروض کا اضافہ کر کے انہوں نے قواعد کے دائرے کو وسیع کرنے کی کوشش کی۔

اس ضمن میں انہوں نے یہ واضح کیا ہے کہ:

''میں نے اپنی قواعد میں دو چیزوں کا اور اضافہ کیا ہے۔ ایک اوقاف اور دوسرے عروض (کیوں کہ عروض بی.اے. کے نصاب میں ہے) اوقاف کے اجزا آپ کے ملاحظے کے لئے بھیجتا ہوں۔ براہِ کرم اسے ایک نظر دیکھ لیجیے جہاں کہیں اصلاح کی ضرورت ہو۔ بے تکلف فرما دیجیے۔ جو اوقاف ہم نے طے کیے تھے۔ ان میں میں نے ایک ہائی فن (hyphen) کا اضافہ اور کیا ہے۔ اس کے لئے کوئی علامت نہ ملتی تھی میں نے ایک باریک ساز نجیرہ (oo) قرار دیا ہے۔ اگر آپ کوئی بہتر علامت بنا سکیں تو میں اسے ترک کر دوں گا۔''

قواعد اُردو (مقدّمہ)

مولوی صاحب کی قواعد کے بعد ایک عرصے تک وہی نسخۂ کیمیا بنی رہی۔ عصمت جاوید (مرحوم) کی ''نئی قواعد'' جسے اردو کونسل نے شائع کیا تھا ۱۹۸۰ء میں منظر عام پر آئی تھی۔ ''اُردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیاے کرام کا کام'' ۱۹۳۳ء کی اس معنی میں غیر معمولی اہمیت ہے کہ مولوی عبدالحق نے علاء الدین خلجی اور ملک کافور سے قبل اور بعد کے صوفیاے کرام کی وسیع المشربی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کی خانقاہوں کے باب ہر مذہب و ملّت کے لوگوں کے لئے کھُلے ہوئے تھے۔ وہ اخلاقِ حسنہ اور اخلاص و ایثار کے پیکر تھے۔ انہوں نے اپنے درس و تبلیغ میں جو زبان اختیار کی تھی وہ آسان و عام فہم اور امتزاجی نوعیت کی تھی۔ آٹھ صوفیائے کرام کا اُردو کلام بھی دستیاب ہے۔ مولوی صاحب نے بابا فریدالدین شکر گنج، شیخ حمیدالدین ناگوری کے زبان سے ادا کردہ چند فقروں کا ذکر کرنے کے بعد شیخ شرف الدین بوعلی قلندر کے کلام کی مثالیں بھی دی ہیں۔ حضرت امیر خسرو کے کلام کو ریختہ اُردو یا ہندوستانی سے موسوم کیا ہے۔ ان کی پہیلیوں، انمل اور کہہ مکرنیوں کی مثالیں فراہم کی ہیں۔ خسرو کو ریختہ کا پہلا شاعر بھی قرار دیا ہے۔ حضرت گیسو دراز کے نمونۂ کلام کے علاوہ معراج العاشقین کا بھی ذکر کیا ہے۔

حفیظ قتیل نے اسے کسی اور کی تصنیف بتایا ہے۔ ان کے علاوہ بھی عبدالحق نے دوسرے اور کئی صوفیا کا ذکر کیا ہے۔ ان کے حالات اور سوانح پر بھی روشنی ڈالی۔ اگر چہ بہت سی باتیں تحقیق طلب ہیں لیکن مولوی صاحب نے اُردو کی ابتدائی نشو ونما کی طرف توجہ دے کر دوسرے محقّقین کو اس اہم موضوع کی طرف توجہ دلائی۔ ''مرحوم دِلّی کالج'' کے نصاب، اس کے اساتذہ و طلبا، اس کا قیام، انگریزی زبان کی تعلیم کی ابتدا، کتابوں کے تراجم اور ۱۸۵۷ء میں اس کے اہم ذخائر کی تباہی کے بارے میں جو معلومات فراہم کی گئی ہیں وہ دِلّی کالج پر تحقیق کرنے والوں کے لئے آج بھی مشعلِ راہ ہے۔ کالج کا قیام ۱۸۲۵ء میں عمل میں آیا تھا۔ اُردو جس کا ذریعۂ عمل تھا اور ورنا کلر ٹرانس لیشن سوسائٹی (Vernacular Translation Society) اس کا وہ شعبہ تھا جس کے سپرد کتابوں کے ترجمے تھے۔ ''مرحوم دِلّی کالج'' کو انہوں نے اہم تاریخی کارنامہ قرار دیا ہے جس نے پہلی مرتبہ انگریزی کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی۔ تراجم کی ضرورت پر اصرار کیا۔ علمی کتابوں کی اشاعت پر زور دیا۔

ڈاکٹر سمیع اللہ نے اس کالج کی قدر افزائی کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اس ادارے سے ہندوستانی زبانوں بالخصوص اُردو کو وہ فروغ ملا جو فورٹ ولیم کالج سے بھی نہ ملا تھا۔ اس لئے کہ فورٹ ولیم کالج میں جو کتابیں تالیف یا ترجمہ ہوئیں ان میں معدودے چند کو چھوڑ کر باقی قصّہ اور کہانیوں پر مشتمل تھیں لیکن دلّی کالج میں مختلف موضوعات مثلاً ادبیات، اخلاقیات، طب، زراعت وغیرہ پر کتابیں، تالیف، تصنیف اور ترجمہ ہوئیں۔ اس طرح مختلف موضوعات اور شعبہ ہائے زندگی سے اُردو کی شناسائی ہوئی۔''

(مولوی عبدالحق کی خدمات، ص..۲۵۹)

06.09 چند ہم عصر اور لغت نویسی

''چند ہم عصر'' مولوی صاحب کے لکھے ہوئے ان شخصیات کے خاکوں کا مجموعہ ہے جن سے وہ بخوبی واقف ہی نہیں متاثر بھی تھے یا جن کی زندگی کے بعض واقعات، بعض پہلو انہیں لائق توجہ محسوس ہوئے تھے۔ ظاہر ہے مرقّع نگاری یا شخصیت نگاری سوانح نہیں ہوتی بلکہ مصنف کی یادوں کا ایک ایسا مجموعہ ہوتی ہے جس میں محض اشاروں سے کام لیا جاتا ہے۔ تاریخی تسلسل، سوانحی تاریخوں، تجزیاتی تفصیلات سے عموماً گریز اختیار کر کے محض ان چیزوں کو اختصار کے ساتھ نمایاں کر کے پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جو دوسروں کے لئے بھی دل چسپ، توجہ طلب اور بعض صورتوں میں حیرت انگیز ہوتی ہیں۔ مولوی عبدالحق نے محض رہن سہن، عادات وخصائل، طور طریقوں کی طرف اشارہ کرنے کو ضروری نہیں سمجھا بلکہ انسان کو داخلی طور پر بھی سمجھنے کی کوشش کی۔ انہیں شخصیات کے مرقع بنائے جن سے وہ پوری طرح واقف تھے اور جن کا مشاہدہ انہوں نے بہت قریب سے کیا تھا۔ جب نصیرالدین ہاشمی نے سرور جنگ کے بارے میں خاکہ لکھنے کی فرمائش کی تو مولوی صاحب نے انہیں جواب میں لکھا کہ:

''میں نے کبھی ایسے شخص کے متعلق کچھ نہیں لکھا جس کے حالات وخصائل اور سیرت سے مجھے پوری واقفیت نہ ہو۔ میں نے سرور جنگ کو دیکھا ضرور ہے مگر ذاتی طور پر ان کے حالات وغیرہ سے ناواقف ہوں۔''

مولوی صاحب کے خاکے جن حضرات پر لکھے گئے ہیں وہ اپنے دَور کے اہم نام تھے لیکن ایک ایسا نام بھی ہے جس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ درجے میں ان سے کمتر ہے۔

مولوی صاحب کی نظر میں انسان اپنے نام نہاد درجے اور طبقے سے نہیں پہچانا جاتا، اصلاً اس کی شناخت اس کے کردار کے خصائص سے ہوتی ہے۔ یہ چیز انہیں ''نورخان'' کے یہاں نظر آئی جسے وہ صداقت شعاری، حق گوئی اور ایثار کا مجموعہ کہتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں وہ انتہائی ذمہ دار، محنت پسند، اور فرض شناس شخص ہے۔ مولوی صاحب نے انسان شناسی کا جو پیمانہ بنایا ہے نورخان اس پر پورا اُترتا ہے۔ محض دنیاوی علم، اعلیٰ منصب اور کسی شعبہ یا فن کی مہارت کسی کو بلند مقام عطا نہیں کرتی تا آں کہ وہ اعلیٰ انسانی قدروں پر پورا نہ اُترتا ہو۔ انگریزی اُردو ڈکشنری، مولانا کا پرانا خواب تھا۔ اُردو لغت تو اپنی تکمیل پر پہنچنے کے باوجود شائع نہ ہو سکی کیوں کہ ۱۸۵۷ء میں اسے تہس نہس کر دیا گیا۔

عبدالحق کو اُردو میں مختلف زبانوں کے ترجموں کی کمی کا شدید احساس تھا ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ ''زبان کی ترقّی کے لئے اعلیٰ درجے کی کتابوں اور لغتوں کا ہونا لازمی ہے'' اسی بنیاد پر انہوں نے انگریزی اُردو لغت کی ترتیب کے لئے ڈاکٹر سید عابد حسین، پروفیسر یوسف حسین خاں، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، مولوی وحیدالدین سلیم، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی وغیرہ کی خدمات حاصل کیں۔ اس کے نگراں خود عبدالحق تھے۔ عبدالحق نے Consice-Oxford لغت کو بنیاد بنایا تھا۔ جمیل الدین عالی نے تیسرے ایڈیشن کے حرفِ آغاز میں لکھا ہے کہ ڈکشنری کی پہلی اشاعت کے بعد مسلسل اس کی نظرِ ثانی کی جاتی رہی ہے اور ہزاروں نئے الفاظ کے اضافے کے علاوہ ترجمہ یافتہ الفاظ کے معانی میں بھی ترمیم واضافہ کیا گیا ہے۔

اس لغت کے بعد ترجمے کی رفتار میں بڑی تیزی آئی۔ مختلف اداروں کے ذریعے جو تراجم ہوئے ان کے علاوہ انفرادی طور پر بھی ناراست طور پر مختلف زبانوں کی علمی وادبی کتابوں، مقالات اور نظموں کے تراجم میں غیر معمولی پیش رفت ہوئی۔ پروفیسر کلیم الدین احمد، جمیل الدین عالی، بشیر احمد اور شان الحق حقی کی انگریزی اُردو لغات شائع ہو چکی ہیں۔ پروفیسر عتیق اللہ کی نگرانی میں آکسفورڈ انگلش اُردو ڈکشنری کا ہندوستانی ایڈیشن ۲۰۱۶ء میں شائع ہو چکا ہے لیکن عبدالحق کی ڈکشنری کی معنویت وافادیت میں کمی نہیں آئی۔ عبدالحق کی ڈکشنری سے مذکورہ بالا لغات بھی مستفید ومستفیض ہوئی ہیں۔

06.10 خلاصہ

مولوی عبدالحق ایک محقّق، تدوین کار، لغت نویس اور قواعد نویس ہی نہیں وہ اُردو کی ترقّی وتحفّظ کے علَم بردار بھی تھے۔ ان کے کئی میدان تھے اور ہر میدان میں انہوں نے اپنے صاحبِ عمل ہونے کا ثبوت فراہم کیا۔

﴿۱﴾ ان کی زندگی ایک مسلسل جدوجہد اور تلاش وجستجو میں صرف ہوئی۔

﴿۲﴾ انہوں نے انجمن ترقی اُردو کو از سرِ نو زندگی بخشی اور ملک گیر سطح پر اس کی کئی شاخیں قائم کیں۔

اس کے تحت کئی کتابیں شائع ہوئیں۔

﴿۳﴾ جامعہ عثمانیہ کے بنیاد سازوں میں ان کا بھی شمار ہوتا ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے نصاب کی تیاری وتشکیل میں وہی پیش پیش تھے۔ دارالترجمہ کا شعبہ بھی انہیں کا قائم کردہ تھا۔

﴿۴﴾ عبدالحق ماہرِ دکنیات بھی تھے انہوں نے کئی مخطوطات دریافت کیے، انہیں ترتیب دیا اور فرہنگیں تیار کیں۔

﴿۵﴾ اُردو شعرا پر لکھے ہوئے تذکروں کی اہمیت سے آگاہ کیا اور انہیں مُدَوَّن کیا۔

﴿۶﴾ اُردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام؛ مرحوم دلی کالج اور قدیم اُردو جیسی کتابوں کا شمار بھی ان کے گراں قدر تحقیقی کاموں میں کیا جاتا ہے۔

﴿۷﴾ ''چند ہم عصر'' ان حضرات کے خاکوں کا مجموعہ ہے، جن کی شخصیت، کارناموں اور کردار سے وہ متاثر تھے۔ یہ محض صاحب علم حضرات ہی کے مرقعے نہ تھے۔ ''نورخاں'' جیسے حق گو اور صداقت شعار شخص کی سیرت کو بھی انہوں نے نمایاں کرنا ضروری خیال کیا۔ جو عبدالحق صاحب کی وُسعتِ قلبی اور وسیع النظری کا مظہر ہے۔

مولوی عبدالحق علی گڑھ میں پروفیسر آرنلڈ، سرسید احمد خاں اور شبلی سے متاثر تھے۔ مولوی عبدالحق نے نکات الشعرا، تذکرۂ ریختہ گویاں، مخزنِ نکات، چمنستان شعرا، گلِ عجائب، عقدِ ثریا، تذکرۂ ہندی، ریاض الفصحا، مخزن الشعرا وغیرہ کی تدوین وترتیب کی۔ مولوی عبدالحق کے اہم کارناموں میں چند ہم عصر، مرحوم دلی کالج، قدیم اُردو، اُردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام، انگریزی اُردو ڈکشنری اور قواعد اُردو کی خاص اہمیت ہے۔ انجمن ترقی اُردو کے پہلے سیکرٹری شبلی تھے، انہوں نے اس کی بنیادوں کو مستحکم کیا لیکن ان کے بعد وہ تعطّل کی شکار ہوگئی۔ مولوی عبدالحق اس کے چوتھے سیکرٹری مقرر ہوئے۔ ان کے بعد انجمن کو از سرِ نَو زندگی ملی۔

06.11 فرہنگ

اَنکُر	: کِلّہ	خصائل	: خصلت کی جمع، عادات
تاسیس	: بنیادسازی	روشناس	: پہچان
تاہنوز	: تاحال	مختص	: مخصوص
توجیہ	: وضاحت کرنا	مخطوطات	: مخطوطہ کی جمع، قلمی نسخے
تیزگامی	: تیزقدمی	معروضیت	: غیرجذباتیت، غیرشخصی
ثروت مند	: امیر	نظمِ معرا	: بلاقافیہ نظم

06.12 سوالات

مختصر سوالات

سوال نمبر۱ : مولوی عبدالحق نے کن تذکروں کی تدوین کی؟

سوال نمبر۲ : انجمن ترقی اُردو کو شبلی کے بعد کس نے ایک نئی زندگی بخشی؟

سوال نمبر۳ : علی گڑھ میں مولوی عبدالحق کن شخصیات سے متاثر ہوئے؟

تفصیلی سوالات

سوال نمبر۱ : مولوی عبدالحق کی تنقید نگاری کا جائزہ لیجیے۔

سوال نمبر۲ : اُردو تحقیق میں مولوی عبدالحق کا کیا مقام ہے؟

سوال نمبر۳ : مولوی عبدالحق کو ماہر دکنیات کیوں کہا جاتا ہے؟

معروضی سوالات

سوال نمبر۱ : انجمن ترقی اُردو کے پہلے سکریٹری کون تھے؟

(الف) شبلی نعمانی (ب) سرسید (ج) مولوی عزیز مرزا (د) حبیب الرحمٰن شیروانی

سوال نمبر۲ : مولوی عبدالحق کے خاکوں کے مجموعے کا کیا نام ہے؟

(الف) مرقعے (ب) چند ہم عصر (ج) چند اہم شخصیات (د) ادبی خاکے

سوال نمبر۳ : انگریزی اُردو ڈکشنری کے نگراں کون تھے؟

(الف) پروفیسر سید عابد حسین (ب) عبدالستار صدیقی (ج) مولوی عبدالحق (د) وحیدالدین سلیم

سوال نمبر۴ : ''قواعدِ اُردو'' کب شائع ہوئی؟

(الف) ۱۹۲۰ء (ب) عربی ۱۹۳۱ء (ج) ۱۹۱۶ء (د) ۱۹۱۴ء

معروضی سوالات کے جوابات

جواب نمبر۱ : (الف) شبلی نعمانی جواب نمبر۳ : (ج) مولوی عبدالحق

جواب نمبر۲ : (ب) چند ہم عصر جواب نمبر۴ : (د) ۱۹۱۴ء

06.13 حوالہ جاتی کتب

۱۔ مولوی عبدالحق کی خدمات قیامِ اورنگ آباد کے دوران از ڈاکٹر مسرت فردوس

۲۔ ارمغان (تحقیق وتنقید) مرتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

۳۔ اُردو تنقید پر ایک نظر از کلیم الدین احمد

۴۔ تحقیق وتدوین، سمت ورفتار مرتبہ موصوف احمد

اکائی 07 : محمود شیرانی

ساخت :

07.01 : اغراض ومقاصد

07.02 : تمہید

07.03 : محمود شیرانی سوانح وشخصیت

07.04 : تحقیق اور تدوین

07.05 : اُردو میں لسانی تحقیق کی روایت اور محمود شیرانی

07.06 : آبِ حیات وشعرالعجم پر محمود شیرانی کے مباحث

07.07 : فردوسی کا شاہ نامہ اور محمود شیرانی کی تحقیق

07.08 : محمود شیرانی کی تحقیق کا عمل

07.09 : محمود شیرانی ایک سخت گیر محقق

07.10 : خلاصہ

07.11 : فرہنگ

07.12 : سوالات

07.13 : حوالہ جاتی کتب

07.01 اغراض ومقاصد

محمود شیرانی نے اپنا تحقیقی سفر اُس وقت شروع کیا تھا جب اُردو میں تحقیق کی بنیادیں مستحکم نہیں ہوئی تھیں۔ حالؔی، آزادؔ اور شبلؔی جیسے عہد ساز ادیبوں کی رغبت کے میدان دوسرے تھے۔ انہیں تحقیق کے تقاضوں اور ایک علیحدہ دائرۂ کار کی حیثیت سے تحقیق کے علم اور اصولوں سے آگہی بھی نہیں تھی۔ سید احمد خاں اور مولوی عبدالحق نے جو کام کیے تھے ان سے تحقیقی فضا سازی میں مدد ضرور ملی لیکن محمود شیرانی لندن میں رہے تھے جہاں سے لَوٹنے کے بعد انہوں نے اپنی ساری زندگی مخطوطہ شناسی میں وقف کر دی۔

سر سید اور عبدالحق تحقیق وتنقید کے علاوہ اور دوسرے علمی سماجی اور اُردو کی ترقّی وتحفّظ کے کاموں میں بھی سرگرم رہے اس لئے وہ کسی ایک میدان کے لئے اپنی صلاحیتوں کو رہن نہیں رکھ سکتے تھے۔ محمود شیرانی کے تحقیقی کارناموں کی ایک لمبی فہرست ہے۔ اُردو کے طلبا کے لئے جن سے باخبر ہونا ضروری ہے۔ اس اکائی کے مطالعے کے بعد انہیں محمود شیرانی کے غیر معمولی تحقیقی طریقِ کار اور ان کی جدوجہد سے جو آگہی ہوگی اس سے ان میں بھی تحقیق کی طرف رغبت پیدا ہو سکتی ہے۔

07.02 تمہید

محمود شیرانی ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے۔ جب مولوی عبدالحق دس برس کے تھے۔ قاضی عبدالودود سے وہ سترہ برس اور مسعود حسن رضوی سے تیرہ برس بڑے تھے۔ گویا عبدالحق ان سب سے سینئر تھے اور سرسید احمد خاں ان سب سے سینئر، جنہوں نے تدوین کاری کی بنیاد رکھی لیکن ان کی توجہ تاریخ کی طرف تھی۔ ادبی تحقیق و تدوین کے لئے وہ وقت نہیں نکال سکے۔ محمود شیرانی صرف اور صرف ادبی محقّق تھے۔ وہ ماہرِ لسانیات بھی تھے۔ محمود شیرانی شناسی کے لئے ہم نے درج ذیل عنوانات قائم کیے ہیں جو محمود شیرانی کے تحقیقی کاموں کی نوعیت اور اُن کی افادیت و معنویت کو محیط ہیں:

﴿۱﴾ سوانح و شخصیت ﴿۲﴾ تحقیق و تدوین کا فرق ﴿۳﴾ اُردو میں لسانی تحقیق کی روایت اور محمود شیرانی کا نظریہ
﴿۴﴾ آبِ حیات و شعرالعجم اور محمود شیرانی ﴿۵﴾ فردوسی شاہ نامہ اور محمود شیرانی
﴿۶﴾ محمود شیرانی کی تحقیق کا عمل ﴿۷﴾ محمود شیرانی ایک سخت گیر محقق

07.03 محمود شیرانی سوانح و شخصیت

محمود شیرانی کا شمار صفِ اوّل کے محقّقین میں ہوتا ہے۔ اُردو تحقیق کی تاریخ میں جس مثلث کو کلاسیک کا درجہ حاصل ہے وہ محمود شیرانی، قاضی عبدالوَدود اور امتیاز علی عرشی پر مشتمل ہے۔ ان کے بعد گیان چند، مالک رام، عبدالحق، مسعود حسن رضوی، مختارالدین احمد وغیرہ کے نام آتے ہیں۔ رشید حسن خاں کو ہم آخرالزّماں کا نام دے سکتے ہیں۔ محمود شیرانی کا مرتبہ کئی لحاظ سے امتیاز کا حامل ہے۔ وہ محقّق، فارسی زبان و ادب کے رمز شناس اور ماہر لسانیات ہیں۔ خلیق انجم نے ان کی کتبہ شناسی، سکہ شناسی اور رمز شناسی کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ:

> ''شیرانی مرحوم کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ مبالغہ نہ ہوگا اگر میں کہوں کہ شیرانی صاحب نے تحقیق سے متعلّق جو علوم حاصل کیے تھے وہ کسی اور اُردو محقّق کو نصیب نہیں ہوئے۔ شیرانی صاحب کی تاریخ پر گہری نظر تھی۔ سکہ شناسی، کتبہ شناسی، مہر شناسی پر انہیں قدرت حاصل تھی۔ قدیم کاغذ، روشنائی، مخطوطے کی آرائش، نقش و نگار اور خط کی شناخت پر انہیں مہارت تھی۔ تاریخی لسانیات پر اُن کی گہری نظر تھی۔ شیرانی صاحب نے کئی سال تک لندن کی لوزک اینڈ کمپنی میں نوادرات اور تحقیقات کے ماہر کی حیثیت سے کام کیا۔''
>
> (تعبیر و تفہیم: ڈاکٹر خلیق انجم، مکتبہ جامعہ نئی دہلی، ص...۱۰۳)

محمود شیرانی ایک ایسے وقت میں پیدا ہوئے تھے جب تحقیق کی رفتار بے حد سست تھی بلکہ ایسی تحقیق کی مثال سامنے نہیں آئی تھی جسے اعتبار کا درجہ دیا جا سکے یا جسے تحقیق کے عام و خاص اصولوں اور تقاضوں کی روشنی میں مثالی قرار دیا جا سکے۔ محمود شیرانی کی ولادت ۱۸۸۰ء میں ٹونک (راجستھان) میں ہوئی۔ ان سے قبل سرسید نے تحقیق کی راہیں وا کر دی تھیں اور ان کی مساعی لائق صد ستائش ہیں۔ محمود شیرانی فنافی التحقیق تھے۔ سرسید کو کئی محاذوں پر جوجھنا تھا اور محمود شیرانی نے اس عہد میں بلوغت کی منزلیں کیں جب کہ اعلیٰ تعلیم کے مواقع کہیں زیادہ معرضِ امکان میں تھے۔ محمود شیرانی نے ابتدائی تعلیم گھر میں پائی۔ منشی فاضل تک کے امتحانات لاہور میں پاس کیے۔ وہیں بارہویں کے امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد ۱۹۰۴ء میں بیرسٹری کے لئے لندن چلے گئے۔ اسی دَوران اُن کے والد کا انتقال ہو گیا اور انہیں ملازمت کرنی پڑی۔ لندن میں ۱۹۱۳ء تک ان کا قیام رہا۔

چوں کہ اُردو فارسی کے علاوہ انگریزی میں وہ بے حد کمزور تھے اس کا انہیں ملال بھی تھا۔ خصوصاً لندن میں انہیں انگریزی زبان کے معیاری لہجے پر قدرت حاصل کرنے میں کافی وقت لگا جس کا ذکر انہوں نے اپنے اکثر خطوط میں کیا ہے اور اپنے برادر خورد کو تاکید کرتے رہے کہ انگریزی زبان کی تحصیل کیوں ضروری ہے؟ تاکہ انہیں پریشانی کے اس تجربے سے نہ گزرنا پڑے جس سے وہ گزرے ہیں۔ لاہور لَوٹنے کے بعد ۱۹۲۲ء میں اورینٹل کالج لاہور میں اُردو کے استاد کی حیثیت سے ان کا تقرّر ہو گیا۔ ۱۹۲۸ء سے پنجاب یونی ورسٹی میں انہوں نے خدمات انجام دیں۔ اس دَوران وہ تحقیقی مضامین کے ساتھ ساتھ تدوین کے کام کی طرف بھی متوجہ رہے۔ زبان، قواعد، عروض اور فارسی زبان وادب کی تاریخ پر ان کی گہری نظر تھی، ان کے تحقیق کے کاموں میں یہ علوم ان کے لئے چراغِ راہ کا کام دیتے رہے۔ محمود شیرانی باریک بین، بعض معاملات میں سخت گیر اور نتائج اخذ کرنے کی غیر معمولی صلاحیت سے بہرہ ور تھے۔ ۱۹۴۰ء میں ٹونک جو اُن کا آبائی وطن تھا، اس کی مٹی کا بلاوا آ گیا اور انہوں نے لاہور کو خیر باد کہہ دیا۔ ۱۹۴۶ء میں وہ پیوند خاک ہوئے۔

07.04 تحقیق اور تدوین

تحقیق کی تعریف کم سے کم لفظوں میں یہ کی جا سکتی ہے:

﴿۱﴾ تحقیق ایک علم ہے اور ایک عمل بھی۔

﴿۲﴾ تحقیق حق کی تلاش کا نام ہے۔

﴿۳﴾ کسی بھی شعبۂ زندگی اور شعبۂ علم میں تحقیق دریافت کا عمل اس کی توسیع و ترقّی کی ضمانت ہے۔

﴿۴﴾ تحقیق ہمیشہ پرانی دریافت شدہ صداقتوں کے اُن عناصر کو چھانٹنے کا کام کرتی ہے جو تا ہنوز پردۂ خفا میں تھے یا جنہیں سچائی کے طور پر مقبولیت حاصل تھی۔

﴿۵﴾ تحقیق کی بنیاد ہی شک پر ہے۔ تشکیک ہمیشہ منفی نہیں ہوتی، امکان افزا بھی ہوتی ہے۔

﴿۶﴾ تحقیق ایک صبر طلب جستجو کا نام ہے اور جستجو کسی صحیح نتیجے تک پہنچنے کے لئے مہمیز کرتی ہے۔

﴿۷﴾ قاضی عبدالودود نے ''اصولِ تحقیق'' کے ضمن میں مندرجہ ذیل اُمور پر خصوصاً تاکید کی ہے:

﴿الف﴾ تحقیق کسی امر کو اس کی اصلی شکل میں دیکھنے کی کوشش ہے۔

﴿ب﴾ موضوع تحقیق کے انتخاب میں اپنی صلاحیتوں کا اظہار ہے۔

﴿ج﴾ (محقّق کو) خوفِ راست گفتاری سے باز نہیں رہنا چاہیے۔

﴿د﴾ بات اہم ہو کہ غیر اہم، محقّق کو حقِ تحقیق ادا کرنا چاہیے۔

﴿ہ﴾ محقّق کو خطابت سے احتراز واجب ہے۔

﴿و﴾ کلیم الدین احمد نے تنقید و تحقیق کے رشتے کی اہمیت پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے بڑی اچھی بات کہی ہے کہ:

''تنقید بعض اوقات تحقیق کی کمی کی وجہ سے لغزش کر جاتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ تحقیق، تنقید کی محدود مخصوص صورت ہے۔ اگر اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھا جائے تو تحقیق مفید ہو سکتی ہے۔''

تحقیق ایک وسیع میدانِ عمل ہے۔محض واقعات کی چھان پھٹک، صاحبِ تصنیف کے مذہب ومسلک یا کسی تصنیف وتالیف یا کسی مصنف کی ولادت ووفات کی صحیح تاریخ کی تلاش ہی تک تحقیق کا دائرۂ عمل محدود نہیں ہے۔متن کو صحیح اور بے میل یا غیر الحاقی ثابت کرنا، مختلف متون کا تقابل کر کے صحیح متن قائم کرنا بھی تحقیق کے دائرے کی چیز ہے۔ان تمام اُمور کا تعلق تدوینِ متن وترتیبِ متن سے ہے۔اسی عمل کو متنی تنقید کہتے ہیں۔متن انگریزی لفظ Text کا ترجمہ ہے۔متن ایک بامعنی لسانی ساخت کا نام ہے جس کی بافت لفظوں اور لفظی اشاروں سے بنتی ہے جن کے تال میل سے متن بامعنی ہوتا ہے۔

متن بے زبان ہوتا ہے جب کوئی اس کی رمز کشائی کرتا ہے تو اس کی گونج بھی سنائی دیتی ہے۔ہر متن یا تحریر کی ساخت بھی جدا ہوتی ہے۔اس کے معنی کی تنظیم اور معنی کی سطحیں بھی مختلف ہوتی ہیں۔تمام متون کے تقاضے یکساں نہیں ہوتے۔مختلف متون ذہنی مہارتوں کا مطالبہ کرتے ہیں۔مختلف سماجی وتہذیبی پس منظر سے تعلق ہونے کے باعث قاریوں کی متن سے توقعات بھی الگ الگ ہوتی ہیں۔ایک ہی متن کی مختلف تفہیمات وتعبیرات کی وجہ بھی قارئین کے طے شدہ ذہنوں اور حلقوں Communities میں مضمر ہوتی ہے۔محض ایک تحریر شدہ مواد ہی متن نہیں ہوتا ''مصوّر کی تیار کردہ تصویر، رقص، موسیقی، فوٹو، گیت، حتیٰ کہ اشتہار، فوٹو، ریڈیو کسی شخص طبقے یا موقع پر استعمال کردہ لباس''، وغیرہ کا شمار بھی متن میں ہوتا ہے لیکن تحقیق کے ضمن میں ہمارا مسئلہ کسی مطبوعہ یا غیر مطبوعہ مخطوطے کی شکل میں ہمارے پیشِ نظر لفظی تحریر ہوتی ہے۔

چھاپے خانے کی ایجاد بہت بعد میں ہوئی اس لئے جو قدیم قلمی نسخے دستیاب ہوتے ہیں انہیں مختلف حضرات کے ایما پر مختلف وقتوں میں مختلف کاتبوں نے تیار کیا ہے۔یہ پتہ لگانا ایک کارِ دِرد ہوتا ہے کہ اس میں صحیح تر نسخہ کون سا ہے کیوں کہ تحریف وتصریف اور ترمیم و اضافہ سے کسی بھی متن کا بچنا مشکل ہے۔شاعری کے نمونوں میں مصرعہ جاتی سطح پر تحریف یا شعری الحاقی صورتیں عام ہیں۔حتیٰ کہ رُسوا، پریم چند اور منٹو کے مختلف طباعتوں کے نمونوں میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔بعض حضرات نے یہ کرم بھی کیا ہے کہ اپنے استاد کے اشعار کو بھی بدل دیا ہے یا دوسروں کا کلام یا استاد کے نام سے خود کا کلام بھی شامل کرنے میں انہیں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوئی۔اب سوال یہ اُٹھتا ہے کہ اصلی متن، اصلی املا کے ساتھ متن کی تلاش کس کا کام ہے۔ظاہر ہے متن کو مرتّب کرنے والے کو تدوین کار یا مدوِّن کہا جاتا ہے۔

اُردو میں تاریخی متون کی تدوین کی پہلی مثال سرسید نے قائم کی تھی۔''آئینِ اکبری'' کی تدوین میں انہوں نے جو چھان پھٹک کی ہے۔حالؔی نے جس طرح ''آئین اکبری'' کی تدوین کے مراحل کے بارے میں سرسید کے محنت، لگن، مطالعے، باریک بینی اور لسانی فہم و بصیرت کی طرف اشارے کیے ہیں اور سرسید نے جس طور پر ان تین جلدوں کو تیار کیا ہے۔ان سے تدوین کے سائنسی اصولوں کو مرتب کیا جاسکتا ہے۔حالؔی ''حیاتِ جاوید'' میں سرسید کے تحقیقی عمل کا تفصیل کے ساتھ ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''.....آئینِ اکبری کے نسخے کاتبوں کے سہو وخطا سے اکثر مسخ ہو گئے تھے، اس لئے اس کا صحیح کرنا سخت دشوار تھا۔سرسیّد نے اوّل جہاں تک مل سکے اس کے متعدد نسخے بہم پہنچائے۔اس میں ایک آدھ نسخہ صحیح بھی مل گیا اور اس طرح غلط اور صحیح نسخوں کے باہم مقابلہ کرنے سے ایک نسخہ سب سے زیادہ صحیح تیار ہو گیا۔اس کے بعد انہوں نے فارسی، عربی، ترکی، ہندی اور سنسکرت کے اکثر غریب الفاظ کی شرح کی جو اصطلاحیں اکبر کے زمانے میں ہر ایک آئین کے متعلق مستعمل تھیں یا خود ابوالفضل نے اختراع کی تھیں، ان کی جا بجا تشریح

کی۔ اس زمانے کے اوزان اور نقود کی اس زمانے کے اوزان ونقود سے مطابقت کی۔ جن جدولوں میں مصنّف نے کچھ خانے خالی چھوڑ دیے تھے اور تمام نسخوں میں وہ خانے خالی پائے گئے، ان کو اور کتابوں سے تحقیق کر کے معمور کیا۔ کہیں کہیں جدولوں میں جو خود مصنّف نے غلطی کی تھی، اس کو بھی بہت تحقیق کر کے بعض جدولوں میں ہندوسوں کی جگہ حرف لکھے ہوئے تھے۔ ان کی قیمت ہندسوں میں بھی ظاہر کر دی۔ بعض جدولیں جو تمام نسخوں میں مختلف پائی گئیں، وہ آئین کے انگریزی ترجمے کے مطابق جس میں ہر نہایت صحت کے ساتھ لکھی گئی تھی، کتاب میں داخل کیں۔ اکثر جدولوں میں ایک خانہ اپنی طرف سے آخر میں اس لئے اضافہ کیا کہ اس سے پہلے خانے کا مفہوم ہر شخص با آسانی سمجھ جائے۔''

(حیاتِ جاوید، حالؔی، نئی دہلی ۱۹۷۹ء، ص ۲۷۔۲۳۷)

یہ تو علم نہیں کہ ''آئینِ اکبری، تاریخ فیروز شاہی یا تزکِ جہانگیری'' محمود شیرانی کی نظر سے گزری تھی کہ نہیں یا سرسید نے قیامِ لندن کے دوران کسی مدوّن کام کو دیکھا تھا یا نہیں۔ اتنا ضرور ہے کہ سرسید نے اپنی ذہانت وبصیرت سے جس نہج سے تدوین کی تھی، اس بنیاد پر تدوین کے اصول بنائے جاسکتے ہیں۔ بعض حضرات تحقیق وتدوین کو دو الگ الگ خانوں میں بھی رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر عطش درانی نے بھی اس مسئلے پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ادبی ولسانی اصولِ تحقیق کا ایک بڑا مسئلہ ''تدوینِ متن'' کے اصولوں سے پیدا ہوتا ہے کہ آیا اسے ''تحقیق'' مانا بھی جائے یا نہیں۔ جب کہ اس میں بھی ''تلاش وتفتیش'' کے کئی لمحات صرف ہوتے ہیں۔ جدید تکنیک کے حوالے سے اس ضمن میں ایک بنیادی بات یہ سامنے آتی ہے کہ اگر تدوینِ متن میں بھی ''فرضیہ'' قائم ہو سکے اور ''متغیّرات'' اور ''تحدید'' کا تعیّن ہو جائے تو ''تدوینِ متن'' کا شمار بھی ''اشاعتی کام'' سے بڑھ کر ''طریقِ تحقیق'' میں ہوسکتا ہے۔''

(تحقیق وتدوین، سمت ورفتار ص ۴۲)

جس طرح تحقیق کا باب کبھی بند نہیں ہوتا، کسی تدوین کے بارے میں یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ وہ آخری اور فیصلہ کن ہے۔ بہ استثنائے مصنف کے دستِ خود کا لکھا ہوا مستند مخطوطہ۔ خلیق انجم دونوں کے درمیان امتیاز قائم کرتے ہوئے مولانا عرشی کو متنی نقاد کہتے ہیں، ان کا کہنا ہے:

''بیسویں صدی میں بڑے پیمانے پر کلاسیکی متن چھاپے گئے لیکن بیش تر متن مرتّب کیے بغیر شائع کیے گئے ہیں۔ بیسویں صدی نے دو عظیم محقق اور ایک متنی نقاد پیدا کیے۔ میری مراد ہے حافظ محمود شیرانی، قاضی عبدالودود اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی سے، ان میں شیرانی صاحب اور قاضی صاحب محقّق تھے اور عرشی صاحب متنی نقاد۔ عمر کے اعتبار سے حافظ محمود شیرانی ان تینوں میں بڑے تھے اور میرے خیال سے تحقیق کے میدان میں بھی ان کا مرتبہ بلند تھا۔ شیرانی صاحب کا بنیادی کام تحقیق کے میدان میں ہے۔''

(ارمغان جلد ا، تحقیق وتنقید، ۲۰۱۲ء، ص ۴۵۷)

سوال یہ اُٹھتا ہے کہ کیا تحقیقی بصیرت کے بغیر متنی تنقید اور متن کے تعین کا کام ممکن ہے۔ تصریفات وتحریفات نیز الحاقی عناصر کے علم کے لئے بھی تحقیقی آلات وتحقیقی اصولوں کو بروئے کار لانا پڑتا ہے۔ صحیح متن کی دریافت بھی حق کی دریافت کا دوسرا نام ہے۔ متنی تقابل بھی تحقیق کا عمل ہے جس کے لئے تنقیدی بصیرت بھی اتنی ہی ناگزیر ہے۔

07.05 اُردو میں لسانی تحقیق کی روایت اور محمود شیرانی

کوئی بھی زبان یک لخت وجود میں نہیں آتی اور نہ کسی زبان کے تعلق سے یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ وہ بے میل ہے یا اس کی ترکیب اور ارتقا کے عمل میں دوسری زبان/زبانوں کا کوئی حصّہ ہی نہیں ہے۔ زبانیں دوسری زبانوں سے مل کر بنتی بھی ہیں، مرتی بھی ہیں۔ زبانوں یا کسی نئی زبان کے پیدا ہونے کے جہاں کچھ تاریخی اور اقتصادی اسباب ہوا کرتے ہیں اسی طرح ان کے معدوم ہونے کے بھی کچھ اسباب ہوتے ہیں۔ جس طرح کسی زبان کو اپنی تکمیل اور پختگی تک پہنچنے میں صدیاں لگ جاتی ہیں اسی طرح کسی زبان کے مرنے یا معدوم ہونے میں بھی ایک بڑا عرصہ درکار ہوتا ہے۔ یوروپ میں نشاۃ الثانیہ تک لاطینی ایک دفتری اور علمی زبان تھی مقامی زبان کی قوت کا ثبوت سب سے پہلے دانتے (Dante) نے پیش کیا۔ ہمارے یہاں بھگتی شعرا اور صوفیوں نے عوامی بولیوں کو ذریعۂ اظہار بنایا۔ یہ ملی جلی اور مخلوط بولیاں ہیں لیکن ان میں کبیر اور تُلسی داس نے اعلیٰ درجے کی شاعری کی۔ شمالی ہند مختلف جنگوں کا مرکز تھا۔ مختلف قومیں بھی روزگار کی تلاش، تجارت یا پناہ حاصل کرنے کی غرض سے آتی رہیں، جاتی رہیں یا یہیں آباد ہوتی رہیں۔ ہندوستان ایک کثیر آبادی والا ملک ہے اور آبادیوں میں غیر معمولی اضافہ ہونے کا سبب اس کا معتدِل موسم اور امن پسندانہ ماحول بھی ہے۔ اسی لئے ہندوستان ہمیشہ سے ایک کثیر لسانی ملک رہا ہے۔

اُردو کی پیدائش کے تعلق سے مختلف ماہرینِ لسانیات نے مختلف نظریات قائم کیے۔ اُنیسوی صدی سے لسانی کشمکش کا آغاز ہوا تو مختلف علاقوں کی بولیوں سے اُردو کے رشتوں کی بحث کی بھی ابتدا ہوئی۔ انشا اللہ خاں انشؔا بیک وقت کئی زبانوں کا علم رکھتے تھے۔ انہوں نے اُردو کو ایک اور پیچ میلی زبان سے موسوم کرتے ہوئے اسے کئی زبانوں کا عطر کہا تھا اور کئی زبانوں میں پنجابی بھی ایک تھی۔ ڈاکٹر عبدالغفار شکیل کی تحقیق کے مطابق سیر علی سرخوش نے محمود شیرانی سے قبل اپنی تصنیف تذکرہ اعجازِ سخن میں یہ نظریہ پیش کیا تھا۔

اس سلسلے میں سرخوش کے درج ذیل اقتباسات لائقِ توجہ ہیں۔

> ''سلطان مودود جو محمود غزنوی کا پوتا تھا اسی کے عہد میں پنجاب کے ہندو اور سرحدی مسلمانوں کو باہم معاشرت رکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ اس وقت نَو وارد مسلمانوں نے ہندوؤں کے بہت سے طور طریقے اختیار کر لیے اور ان کی عام سمجھ بوجھ میں بھی ایک بڑا تغیّر واقع ہو گیا اور صوبۂ پنجاب میں ایک نئی زبان جسے اُردو کہتے ہیں بالعموم رائج ہو گئی۔ یہ اُردو گویا اسی سن وسال میں یہاں جاری ہوئی تھی۔''
>
> (غبارِ خاطر، ص...۱۶۶)

اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ یہ نئی زبان قدیم پنجابی تھی۔ بقول ان کے:

> ''اس امر کے متعلق مؤرّخوں کو کچھ دھوکا ہوا ہے۔ کیوں کہ وہ زبان جو یہاں نئی رائج ہوئی تھی درحقیقت اُردو نہیں تھی بلکہ وہ قدیم پنجابی تھی جو اس طرح بنی تھی کہ رائج الوقت پنجابی پراکرت یعنی ہندی زبان

میں ترکی اور فارسی کے الفاظ بکثرت مل گئے تھے اور ایک زبان محض بول چال کے لئے وضع ہوگئی تھی جسے بعد کو پنجابی کہا گیا اور جو عہدِ برطانیہ سے پہلے شاید لکھنے پڑھنے میں کبھی نہیں آئی.....لہٰذا اُردو زبان کی نہایت ابتدائی شکل وصورت پنجابی ہی ہے۔''

(غبارِ خاطر،ص...۱۶۶)

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ محمد حسین آزاد کے اس نظریے سے کہ اُردو برج بھاشا سے نکلی ہے، لسانیاتی نقطۂ نظر کے اعتبار سے یہ زیادہ قابل قبول نظریہ تھا۔ مولانا شیرانی نے مختلف لسانی دلائل کی روشنی میں اسے اور زیادہ تقویت پہنچائی۔ مولانا شیرانی نے ''پنجاب میں اُردو'' ۱۹۲۸ء میں سریانی، پنجابی اور اُردو کا لسانیاتی تقابل کرتے ہوئے دعویٰ کیا ہے کہ اُردو پنجابی سے نکلی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اُردو اور پنجابی کے ایسے الفاظ کی بہت بڑی تعداد ہے جو دونوں میں مستعمل ہیں لیکن عربی و فارسی الفاظ کی شمولیت اور آمیزش کا سلسلہ تو محمد بن قاسم اور سبکتگین سے پہلے سے چلا آ رہا ہے۔ پنجابی ہی نہیں ہندوستان کی دوسری بولیوں کے الفاظ، محاورے اور کہاوتیں بھی اُدھر سے اِدھر اور اِدھر سے اُدھر پہنچ رہی تھیں۔

علاء الدین خلجی کی فتح دکن ۱۳۰۷ء اور محمد تغلق کی راجدھانی کی منتقلی ۱۳۲۶ء میں شمالی و دکنی زبانوں اور تہذیبی رشتوں میں ایک نئے دَور کا آغاز ضرور ہوا لیکن ان تاریخی واقعوں سے بہت پہلے سے شمال و دکن کے تہذیبی، اقتصادی اور سیاسی روابط قائم تھے۔ دکنی میں اُردو ادب کا آغاز پہلے ہوا۔ ظاہر ہے جن زبان کا ادب وہاں تخلیق پا رہا تھا اس سے بہت پہلے اُردو نے وہاں قدم جما لیے تھے۔ ایسا نہیں ہے کہ ہریانی، کھڑی اور دہلی کے اردگرد کی بولیاں مسلمانوں کی فتحِ دہلی کے بعد رائج ہوئیں یا پروان چڑھیں۔ ان کا ارتقا بھی صدیوں کے تال میل کا نتیجہ ہے۔ جس طرح علاء الدین خلجی اور محمد تغلق کے بعد شمالی ہند سے ہجرتوں کا سلسلہ شروع ہوا، اس طرح پنجاب سے ہجرت کے واقعوں سے تاریخ کے اوراق خالی ہیں۔ مسعود حسین خاں نے جدید آریائی زبانوں کی پیدائش کے سلسلے میں دو امور پر خصوصاً زور دیا ہے جن کے بغیر ہر قسم کا مطالعہ اور تنقید بے سود ثابت ہوگی:

﴿**الف**﴾ ہند آریائی زبان کے ارتقا کی عہدِ قدیم سے نشان دہی نہ کی جائے بالخصوص جب تک کہ عہدِ اَپ بھرنش کی ادبیات کا جائزہ نہ لیا جائے۔

﴿**ب**﴾ جب تک کہ تقابلی مطالعہ تمام ہم سایہ بولیوں کے ساتھ نہ کیا جائے۔

(مقدّمہ تاریخِ زبان اُردو،ص...۲۰۶)

شیرانی نے جہاں پنجابی اور دکنی کی مماثلتوں پر تحقیقی بحث کی ہے۔ اس کی لسانی اہمیت ہے اور شیرانی کے بعد ان مباحث کو اور تقویت ملی۔ سب سے مقدم مسعود حسین خاں کا وہ لسانی تجزیہ ہے جس میں انہوں نے ہندوستانی زبانوں اور بولیوں کی لسانی تاریخوں کا تعیّن کرتے ہوئے اُردو کا مولد نواح دہلی میں بولی جانے والی اس زبان کو قرار دیا جسے کھڑی بولی کہتے ہیں۔ اُردو ہی نہیں ہندی بھی کھڑی بولی سے نکلی ہے۔ کھڑی بولی کے ساتھ اس کے ارتقا اور لغات کو وسعت بخشنے میں ہندوستان کی دوسری بولیوں کے علاوہ عربی و فارسی کا بھی بہت بڑا حصّہ ہے۔ اُردو کے نوّے فیصد سے زیادہ افعال اور اکثر صرف ونحو کے قاعدے بھی ہندوستانی ہیں۔

07.06 آبِ حیات وشعرالعجم پر محمود شیرانی کے مباحث

''آبِ حیات'' محمد حسین آزاد کی ایک ایسی تصنیف ہے، جس کا دامن تحقیق وتنقید کی رُو سے تنگ ہے اور شگفتہ بیانی اور اُسلوب کی رنگینی کے باعث اس کے دوسرے عیوب پر ایک عرصے تک کوئی غور ہی نہیں کیا گیا۔ حتیٰ کہ 'مقدّمہ شعروشاعری'' بھی عرصۂ دراز تک اس شہرت سے محروم رہی جو شہرت آبِ حیات کو ملی اور ارباب نظر اس کی جادو بیانی کے نشے سے سرشار ہوتے رہے۔ شبلی بس یہ کہہ کر رہ گئے کہ ''وہ (آزاد) گپ بھی ہانکتا ہے تو الہام معلوم ہوتا ہے۔'' (الفاظ دوسرے ہیں)

محمود شیرانی نے اگر معروضی طریقۂ کار کے تحت آبِ حیات کے اسقام کی طرف متوجہ کیا تو مسعود حسن رضوی نے آبِ حیات کا دفاع کیا جو تاویلات پر زیادہ مبنی ہے۔ محمود شیرانی نے آزاد کے اکثر مفروضات اور بیان کردہ واقعات کو محض من گھڑنت ثابت کیا ہے۔ شیرانی نے تحقیق میں ایمان داری، اخلاقی جرأت، غیر جانب داری اور حق گوئی پر سختی کے ساتھ زور دیا اور خود بھی ان قدروں سے وابستہ رہے۔ شیرانی آبِ حیات کی زبان کے طلسم غیر معمولی اثر آفرینی اور آزاد کی انشا پردازی کے قائل ہیں۔ اُنہیں یہ بھی تسلیم ہے کہ ''آبِ حیات'' تذکروں کی تاریخ میں کئی اعتبار سے افضل ہے۔ اسے پہلی تاریخ بھی کہہ سکتے ہیں مگر اس شرط کے ساتھ کہ تاریخ نگاری کے لئے تحقیقی کدوکاوش پہلا تقاضہ ہے اور آزاد اس تقاضے سے عہد برآ نہیں ہو سکے۔

شیرانی کا ایک اہم تحقیقی کارنامہ ''تنقید شعرالعجم'' کے ساتھ مخصوص ہے جو شبلی کی لکھی ہوئی فارسی ادبیات کی تاریخ ہے۔ شبلی کی تصنیف کا کینوس وسیع ہے اور انہوں نے اس کی ابواب بندی، تاریخی تعیّن، تہذیبی تناظرات، شعرا کے سوانح، ان کارناموں اور قدر شناسی میں خاصی محنت اور توجہ سے کام لیا ہے لیکن تحقیق کے لئے جس یک سُوئی اور انہماک کی ضرورت ہے اس کی ان میں کمی تھی۔ جو چیزیں جس صورت میں ان تک پہنچیں یا انہیں نظر آئیں انہیں اسی صورت میں انہوں نے پیش کر دیا۔ شاعری کے مطالعے کے بارے میں انہوں نے کچھ اصول ضرور قائم کیے۔ تخیّل اور محاکات پر ان کے خیالات اور شاعری کو ذوقی اور وجدانی چیز قرار دینے کو ان کی یافت کا نام دیا جا سکتا ہے لیکن اکثر ان کے مطالعے سرسری ہیں جنہیں ان کی رومانی نثر نے اور وسعت بخشنے سے روک رکھا۔ ظفر احمد صدیقی کے مطابق ''تنقید شعرالعجم'' میں شیرانی نے جن اُمور پر اپنے اختلافات درج کیے ہیں وہ یہ ہیں:

﴿۱﴾ ایرانی امرا وسلاطین کی سیاسی تاریخ۔

﴿۲﴾ ایران اور اس کے اطراف واکناف کا جغرافیہ۔

﴿۳﴾ شعرا کی ولادت، وفات، مدّتِ عمر اور مختلف درباروں سے وابستگی کے سنین۔

﴿۴﴾ سیاسی، تاریخی اور ادبی شخصیتوں کے اسماء، القاب، ولدیتیں، کنیتیں اور نسبتیں۔

﴿۵﴾ اشعار کے انتسابات۔

مذکور الصدر اختلافی مباحث ''تنقید شعرالعجم'' میں سیکڑوں کی تعداد میں موجود ہیں۔ انہیں کو کتاب کی جان اور روح بھی کہا جا سکتا ہے۔ درحقیقت یہی وہ مباحث ہیں جہاں حافظ شیرانی کی ژرف نگاہی، نکتہ آفرینی اور تنقیدی بصیرت اپنے عروج پر دکھائی دیتی ہے۔''

(ارمغان جلد ا، تحقیق وتنقید، ۲۰۱۲ء، ص...۵۷۴)

ظفر احمد صدیقی نے ان الزامات کی تردید کی ہے جنہیں شیرانی نے غلط بیانی، جہالت وعصبیت اور تدلیس وتلبیس سے تعبیر کیا ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ ان کی کوئی ایک مثال ''شعرالعجم'' سے پیش نہیں کی جاسکتی۔ بعض اُمور جیسے تضاد بیانی، نقصِ معلومات، قوتِ فیصلہ کی کمی، غیر معتبر ماخذ پر اعتماد، درایت کا فقدان اور مبالغہ آرائی کے تعلّق سے ان کا خیال ہے کہ اُنہیں بھی کلی صداقت کا حامل قرار نہیں دیا جاسکتا کیوں کہ ان میں متعدّد مقامات پر شیرانی صاحب کے خیالات سے اختلاف کی گنجائش موجود ہے البتہ ان کی جزوی صداقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ دراصل تحقیق کی رو سے شیرانی صاحب کے ناقابل معافی کے رویے کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے لیکن اس کا دوسرا پہلو مذمت آمیز بھی ہے کہ وہ کبھی کبھی ایسی غیر تنقیدی زبان بھی استعمال کر جاتے ہیں جو ان جیسے اسکالر کو زیب نہیں دیتا۔

شیرانی صاحبِ علم تھے۔ وہ یقیناً بقول رشید حسن خاں اُردو تحقیق میں ''معلّمِ اوّل'' کی حیثیت رکھتے ہیں: مسعود صاحب کا کہنا ہے کہ:

> ''شیرانی نے اپنی تصنیف میں نمبر (الف) کو نظر انداز کر کے اپنے لسانی نظریے کو بے بنیاد کر دیا ہے اور نمبر (ب) کا خیال نہ رکھنے کی وجہ سے وہ بعض یک طرفہ لسانی نتائج مرتب کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ ہر دو ہم سایہ بولیوں میں کچھ نہ کچھ مشترک خصوصیات ضرور ہوتی ہیں۔ چناں چہ اُردو اگر ایک طرف اپنی قواعد کے اعتبار سے پنجابی سے ملتی جلتی ہے تو دوسری طرف ہریانی سے بھی مماثلت رکھتی ہے۔ آجکل کی معیاری اُردو مرادآباد اور بجنور کے اضلاع کی بولی سے قریب تر ہے لیکن اپنے ارتقا کے ابتدائی مدارج میں یہ جمنا پار کی ہریانی بولی سے زیادہ قریب تھی۔ قدیم دکنی میں بعض اثرات پنجابی کے بھی جھلکتے ہیں اس لئے تقابلی مطالعے کا میدان ذرا وسیع ہونا چاہیے اور جہاں تک ہو سکے پنجابی، اُردو، ہریانی اور برج بھاشا کی ادبیات کے قدیم ترین نمونوں پر نظر رکھنی چاہیے۔''

(مقدّمہ تاریخ زبان اُردو، ص....۲۰۶)

شیرانی فارسی زبان اور اس کی تاریخ کے علاوہ فارسی ادب اور ایرانی سلاطین کی تاریخ کا بھی گہرا علم رکھتے تھے۔ انہوں نے تحقیقی اصول کے تحت ''شعرالعجم'' کا تنقیدی مطالعہ کیا تھا۔ شبلی بہ یک وقت کئی محاذوں پر برسرِ کار تھے۔ ان کے مقاصد کی فہرست نسبتاً طویل تھی۔ جب کہ شیرانی صرف اور صرف تحقیق کے آدمی تھے۔ تحقیق کا عمل، صرف تحقیق سے وفاداری کا تقاضہ کرتا ہے۔ شبلی کئی گھوڑوں پر سوار تھے اسی لئے ان سے ہم یہ توقع ہی نہیں کر سکتے کہ وہ تاریخ کے ان مطالبات پر پورا اُتر سکیں گے جن کا تعلّق تحقیق سے ہے۔ جہاں تک فارسی زبان و ادب اور تاریخ کے علم کا تعلّق ہے شیرانی بلاشبہ شبلی سے بڑے عالم تھے۔ علاوہ اس کے شیرانی کو اپنے اُصولوں میں سختی برتنے کا ایک جواز یہ بھی تھا اور صحیح تھا کہ ''ہماری تاریخیں رطب و یابس، نمث وسمین اور دروغ وراست کا مجموعہ بن رہی ہیں۔ ہماری جرح وتعدیل کے پرانے ہتھیار پڑے پڑے زنگ آلود ہو گئے لیکن اس خوش اعتقادی کا روسیاہ جس نے ہمیں ان کے استعمال سے روک رکھا ہے۔

07.07 فردوسی کا شاہ نامہ اور محمود شیرانی کی تحقیق

شیرانی نے اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں لکھی ہوئی ان تحریروں کے متون میں ''حق و ناحق'' کی بالخصوص جستجو کی جو معروف ہیں اور معروف ہونے کی بنا پر ان سے جو گمراہی پھیلنے کے اندیشے ہیں وہ کئی نسلوں تک منتقل ہوتے رہیں گے۔ تنقید ''شعرالعجم'' تنقید بر آبِ حیات، مغلوں سے قبل فارسی ادب، خزائن الفتوح کے علاوہ مُلّا دوپیازہ اور جعفر زٹلی کی مروّجہ سوانح عمریوں کا جائزہ اور تنقید، شاہ نامے سے فردوسی کے حالات، شاہ نامے کی نظم کے اسباب اور زمانہ، فردوسی کا مذہب وغیرہ شیرانی کے تحقیقی کمالات کے ضامن ہیں۔ شیرانی مرحوم کے بعد بھی ''پنجاب میں اُردو'' کے علاوہ شیرانی کے دوسرے تحقیقی دعوے اور تحقیقی نتائج کی حاکمیت آج بھی برقرار رہے۔ شیرانی نے فردوسی کے سوانح یا دوسرے پہلوؤں پر جو سخت گیر رویہ اختیار کیا تھا، اس کی تردید اہل ایران بھی نہیں کر سکے۔ شیرانی کے علم و مطالعے کی وسعت، ان کی ژرف نگاہی، ان کی حق گوئی و معروضیت، ان کی تعقّل پسندی، ان کی استدلالی قوّت، ان کے داخلی اور خارجی شہادتوں کے دریافت کے طریقے، صداقت کی کُنہ تک پہنچنے کی اُن کی للک اور تڑپ، جرح و بحث کا ان کا انداز بھی ایک ایسی مثال ہے جس نے مزید تحقیق کی راہیں وا کیں، روایت پر آنکھ بند کر کے یقین کرنے کے رویّے کا سدِّ باب کیا۔ محقّق کو ایک وکیل ہی نہیں مصنف ہونے پر تاکید کی۔

ہندوستان میں رہ کر فارسی ادبیات و تاریخ کو تحقیق کا موضوع بنانا صرف اور صرف شیرانی صاحب ہی کا کمال تھا۔ تنقید شعرالعجم اور فردوسی کی چھان پھٹک یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ وہ فارسی کے جید عالم تھے۔ ان کی علمیت اور باریک بینی کا اعتراف سب ہی نے کیا ہے۔ محمد اکرام نے اس نکتے پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے ان کے تحقیقی طریق کار کے بعض اہم پہلوؤں کی بھی نشان دہی کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''علامہ شیرانی شاید دَورِ حاضر میں اُردو اور فارسی ادبیات کے سب سے زیادہ ٹھوس اور جید عالم ہیں اور ان کے مضامین پڑھ کر عقل حیران ہوتی ہے کہ قدیم علما میں کیسے کیسے گوہر ہائے شبِ چراغ موجود ہیں۔ جن علوم سے انہیں ربط ہے ان کے متعلّق ان کی معلومات کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ نگاہ ان کی بڑی تیز ہے۔ تلاش واقعات میں تساہل یا خیالات میں جھول ان کے نزدیک ایسے جرائم ہیں جن کا کوئی کفارہ نہیں۔ قدرتی بات ہے کہ جن چیزوں کو عام علما اپنی دسترس سے بہت بالا سمجھتے ہیں وہ علامہ شیرانی کے بلند معیار پر پوری نہیں اُترتیں۔''
>
> (ارمغان، ص...۳۴۵)

شیرانی نے بہت سے بھرم توڑنے کے بعد فردوسی کے شاہ نامے ہی سے داخلی شہادت کو بنیاد بنایا اور خود فردوسی کے بیان کو معتبر قرار دیا ہے۔ شیرانی خود مصنف کے بیان کے علاوہ اس کے زبان و بیان اور مصنف کے سوانح کے علاوہ اس کے تاریخی تناظر اور گرد و پیش کو بھی نظر میں رکھتے ہیں جو حقائق کی دریافت میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ انہیں دلائل کی بنیاد پر وہ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ فردوسی نے محمود غزنوی کی خوشنودی کے پیشِ نظر شاہ نامے کی تخلیق نہیں کی تھی جیسا کہ عام طور پر اسی خیال کو مستند مان کر شاہ نامے کی شانِ نزول سے وابستہ کر کے دیکھا جاتا رہا ہے۔ ایک قدیم پہلوی کتاب دفتر یاستان یا ''نامۂ خسروان'' یا دفتر پہلوی کو اس کا ماخذ بتاتے ہوئے ان دقتوں کا بھی حوالہ فراہم کرتے ہیں جو شاہ نامے کے مواد کو اکٹھا کرنے میں فردوسی کو پیش آئے تھے۔ شیرانی نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ فردوسی نے سلسلے وار اسے نہیں لکھا تھا بلکہ بعد میں اس کے مختلف اجزاء کو ایک خاص ترتیب دی گئی ہے۔

شیرانی نے فردوسی کے شیعہ ہونے کو بھی ایک مقبول عام روایت اور من گھڑنت مفروضہ قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ان اَدوار میں لوگ ''مذہبی نوعیت'' کے بہتان لگانے میں خاص رغبت رکھتے تھے۔ فردوسی شاہ نامے کے ابتدائی حصّے میں خلفاے راشدین کی منقبت کرتا ہے۔ اس کے بعد جو حصّہ شامل ہے شیرانی اسے الحاقی کہتے ہیں جس میں محمود غزنوی کو خطاب کر کے اس کے سُنّی ہونے پر طنز و ملامت کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جسے شیرانی فردوسی کے مزاج کے خلاف کہتے ہیں۔ شاہ نامے سے داخلی شہادتیں اخذ کر کے وہ فردوسی کو اہلِ سنت قرار دیتے ہیں۔ فردوسی کے کئی دشمن بھی تھے اور مختلف اوقات میں مختلف بہتان اس پر لگائے جاتے رہے۔

مذکورہ اُمور پر شیرانی نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے:

> ''جس طرح فردوسی کے حالات کے متعلق ہماری معلومات ناکافی اور غیر یقینی ہے، فردوسی کے مذہب کے متعلق بھی ہمارا علم ناقابل اعتبار ہے۔ ہم نے یہ مان لیا ہے کہ وہ شیعہ تھا اور اسی پر مطمئن ہیں لیکن تحقیقات کی روشنی میں ہمارا یہ اعتقاد وہم وخیال سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ پرانی روایات اس کو شیعہ بیان کرتی ہیں۔ شاہ نامہ اس بارے میں متضاد اور متناقض شہادت پیش کرتا ہے جس کی رَو سے فردوسی شیعہ بھی مانا جا سکتا ہے اور سُنّی بھی۔ ظاہر ہے کہ ایک شخص شیعہ اور سنی دونوں ہو ہی نہیں سکتا۔ البتہ ایک امر یقینی ہے کہ جہاں شاعر کو اس کے دشمنوں نے مجوسی، فلسفی، دہریہ، ملحد، کافر اور معتزلی کہا وہاں اس کو رافضی بھی کہا۔ اب دشمنوں کے بیانات پر کہاں تک اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ اگر وہ ملحد اور مجوسی تھا تو شیعہ بھی تھا۔ اگر یہ نہیں تھا تو وہ بھی نہیں تھا۔''
>
> (ارمغان، ص...۳۵۴)

07.08 محمود شیرانی کی تحقیق کا عمل

دراصل محمود شیرانی جس مسئلے پر قلم اُٹھاتے ہیں، ایک کے بعد ایک معلومات کا ایک سلسلہ سا قائم کر دیتے ہیں۔ قدیم مآخذ کی تلاش میں وہ کوئی کور کسر اُٹھا نہیں رکھتے۔ جب تک خود مطمئن نہیں ہو جاتے، اُسے اپنی تحریر کا حصّہ نہیں بناتے۔ استخراجِ نتائج میں ان کا استقلال اور یک سُوئی دوسروں کے لئے لائقِ تقلید عمل ہے۔ متنی حقائق کی جستجو میں وہ لسانیات، تاریخ اور تہذیب کے وسائل بھی بروئے کار لاتے ہیں۔ تحقیق میں تقابل کو بھی حقیقت کی کنہ تک پہنچنے کا ایک ذریعہ قرار دیتے ہیں۔ انہوں نے محض خارجی شواہد ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ داخلی شہادتوں کی راہ سے بھی مقبولِ عام مغالطوں کو رفع کرنے کی کوشش کی۔ دراصل شیرانی مرحوم کو گم شدہ کتابوں کو دریافت کرنے میں لطف بے پایاں میسرّ آتا ہے۔ خواہ اس طرح کی کوشش میں کتنی ہی دقتوں کا سامنا ہو۔

محمود شیرانی محقّق تھے، تدوین کار تھے، ماہرِ لسانیات تھے، تنقید کا گہرا ادراک رکھتے تھے اور عروضیات کے ماہر تھے۔ محمود شیرانی کی نظر ہندوستان کی سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی تاریخ پر گہری تھی۔ زبانوں کی تاریخ کا گہرا علم رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں ''پنجاب میں اُردو'' ایک گراں قدر تحقیقی کارنامہ ہے۔ ظاہر ہے اُردو کی مولد کے بارے میں موجودہ تحقیق کے مطابق شیرانی کے نظریے کو قبول نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ ضرور ہے کہ اُردو کی جنم بھومی کے سلسلے میں آزاد کی اس رائے کی روشنی میں کہ اُردو برج بھاشا سے نکلی ہے، شیرانی کے نظریے نے تحقیق کے لئے اور بہت

سی راہیں کھول دیں۔سلیمان ندوی نے ''نقوشِ سلیمانی'' میں وادیِ سندھ کو اُردو کا مولد ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ بعد کی تحقیقات نے بالخصوص مسعود حسن خاں کی تحقیق نے یہ ثابت کیا کہ اُردو کھڑی بولی کے اس علاقے میں پیدا ہوئی جس کا تعلق نواحِ دہلی سے ہے۔محمود شیرانی کی تحقیق سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ اُردو کا پنجاب کی سرزمین اور وہاں کی بولیوں سے گہرا تعلق ہے۔'' پنجاب میں اُردو'' ان کی تحقیقی بصیرت اور لسانیاتی علم وآگہی کی پوری طرح مظہر ہے۔موجودہ اَدوار میں ان کے نظریے کو اگر جھٹلایا گیا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہے کہ اس کی کوئی معنویت ہی نہیں ہے۔

''تنقید شعرالعجم ''اور'' آبِ حیات پر ایک نظر'' (نامکمل) میں انہوں نے اغلاط وتسامحات کی نشان دہی کی ہے۔''یوسف زلیخا'' کے بارے میں انہوں نے اس مقبولِ عام تصوّر کو غلط ثابت کیا کہ یہ فردوسی کا کارنامہ نہیں ہے۔خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے کلام میں الحاقی عناصر کی نشان دہی کی۔''قصّہ چہار درویش'' کو امیر خسرو کے بجائے ضیاء الدین خسرو کی تصنیف قرار دیا۔محمود شیرانی کی مشہور تصنیف '' پنجاب میں اُردو'' میں اُردو کی پیدائش کے سلسلے میں ان کا نظریہ اب اپنی معنویت کھو چکا ہے لیکن شیرانی نے جس طرح پنجابی، دکنی اور دوسری زبانوں کی چھان پھٹک کی ہے اور لسانی تجزیے کیے ہیں، ان کی قدر و قیمت کبھی کم نہیں ہوگی۔

رشید حسن خاں نے محمود شیرانی کے کارناموں کو معیاری اور مثالی قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

> ''اُردو میں تحقیق کا باضابطہ آغاز تو شیرانی صاحب سے ہوتا ہے۔ان کو بہ آسانی تحقیق کا معلّمِ اوّل کہا جاسکتا ہے۔ نئے مآخذ کی تلاش اور اوّلین مآخذ کی اہمیت کا احساس ان ہی کے زمانے سے شروع ہوتا ہے۔ انہوں نے جرح وتعدیل اور احتساب کی صحت مند روایت قائم کی۔انہوں نے عملی طور پر یہ بتایا کہ عقیدت اور احتساب میں تضاد ہے اور اعترافِ کمال اور احتساب میں تضاد نہیں۔ ہمارا معاشرہ انتہا پسندی کی حد تک روایت پرست رہا ہے۔شیرانی صاحب نے اس روایت پرستی پر کاری ضرب لگائی اور ردّ وقبول کے لئے منطقی استدلال کی ضرورت کا احساس دلایا۔''
>
> (تحقیق وتدوین سمت ورفتار، ص..۱۳۵)

محمود شیرانی کا ذہن تحقیق کے تعلّق سے بہت صاف تھا۔ان کا کہنا تھا کہ:

﴿۱﴾ تحقیق کا مطلب سچائی کی تلاش ہے۔

﴿۲﴾ جس سے علم انسانی میں اضافہ ہوتا ہے۔

﴿۳﴾ اس کے لئے مستقل جستجو اور لگاتار محنت درکار ہے۔

﴿۴﴾ حقائق پر مبنی جو علم ہمیں ورثے میں ملا ہے وہ ہزاروں لوگوں کی صدیوں کی محنت کا نتیجہ ہے۔

﴿۵﴾ جوں جوں نئے حقائق ومصادر دریافت ہوتے جائیں گے سابقہ معلومات میں ترمیم وتنسیخ کے نتیجے میں ہمارا علم زیادہ معقول، اطمینان بخش اور جامع ہوتا چلا جائے گا۔

''شعرالعجم ''شبلی نعمانی کی ایک معرکتہ الآرا فارسی شاعری کی تاریخ ہے۔محمود شیرانی نے''تنقیدِ شعرالعجم ''میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ شبلی ایک محقّق سے زیادہ نقّاد ہیں اور نقّاد کا کردار ہی''شعرالعجم ''کے مطالعے میں حاوی ہے۔محمود شیرانی نے اس دَور میں شعرالعجم کی اغلاط کی نشان دہی کی تھی جب چاروں طرف شبلی کے کارناموں کا ڈنکا بج رہا تھا اور شعرالعجم کو ان کی ادبی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ خیال کیا جارہا تھا۔

07.09 محمود شیرانی ایک سخت گیر محقق

شیرانی اس خیال سے متّفق نہیں تھے کہ بزرگوں کی خطائیں قابل معافی ہیں۔تحقیق کے عمل میں وہ کسی بھی رعایت کے قائل نہ تھے کیوں کہ سچائی کو نظر انداز کرنا یا سچائی کی پردہ پوشی کرنا علمی و ادبی میدان میں یہ ایک ایسا جرم ہے جو نا قابلِ معافی ہے۔جو تحقیق کے عمل میں گمراہی کو فروغ دیتا ہے۔اس طرح کا عمل ان محقّقین کے لئے ضروری ہے جن کا ایقان صاف گوئی،حق گوئی اور اخلاقی جرأت پر ہے۔مظہر محمود شیرانی نے لاہور کے محقّقین کو''دبستانِ لاہور'' سے موسوم کرتے ہوئے ان کے سخت رویے کو ان کی نمایاں خصوصیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''دبستانِ لاہور کے علَم برداروں میں جو صحیح معنوں میں اُردو میں تحقیق کے علَم بردار بھی تھے۔حافظ محمود شیرانی،مولوی محمد شفیع،محمد اقبال کے نام سرِ فہرست ہیں۔''ان اصحابِ کمال کے ہاں تحقیقی کام میں غفلت یا عدمِ احتیاط جرائم میں داخل تھی اور ایسے مواقع پر ان کی گرفت سخت ہوتی تھی۔اس محاسبے کی زد میں بعض بڑی بڑی شخصیتیں بھی آتی تھیں۔ چاہے سید سلیمان ندوی ہوں یا پروفیسر حبیب،ان کی کڑی تنقید معاف کرنا نہیں جانتی تھی۔ پروفیسر شیرانی کی تنقید شعرالعجم،تنقید بر آبِ حیات،مغلوں سے قبل فارسی ادب،خزائن الفتوح اس رجحان کی عظیم یادگار ہیں۔اب چاہے کوئی اسے منفی طریقہ قرار دے، چاہے ظالمانہ کہے،حقیقت یہ ہے کہ اس سخت رویّے نے ہمارے تحقیقی معیار کو مدّتوں گرنے نہیں دیا اور کسی بڑے سے بڑے محقق کو بھی یہ جرأت نہ تھی کہ طومار نویسی کو شعار بنا کر کھرے کھوٹے کی تمیز مٹا سکے۔''

(ارمغان،ص...۴۴۳....۳۴۴)

محمود شیرانی نے خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے دیوان میں الحاقی کلام کی بھی نشان دہی کی اور یہ ثابت کیا ہے کہ معین ہروی نام کے ایک بزرگ کا کلام اس میں شامل ہوگیا ہے۔محمود شیرانی کے مقالات موسوم بہ''مقالاتِ حافظ محمود شیرانی'' کو ۱۹۶۶ء میں مجلس ترقی ادب لاہور نے چھ جلدوں میں شائع کیا تھا۔ان مقالات میں''آبِ حیات پر ایک نظر'' کی خاص اہمیت ہے۔''آبِ حیات'' پر یہ پہلا مقالہ ہے جس میں محمود شیرانی نے آزاد کی تاریخی اغلاط،لسانی نظریے اور غیر تحقیقی طریقِ کار پر انگشت رکھی ہے۔محمود شیرانی کی نظر میں وہ محض ایک بلند پایہ انشا پرداز ہیں۔محمود شیرانی نے شبلی کو بھی رومانی طرز کا نقّاد کہا ہے۔تحقیق کے بنیادی تقاضوں کا لحاظ رکھے بغیر تحقیق کے عمل سے کوئی کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ نہیں ہوسکتا۔محمود شیرانی نے''شاہ نامہ'' ہی سے داخلی شہادتیں اخذ کیں اور یہ ثابت کیا کہ فردوسی کے بارے میں بہت سی باتیں یا ان سے منسوب کیے ہوئے واقعات بے بنیاد ہیں۔

قدرت اللہ قاسم کے ''مجموعۂ نغز'' کی ترتیب وتدوین اور اس پر لکھا ہوا ان کا مقدّمہ ایک مستقل حوالے کا حکم رکھتا ہے۔ محمود شیرانی نے ایک اعتبار سے تدوین کے طریقِ کار کا ایک خاکہ پیش کر دیا ہے۔ اُردو میں ''تدوین'' کا یہ بنیادی کام ہے جس کی بنیاد پر تدوین کے اصول قائم کیے گئے۔ وہ محمود شیرانی ہی ہیں جنھوں نے پہلی بار اس مغالطے کو دُور کیا کہ ''قصّہ چہار درویش'' امیر خسرو کی تصنیف ہے۔ انہوں نے مختلف دلائل وشواہد کی بنیاد پر یہ ثابت کیا ہے کہ اصلاً یہ تصنیف ضیاء الدین خسرو نام کے کسی بزرگ کی ہے۔

رشید حسن خاں شیرانی صاحب کو ''معلّمِ اوّل'' کہتے ہیں۔ ان کا یہ بھی خیال ہے:

> ''اُردو میں تحقیق کا باضابطہ آغاز تو شیرانی صاحب سے ہوتا ہے۔ اُن کو بہ آسانی تحقیق کا معلّمِ اوّل کہا جاسکتا ہے۔ نئے ماخذ کی تلاش اور اوّلین ماخذ کی اہمیت کا احساس اُن ہی کے زمانے سے شروع ہوتا ہے۔ انہوں نے جرح وتعدیل اور احتساب کی صحت مند روایت قائم کی۔ انہوں نے عملی طور پر یہ بتایا کہ عقیدت اور احتساب میں تضاد ہے اور اعترافِ کمال اور احتساب میں تضاد نہیں۔ ہمارا معاشرہ انتہا پسندی کی حد تک روایت پرست رہا ہے۔ وہم پرستی کی جڑیں بھی بہت گہری ہیں۔ مزید ستم یہ ہُوا کہ تصوّف کے زیرِ سایہ غیر متصوفانہ فروعات نے یہاں بہت فروغ پایا اور اُن کے اثر سے مفروضات کو بہ آسانی تسلیم کر لینے کا رجحان مزاجوں میں تہ نشیں ہو کر رہ گیا..... شیرانی صاحب نے اس روایت پرستی پر کاری ضرب لگائی اور ردّ وقبول کے لئے منطقی استدلال کی ضرورت کا احساس دلایا۔''

(ارمغان ۲۰۱۲ء، ص...۲۷۹.....۲۸۰)

07.10 خلاصہ

محمود شیرانی کا شمار صفِ اوّل کے محقّقین میں ہوتا ہے۔ اُردو تحقیق کی تاریخ میں جس مثلث کو کلاسیکی کا درجہ حاصل ہے وہ محمود شیرانی، قاضی عبدالودود اور امتیاز علی عرشی پر مشتمل ہے۔ ان کے بعد گیان چند، مالک رام، عبدالحق، مسعود حسن رضوی، مختارالدین احمد وغیرہ کے نام آتے ہیں۔ رشید حسن خاں کو ہم آخرالذّکر میں کا نام دے سکتے ہیں۔ محمود شیرانی کا مرتبہ کئی لحاظ سے امتیاز کا حامل ہے۔ وہ محقّق، فارسی زبان و ادب کے رمز شناس اور ماہر لسانیات بھی ہیں۔

محمود شیرانی ایک ایسے وقت میں پیدا ہوئے تھے جب تحقیق کی رفتار بے حد سُست تھی بلکہ ایسی تحقیق کی مثال سامنے نہیں آئی تھی جسے اعتبار کا درجہ دیا جاسکے یا جسے تحقیق کے عام وخاص اُصولوں اور تقاضوں کی روشنی میں مثالی قرار دیا جاسکے۔ محمود شیرانی کی ولادت ۱۸۸۰ء میں ٹونک (راجستھان) میں ہوئی۔ ان سے قبل سرسید نے تحقیق کی راہیں وا کر دی تھیں اور ان کی مساعی لائق صد ستائش ہیں۔ محمود شیرانی فنافی التّحقیق تھے۔ سرسید کو کئی محاذوں پر جوجھنا تھا اور محمود شیرانی نے اس عہد میں بلوغت کی منزلیں کیں جب کہ اعلیٰ تعلیم کے مواقع کہیں زیادہ معرضِ امکان میں تھے۔

محمود شیرانی نے ابتدائی تعلیم گھر میں پائی۔ منشی فاضل تک کے امتحانات لاہور میں پاس کیے۔ وہیں بارہویں کے امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد ۱۹۰۴ء میں بیرسٹری کے لئے لندن چلے گئے۔ اسی دَوران ان کے والد کا انتقال ہوگیا اور انہیں ملازمت کرنی

پڑی۔لندن میں ۱۹۱۳ء تک ان کا قیام رہا۔ چوں کہ اُردو فارسی کے علاوہ انگریزی میں وہ بے حد کمزور تھے اس کا اُنہیں ملال بھی تھا۔خصوصاً لندن میں انہیں انگریزی زبان کے معیاری لہجے پر قدرت حاصل کرنے میں کافی وقت لگا جس کا ذکر اُنہوں نے اپنے اکثر خطوط میں کیا ہے اور اپنے برادر خورد کو تاکید کرتے رہے کہ انگریزی زبان کی تحصیل کیوں ضروری ہے؟ تاکہ انہیں پریشانی کے اس تجربے سے نہ گزرنا پڑے جس سے وہ گزرے ہیں۔

لاہور لوٹنے کے بعد ۱۹۲۲ء میں اورینٹل کالج لاہور میں اُردو کے استاد کی حیثیت سے ان کی تقرّری ہوگئی۔۱۹۲۸ء سے پنجاب یونی ورسٹی میں انہوں نے خدمات انجام دیں۔اس دَوران وہ تحقیقی مضامین کے ساتھ ساتھ تدوین کے کام کی طرف بھی متوجہ رہے۔زبان،قواعد، عروض اور فارسی زبان وادب کی تاریخ پر ان کی گہری نظر تھی،ان کے تحقیق کے کاموں میں یہ علوم ان کے لئے چراغِ راہ کا کام دیتے رہے محمود شیرانی باریک بیں،بعض معاملات میں سخت گیر اور نتائج اخذ کرنے کی غیر معمولی صلاحیت سے بہرہ ور تھے۔۱۹۴۰ء میں ٹونک جو اُن کا آبائی وطن تھا،اس کی مٹی کا بلاوا آ گیا اور انہوں نے لاہور کو خیر آباد کہہ دیا۔۱۹۴۶ء میں وہ پیوند خاک ہوئے۔

آپ کے بارے میں مختصر معلومات درج ذیل ہے:

﴿۱﴾ محمود شیرانی ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے۔

﴿۲﴾ محمود شیرانی کا انتقال ۱۹۴۶ء میں ہوا۔

﴿۳﴾ محمود شیرانی سے باقاعدہ اُردو تحقیق کا آغاز ہوا۔

﴿۴﴾ محمود شیرانی اُردو تحقیق کے معلّمِ اوّل ہیں۔

﴿۵﴾ محمود شیرانی کی تحقیق کی بنیادیں ہیں:حق گوئی،انصاف پسندی،معروضیت۔

﴿۶﴾ محمود شیرانی،زبان،قواعد،عروض کے ماہر اور فارسی زبان وادب اور ایرانی تاریخ کے عالم ہیں۔

﴿۷﴾ ان کے اہم تحقیقی کارناموں میں ''تنقید بر آبِ حیات،تنقید شعرالعجم،خزائن الفتوح،مغلوں سے قبل فارسی ادب کے علاوہ شاہ نامہ سے فردوسی کے حالات،فردوسی کا مذہب،شاہ نامہ کی نظم کے اسباب اور زمانہ،مُلّا دوپیازہ اور جعفر زٹلی کی مروجہ سوانح عمریوں کا جائزہ اور تنقید اور کئی اعتبار سے ''پنجاب میں اُردو'' آج بھی ایک مستقل حوالے کا حکم رکھتی ہے۔

07.11 فرہنگ

الحاق	: کسی تصنیف میں اضافہ شدہ شئے یا حصّہ،منسلک	لسانیات	: زبان کا علم
بافت	: بناوٹ	مخطوطہ شناسی	: قلمی نسخوں کی شناخت
تصریف	: کسی لفظ کو تصریفی عمل سے گزارنا	معدوم	: غائب
جگر کاوی	: محنت ومشقّت	مہمیز	: تحریک،ترغیب
راست گفتاری	: سیدھی سچی بات کہنا	یافت	: حاصل

07.12 سوالات

مختصر سوالات

سوال نمبر۱ : شاہ نامہ کیا ہے اور کس نے لکھا ہے؟

سوال نمبر۲ : اُردو کے تین بڑے محققین کون ہیں؟

سوال نمبر۳ : سرسید نے کن کتابوں کی تدوین کی تھی؟

سوال نمبر۴ : اُردو پنجابی سے نہیں نکلی ہے تو کس سے نکلی ہے؟

تفصیلی سوالات

سوال نمبر۱ : شیرانی کے تحقیقی عمل پر اظہار خیال کیجیے۔

سوال نمبر۲ : محمود شیرانی کو کیوں معلّمِ اوّل کہا جاتا ہے؟

سوال نمبر۳ : ''تنقید شعرالعجم'' کی کیوں خاص اہمیت ہے؟

سوال نمبر۴ : شیرانی نے کن بنیادوں پر یہ دعویٰ کیا ہے کہ اُردو پنجاب سے نکلی ہے؟

معروضی سوالات

سوال نمبر۱ : محمود شیرانی کب پیدا ہوئے تھے۔

(الف) ۱۸۸۰ء (ب) ۱۸۹۶ء (ج) ۱۸۷۰ء (د) ۱۸۹۰ء

سوال نمبر۲ : محمود شیرانی کیا تھے؟

(الف) جذباتی (ب) حق گو (ج) بامروّت (د) عربی زبان وادب کے عالم

سوال نمبر۳ : 'آثارالصنادید' کی تدوین کس نے کی تھی۔

(الف) قاضی عبدالودود (ب) محمود شیرانی (ج) سرسید (د) امتیاز علی عرشی

سوال نمبر۴ : محمد حسین آزاد کو کس نے گپ باز کہا ہے؟

(الف) محمود شیرانی (ب) حالی (ج) قاضی عبدالودود (د) شبلی نعمانی

معروضی سوالات کے جوابات

جواب نمبر۱ : (الف) ۱۸۸۰ء جواب نمبر۳ : (ج) سرسید

جواب نمبر۲ : (ب) حق گو جواب نمبر۴ : (د) شبلی نعمانی

07.13 حوالہ جاتی کتب

۱۔	آبِ حیات	از	محمد حسین آزاد
۲۔	ارمغان	مرتبہ	جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
۳۔	شعرالعجم	از	شبلی نعمانی
۴۔	تعبیر و تفہیم	از	خلیق انجم
۵۔	پنجاب میں اُردو	از	محمود شیرانی
۶۔	معیار و میزان	از	مسیح الزماں

اکائی 08 : خواجہ احمد فاروقی

ساخت :

08.01 : اغراض ومقاصد
08.02 : تمہید
08.03 : خواجہ احمد فاروقی
08.04 : خواجہ احمد فاروقی کے حالاتِ زندگی
08.05 : خواجہ احمد فاروقی بحیثیت محقّق ونقّاد
08.06 : خواجہ احمد فاروقی کی خاکہ نگاری
08.07 : ترتیب وتدوین
08.08 : خواجہ احمد فاروقی بحیثیت مکتوب نگار
08.09 : خواجہ احمد فاروقی کے چند خطوط کے اقتباسات
08.10 : خلاصہ
08.11 : فرہنگ
08.12 : سوالات
08.13 : حوالہ جاتی کتب

08.01 اغراض ومقاصد

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی بلند پایہ محقّق ،نقّاد، مبصّر ،تدوین کار، انشا پرداز، مضمون نگار، مکتوب نگار اور دانش وَر تھے۔اُردو ادب میں اُن کے تحقیقی وتنقیدی کام کو نہایت وقار واہمیت حاصل ہے۔اُنہوں نے بہت سے تحقیقی ،تبصراتی ،معلوماتی اور تجزیاتی مضامین قلم بند کیے ہیں جن کے مطالعے سے اُن کی دانش وَری اور تحقیقی وتنقیدی معیار وصلاحیت کا بہ آسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔اُن کے متعدّد مضامین میں تاریخی پس منظر کو نمایاں طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔

اگر چہ وہ باقاعدہ طور پر کسی ادبی تحریک ،نظریہ یا اِزم سے وابستہ نہیں رہے ہیں مگر وہ ادبی روایات اور مختلف نظریات پر گہری نظر رکھتے تھے۔اُن کا ادبی سرمایہ جس قدر اہم اور قابلِ قدر ہے اُسی طرح اُن کی زندگی اور شخصیت کے بعض گوشے بھی اہم اور حوصلہ افزا ہیں۔اس لیے اُردو کے ہر طالبِ علم کو اُن کی سوانح حیات اور ادبی خدمات سے واقف ہونا ضروری ہے۔انہیں اغراض ومقاصد کے تحت اس اِکائی کے ذریعہ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کے حالاتِ زندگی اور اُن کے کارناموں پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

آپ اس اِکائی کے مطالعے سے پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کی حیات وشخصیت کے اہم ،حوصلہ افزا، سبق آموز گوشوں اور اُن کے تحقیقی، تنقیدی، تدوین کاری، مکتوباتی اور دیگر ادبی کارناموں سے بھی متعارف بھی ہوں گے۔

08.02 تمہید

تحقیق کا اصل مقصد حقائق کی بازیافت ہے یعنی تحقیق کے ذریعہ کسی امر یا چیز کو اُس کی اصل شکل میں دیکھنے کی کوشش ہے۔ محقق کا اصل کام حقائق کی بازیافت، صداقت کی تلاش، حقائق کا تعیّن اور اُن سے نتائج کا استخراج ہے۔ تنقید کے بغیر کسی چیز یا شعری ونثری فن پارے کی خوبیوں اور خامیوں کو سمجھنا محال ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ تنقید اور تخلیق کا آپس میں اِتنا گہرا رشتہ ہے کہ ایک کے بغیر دوسرے کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ دراصل کسی فن پارے یا تخلیق کے محاسن ومعائب کی نشان دہی کرنے کا نام ہی تنقید ہے۔ دنیا کے تمام باشعور انسانوں میں یہ صلاحیت پائی جاتی ہے کہ وہ اپنی استطاعت کے مطابق اچھّے اور بُرے میں تمیز کر سکیں مگر ہر شخص میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ اپنی پسند و ناپسند یا اچھّائی اور بُرائی کے اسباب بیان کر سکے۔ جب کوئی ماہرِ فن یا نقّاد کسی تخلیق کا جائزہ لیتا ہے تو وہ اُس کے محاسن ومعائب کی بھی نشان دہی کرتا ہے تا کہ قارئین متعلّقہ تخلیق سے پوری طرح واقف ہو سکیں۔ تنقید کا ایک اہم مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ تخلیق کار اپنی خوبیوں اور خامیوں سے آگاہ ہو سکے اور اُن کی روشنی میں آئندہ کی تخلیقات کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کرے۔ مخطوطات، کتب اور دیگر تحریر کے اصل متن کی نشان دہی کرنے کی کوشش کو متنی تنقید یا تدوین کہتے ہیں۔ اس کا اہم مقصد اصل متن کی دریافت ہے۔ دراصل صحیح متن کی دریافت یا کسی تخلیق کی تدوین باقاعدہ ایک فن ہے جس کے اپنے مسائل ومطالبات ہیں۔

اب آپ بخوبی سمجھ گئے ہوں گے کہ تحقیق، تدوین اور تنقید باقاعدہ طور پر مختلف موضوعات ہیں جن کی حدود اکثر یا کبھی کبھی ایک دوسرے سے مل جاتی ہیں۔ اگر کوئی محقّق حقائق کی بازیافت میں مہارت رکھتا ہے تو ضروری نہیں ہے کہ وہ تنقید وتدوین میں بھی ماہر ہو۔ اس کے برعکس نقّاد اور تدوین کار کے لیے ضروری ہے کہ وہ تحقیق کے تمام اُصول وقواعد سے بھی واقف ہو۔ اُسے تحقیق سے بھی اُتنی ہی دل چسپی ہونا چاہیے جتنی تدوین وتنقید سے ہے کیوں کہ تنقید وتدوین کے لیے اصولِ تحقیق سے واقفیت ضروری ہے۔ مکتوب نگاری بھی ایک فن ہے جسے نثری اصناف میں امتیازی اہمیت حاصل ہے۔ منظوم خطوط بھی پائے جاتے ہیں مگر اُن کی تعداد بہت کم ہے۔ مکتوب نگاری ایک شوق بھی ہے اور ضرورت بھی مگر عہدِ حاضر میں انٹرنیٹ کے سبب مکتوب نگاری یا خطوط نویسی کی جگہ پیغام یعنی Message نے لے لی ہے۔ اس اِکائی کے ذریعہ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کے تحقیقی، تنقیدی، تدوین کاری، مکتوب نگاری اور دیگر کارناموں کے ساتھ اُن کے حالاتِ زندگی کا جائزہ لیا جائے گا۔

08.03 خواجہ احمد فاروقی

خواجہ احمد فاروقی کا شمار اعلیٰ درجے کے محقّقین، نقّادوں، تدوین کاروں، مکتوب نگاروں، مضمون نویسوں اور انشا پردازوں میں کیا جاتا ہے۔ اُنہوں نے متعدّد مخطوطات اور کتابوں کی تدوین کی ہے اور اُنہیں مرتّب کیا ہے۔ خدائے سخن میر تقی میرؔ کی شخصیت وشاعری سے متعلّق اُن کی کتاب ''میر تقی میرؔ: حیات اور شاعری'' کو بلند پایہ تحقیقی کارنامہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ اُنہوں نے بہت سے تحقیقی وتنقیدی مضامین و مقالات بھی قلم بند کیے ہیں۔ اُن کے تحقیقی وتنقیدی مضامین کے مجموعے کا نام ''ادبی تنقید'' ہے جس کے بیشتر مضامین اُردو کے رسائل ''اُردو' اور ''نگار'' میں شائع ہو چکے ہیں۔ ''مکتوباتِ اُردو کا ادبی و تاریخی ارتقا'' بھی اُن کا ایک اہم تحقیقی کارنامہ ہے جس سے اُن کی تحقیقی صلاحیتوں کا پتہ چلتا ہے۔

خواجہ صاحب کا پہلا مضمون ماہنامہ ''نگار'' کے جون ۱۹۳۹ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا جس کا عنوان ''آرائشِ جمال: تاریخ اور نفسیات کی روشنی میں'' ہے جو نیاز فتح پوری اور سجّاد حیدر یلدرم کے اُسلوب سے متاثر ہوکر لکھا گیا ہے۔ اُن کا پہلا مہتم بالشان تنقیدی مضمون ''مثنوی زہرِ عشق'' ماہنامہ نگار کے نومبر ۱۹۳۹ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ اسی سلسلہ کا ان کا ایک مضمون ''بہارِ عشق'' ماہنامہ ''نقوش'' کے ''جشن آزادی نمبر'' ۱۹۳۸ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ خواجہ صاحب کے بیشتر تنقیدی مقالات ومضامین تاریخ، نفسیات، اجتماعیت اور دوسرے علوم وفنون سے مملو نظر آتے ہیں۔ اُنہوں نے تاریخ، معاشرت اور سماجی حالات ومسائل کا بہ غائرِ نظر مطالعہ ومشاہدہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے متعدّد مضامین خالص تاریخی موضوعات پر مبنی ہیں۔ علمِ تاریخ کی اہمیت، تاریخی نظریے کا ارتقا جنگِ پلاسی اور انگلستان کا صنعتی انقلاب، ہندو مسلمانوں کے کلچرل تعلّقات اور ہندوستان کی تاریخ میں اتّحاد پسندی کا رجحان اُن کے خالص تاریخی مضامین ہیں۔

خواجہ احمد فاروقی کو جس قدر قدیم ادبی سرمایے سے لگاؤ ہے اُسی قدر وہ عہدِ حاضر کے ادب کو بھی پسند کرتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ یونان کے دیوتا جانس کی طرح خواجہ صاحب کا ایک رُخ ماضی کی طرف رہتا ہے تو دوسرا رُخ مستقبل کی طرف تو بے جا نہ ہوگا۔ انہوں نے ماضی اور حال سے وابستہ اُدبا وشعرا کے فن سے متعلّق جو مضامین لکھے ہیں اُن کی فہرست طویل ہے۔ یہاں صرف اُن کے چند مضامین کے عنوانات اس لیے درج کیے جا رہے ہیں کہ ایک ہی نظر میں پتہ چل سکے کہ انہیں ماضی کے قلم کاروں سے بھی لگاؤ ہے اور اپنے عہد کے اُدبا وشعرا کی نگارشات سے بھی دل چسپی ہے ریاضؔ کی شگفتہ کاری، اصغرؔ کی شاعری، مومنؔ کی شاعری، فانیؔ کی شاعری کا ایک روشن پہلو اور غزل کے جدید رجحانات پر ایک نظر اُن کے اہم تنقیدی مضامین ہیں۔

خواجہ صاحب نے مکتوب نگار کی حیثیت سے بھی اپنی شناخت قائم کی ہے اور مکتوبات سے متعلّق تحقیقی وتنقیدی کام بھی کیے ہیں۔ اُن کے پی.ایچ.ڈی ڈگری کے تحقیقی مقالہ کا عنوان ''مکتوباتِ اُردو کا ادبی وتاریخی ارتقا'' ہے۔ اُنہوں نے سرسیّد احمد خاں، رجب علی بیگ سرورؔ اور ابوالکلام آزادؔ کے خطوط سے متعلّق جو تحقیقی مضامین قلم بند کیے ہیں وہ اُن کی تحقیقی کاوش کے عکّاس بھی ہیں اور تنقید وتبصرہ کے اعتبار سے بھی اہم ہیں۔ خواجہ احمد فاروقی نے بہترین خاکے بھی قلم بند کیے ہیں۔ اُن کے خاکوں کے مجموعوں کے نام ''یادنامہ'' اور ''یادِ یارِ مہرباں'' ہیں۔ ''یادنامہ'' میں اُن ۱۸/لوگوں کے خاکوں کی شمولیت ہے جن سے خواجہ صاحب کے مراسم اور تعلّقات رہے ہیں۔ اُنہوں نے مرزا غالبؔ کی فارسی کتاب ''دستنبو'' کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا ہے۔ درج بالا کاموں کے علاوہ اُن کے ایسے بہت سے کارنامے ہیں جنہیں اُردو ادب کی تاریخ میں امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ آپ کو اس اِکائی کے دوسرے حصّوں کے مطالعے کے ذریعہ خواجہ احمد فاروقی کی سوانح حیات، تحقیق وتنقید، تدوین کاری، مکتوب نگاری ومضمون نویسی کے ساتھ اُن کے دیگر ادبی کارناموں سے بھی واقف کرایا جائے گا۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱﴾ خواجہ احمد فاروقی کا پہلا مضمون ماہنامہ نگار کے کس شمارہ میں شائع ہوا تھا؟

﴿۲﴾ خواجہ احمد فاروقی کے تنقیدی وتحقیقی مضامین کے مجموعہ کا نام کیا ہے؟

﴿۳﴾ خواجہ احمد فاروقی نے مرزا غالبؔ کی کس فارسی کتاب کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے؟

08.04 خواجہ احمد فاروقی کے حالاتِ زندگی

خواجہ احمد فاروقی کی پیدائش ۳۰/اکتوبر ۱۹۱۷ء کو ضلع مُرادآباد کے قصبہ بچھراؤں میں ہوئی تھی۔ اُن کے والد کا نام حسن احمد ہے۔ خواجہ صاحب کی تعلیم وتربیت مشرقی ماحول میں ہوئی تھی۔ دینی تعلیم اور علومِ مشرقیہ سے بہرہ ور ہونے کے سبب اُن کی تحریروں میں دینی ومشرقی عناصر کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ وہ میرٹھ کالج اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے فاضلِ علم وادب ہوکر حلیم مسلم کالج، کان پور میں اُردو کے اُستاد مقرّر رہوئے۔ اُنہوں نے بی.اے. کا امتحان انگریزی ادب، فارسی ادب، تاریخِ یورُپ اور تاریخ عہدِ مغلیہ کے مضامین لے کر پاس کیا تھا۔ انہوں نے انگریزی، فارسی اور اُردو ادب میں ایم.اے. کی ڈگریاں بھی حاصل کی تھیں۔ اُن کے پی ایچ.ڈی کے مقالہ کا عنوان ''مکتوباتِ اُردو کا تاریخی وادبی ارتقا'' ہے جس پر دہلی یونیورسٹی نے ۱۹۵۳ء میں ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری تفویض کی تھی۔

پروفیسر حامد حسن قادری نے جس کی تاریخ اس طرح کہی ہے ۔

ہزار شکر کہ پی.ایچ.ڈی ہوئے خواجہ بڑا صلہ ہے بڑی نعمتِ خدائے احد

یہ فی البدیہہ کہا قادری نے سالِ نشاط کہ ڈاکٹر ہوئے کیا خوب خواجہ احمد ۱۹۵۳ء

دہلی یونیورسٹی میں مُلک کی آزادی کے بعد بھی ۱۹۵۵ء یا ۱۹۵۶ء تک عربی، فارسی اور اُردو کا مشترکہ ڈپارٹمنٹ تھا۔ اسی شعبہ میں اُستاد کی حیثیت سے فاروقی صاحب کی تقرّری ہوئی۔ وہ شعبۂ اُردو کے الگ قیام کے لیے کوشش بھی کرنے لگے اور اُردو ڈپارٹمنٹ کو الگ قائم کرانے میں کامیاب بھی ہوئے۔ اُنہوں نے شعبۂ اُردو کو صرف بی.اے.، ایم.اے اور پی ایچ.ڈی. کی رسمی تعلیم تک محدود نہیں رکھا۔ شعبہ میں دہلی اسکول آف اُردو لٹریچر قائم کرایا۔

اس کے ساتھ اُنہوں نے ترجمہ نگاری، ایم.لِٹ. اور پیلیو گرافی (Paleography) یعنی مخطوطہ شناسی کے کورسیز شروع کرائے۔ ان کاموں کے علاوہ اُنہوں نے شعبۂ اُردو میں تحقیق وطباعت کا ایک سیکشن قائم کرایا جس کے لیے پروفیسر ضیاء احمد بدایونی اور رشید حسن خاں جیسے علما کی خدمات حاصل کیں۔ اُنہوں نے انگلستان، روس، امریکہ، فرانس، جرمنی، اِٹلی وغیرہ کے مختلف کتب خانوں اور دیگر مقامات سے اہم اور نایاب مخطوطات کے عکس اور مائیکرو فلمیں حاصل کیں اور ان کے متون کی تدوین کی۔ کربل کتھا، عمدۂ منتخبہ یعنی تذکرۂ سرورؔ، دیوانِ سوزؔ، دیوانِ بقاؔ جیسی اہم کتب اُنہیں کی نگرانی میں شعبۂ اُردو سے شائع ہوئیں۔

فاروقی صاحب نے شعبۂ اُردو میں عظیم الشان سیمینار، ادبی جلسوں اور ادبی تقاریب کی شروعات کی جن میں وزیرِاعظم پنڈت جواہر لال نہرو، شمشیر بہادر سنگھ، ترلوچن شاشتری اور مختلف علوم وفنون کے ماہرین اور نامور سیاسی قائدین شریک ہوتے تھے۔ اُنہوں نے ''اُردوئے معلّٰی'' کے نام سے ایک رسالہ بھی جاری کیا تھا۔ جس کے دو غالبؔ نمبر، غالبیات میں اہم اضافہ کی حیثیت کے حامل ہیں۔ وہ اُردو اور شعبۂ اُردو سے متعلّق اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں :

> ''شعبہ سنگ وخشت کا نام نہیں ہے۔ اس میں توانائی اور درخشانی خونِ جگر صَرف کرنے اور افکارِ تازہ سے آتی ہے۔ تقسیمِ ہند نے اُردو کے لیے بہت سی مشکلات پیدا کر دی تھیں۔ اُردو والوں نے اس راستہ کو پیروں کے ذریعہ نہیں سینہ کے بل چل کر طے کیا ہے۔''

خواجہ احمد فاروقی کے مزاج میں غضب کی شائستگی اور تمکنت تھی۔ وہ وضع قطع، رَکھ رکھاؤ اور لیے دیے پن کو پسند کرتے تھے اور حفظِ مراتب کا حد درجہ خیال رکھتے تھے۔ وہ بُزرگوں، عالی مرتبت اور لائقِ تعظیم ہستیوں کا جس قدر احترام کرتے تھے اُسی قدر اپنے چھوٹوں سے بھی اپنے لیے عزّت وتکریم کی توقع رکھتے تھے۔ اُنہیں ہر شخص سے بے تکلّف ہونا اور گھُلنا ملنا پسند نہیں تھا۔ وہ اس بات کا حد درجہ خیال رکھتے تھے کہ کس شخص سے کتنا فاصلہ رکھنا ہے۔ اُنہوں نے باہمی تعلّقات میں بے تکلّفی کو برائے نام رَوا رکھا تھا۔ اُنہیں عمدہ کھانوں اور بہترین کپڑوں کا حد درجہ شوق تھا۔ وہ رہن سہن اور مہمان نوازی میں اپنے وسائل سے زیادہ خرچ کرتے تھے۔ وہ سائیکل، رِکشا، تھری وہیلر اور بس سے سفر کرنے کو ناپسند کرتے تھے۔ قرب وجوار کا سفر ٹیکسی سے اور دور دراز کا سفر ٹرین کے فرسٹ کلاس کوچ سے کرتے تھے۔ اپنے جواں سال بیٹے نیّر کے انتقال اور ۳۰/ اکتوبر ۱۹۸۴ء کو ملازمت سے سبک دوش ہونے کے سبب پژمُردہ سے ہو گئے تھے۔ یہ زندگی اُن کے مزاج کے برعکس تھی۔ وہ عمر کی آخری منزل میں خستہ حال ہو گئے تھے اور ٹوٹنے بکھرنے سے لگے تھے۔ اُن میں اب وہ قوّت نہیں رہی تھی جو ملازمت کے دَوران عہدِ جوانی میں تھی۔ دراصل وہ صرف خوابوں کا جہاں آباد کرنے کے قائل نہیں تھے بلکہ عملِ پیہم اور مسلسل جدوجہد کے ذریعے منزلیں سر کرنے پر ایمان رکھتے تھے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۴﴾ خواجہ احمد فاروقی کے پی ایچ.ڈی. ڈگری کے تحقیقی مقالہ کا عنوان کیا ہے؟

﴿۵﴾ ''اُردوے معلّٰی'' نام کا رسالہ کس نے جاری کیا تھا؟

﴿۶﴾ خواجہ احمد فاروقی ملازمت سے کب سبک دوش ہوئے تھے؟

08.05 خواجہ احمد فاروقی بحیثیت محقّق ونقّاد

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کی شخصیت کثیر الجہت تھی۔ وہ اعلیٰ درجے کے محقّق، نقّاد، مضمون نگار، انشا پرداز، تدوین کار، مبصّر اور مکتوب نگار تھے مگر تحقیق وتنقید اُن کے پسندیدہ اور فطری موضوعات ہیں جو انشا پردازی کی آمیزش سے دوآتشہ ہو گئے ہیں۔ خواجہ احمد فاروقی نے ''ادبی تنقیدیں'' کے عنوان سے ایک مجموعہ مرتّب کیا تھا جس میں اُن کے تنقیدی وتحقیقی مقالات ومضامین کی شمولیت تھی۔ میر تقی میرؔ کی شخصیت و شاعری سے متعلّق اُن کی ایک تحقیقی کتاب کا نام ''میر تقی میرؔ'' ہے۔ ''تاریخ مکاتیبِ اُردو'' کا شمار اُن کے اعلیٰ درجے کے تحقیقی کاموں میں کیا جاتا تھا۔ ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ وآشوب میں اُن کی متذکرہ تینوں کتابیں تلف ہو گئی تھیں جس کا ذکر اُنہوں نے ایک خط میں اس طرح کیا ہے:

> ''بھائی! مَیں کیا اور میری کتابیں کیا لیکن مکڑی کو اپنا جالا بھی ریشم سے زیادہ عزیز ہوتا ہے۔ مال وزر تو رکھتا ہی نہیں تھا بس یہ نقدِ سخن ہی تھا۔ خیر ناگفتہ بے ست یہ اَوراق پھر جمع ہو جائیں گے۔ انسانیت اور اخلاقی اقدار کا جو نقصان دونوں مملکتوں میں ہوا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔''

خواجہ صاحب کا ایک تحقیقی مضمون ''آرائشِ جمال: تاریخ اور نفسیات کی روشنی میں'' جون ۱۹۳۹ء کے ماہنامہ ''نگار'' کے شمارہ میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد اُن کا پہلا مہتّم بالشان تنقیدی مضمون ''مثنوی زہرِ عشق'' ماہنامہ نگار کے نومبر ۱۹۳۹ء کے شمارہ میں شائع ہوا تھا۔ اسی سلسلہ کا اُن کا ایک مقالہ ''بہارِ عشق'' کے عنوان سے ماہنامہ نقوش کے جشنِ آزادی نمبر ۱۹۴۸ء کے شمارہ میں شائع ہوا تھا۔

خواجہ صاحب کی تنقیدیں پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ وہ نہ تو ادب کی منفی رنگینیوں میں گم ہوتے ہیں اور نہ داخلی لذّت اندوزی کو پسند کرتے ہیں۔ وہ خواب وخیال کے خوب صورت محل تعمیر کرنے کے بھی قائل نہیں ہیں۔ وہ غمِ روزگار سے کبھی نظریں نہیں چُراتے بلکہ تاریخ، نفسیات، اجتماعیت اور دیگر علوم کی مدد سے ادب کے دامن کو وسیع سے وسیع تر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُنہوں نے تاریخ اور سماج کی ہمہ گیر قوّتوں کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ وہ اپنے ایک مضمون ''بہارِ عشق'' میں لکھتے ہیں:

> ''اتّحاد و اختلاط کا یہ سرچشمہ جو موہن جوداڑو سے بھی پہلے پھوٹا تھا، عہدِ قدیم اور عہدِ وسطیٰ کے میدانوں سے گزرتا ہوا آج بھی اسی طرح جاری ہے اور ہماری مقدّس سرزمین کو سیراب کر رہا ہے.... اس اختلاطِ باہمی کی گواہ ہماری مصوّری ، ہماری موسیقی، ہماری شاعری، ہماری عمارتیں اور ہماری تہذیبی تحریکیں ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ عہدِ وسطیٰ کی تاریخ کو بادشاہوں کی رزم آرائیوں میں ڈھونڈا گیا۔ منصور و منوہر کی رنگ کاری، خسرو اور تان سین کی موسیقی، جائسی اور فیضی کی شاعری، لال قلعہ اور تاج محل کی صنعت اور مہاتما کبیر اور حضرتِ محبوبِ الٰہی کی صلح پسندی میں ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی گئی۔''

خواجہ صاحب کی تنقیدیں عینی یا جمالیاتی نہیں ہیں۔ اُن کے یہاں اُن احساسات کی بھی بازگشت نہیں ہے جو بیشتر شعرا کے کلام میں نظر آتی ہے۔ اُنہوں نے بلند و پست اور نور و ظلمت کے امتیازات کے ذریعہ ادب کے پائیدار قصّوں کی قدر و قیمت متعیّن کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ ادب کو ایک نامیاتی حقیقت سمجھتے ہیں اور اُس میں سودمند تبدیلیوں کو پسند بھی کرتے ہیں۔ اُنہوں نے بلند پایہ نئی نظموں کی اہمیت پر کئی مضامین قلم بند کیے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ نئی نظم کا دامن گُلہائے رنگ رنگ سے بھر چلا ہے۔ اُن کے نزدیک مضامین کا تنوّع، وُسعت، جدّت، معنویت، نیا شعور و احساس جیسے عناصر نظم کے درخشاں مستقبل کے لیے فالِ نیک ہیں۔ اُن کی تنقیدی تحریروں کا خاص وصف سنجیدگی، توازن، اصابت اور اعتدال ہے۔ ریاضؔ کی شگفتہ کاری، اصغرؔ کی شاعری، مومنؔ کی شاعری، فانیؔ کی شاعری کا ایک روشن پہلو، غزل کے جدید رجحانات پر ایک نظر کا شمار اُن کے بہترین تنقیدی مضامین میں کیا جاتا ہے۔

اُن کی اہم تحقیقی مطبوعات کے نام میر تقی میرؔ: حیات اور شاعری؛ کلاسیکی ادب؛ اُردو میں وہابی ادب اور مرزا شوق لکھنوی ہیں۔ ''چراغِ رہ گزر'' خواجہ صاحب کے علمی، ادبی، تنقیدی و تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ میں شامل بیشتر مضامین کے ذریعہ اُردو زبان وادب کے اسالیب کے تاریخی تسلسل اور سماجی پس منظر کے نقوش کو اُبھارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اُنہوں نے اپنے تحقیقی مقالہ ''میر تقی میرؔ: حیات اور شاعری'' میں میرؔ کی شخصیت، شاعری اور عہدِ میر کے سماجی و سیاسی حالات کا بے لاگ تحقیقی و تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ اس اہم تحقیقی مقالہ پر خواجہ صاحب کو ۱۹۵۷ء میں ساہتیہ اکادمی کے ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔

خواجہ صاحب کے پی.ایچ.ڈی ڈگری کے تحقیقی مقالے کا عنوان ''مکتوباتِ اُردو کا ادبی و تاریخی ارتقا'' ہے جس کے ذریعہ اُردو خطوط کی ادبی و تاریخی روایت اور اُس کے ارتقا پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اُنہوں نے اپنے مضامین ''میرؔ اور خان آرزوؔ کے تعلّقات'' اور ''میرؔ کی خودنوشت'' میں میر تقی میرؔ کی سیرتِ حریفانہ کا منصفانہ انداز میں جائزہ لیا ہے اور اُن کے کمالات کا غیر ستائشی اعتراف بھی کیا ہے۔ وہ میرؔ کو خدائے سخن تو تسلیم کرتے ہیں مگر اُن کا بُت بنا کر پرستش کرنے کے قائل نہیں ہیں۔ اُن کا ایک اور اہم تحقیقی مضمون ''معرکۂ قتیلؔ و غالبؔ'' ہے جس کے ذریعہ اُنہوں نے واضح کیا ہے کہ:

قتیلؔ وغالبؔ کے معرکہ کو اس ایرانی ہندی نزاع کی روشنی میں دیکھنا چاہئے جو سیاست اور ادب کے میدانوں میں ایک عرصہ سے جاری تھا اور جس کے مظاہر ایرانی اور تورانی جماعتوں کی باہمی آویزش اور شیخ علی حزیںؔ اور خان آرزوؔ کے معرکے ہیں۔ اس قسم کے معرکوں کا سلسلہ عہدِ خسروؔ اور عرفیؔ وفیضیؔ تک پہنچتا ہے۔ خواجہ صاحب نے ایک عرصہ تک اُردو تلمیحات پر بھی تحقیقی کام کیا ہے۔ اُنہوں نے تلمیحات سے متعلّق کچھ صفحات بھی تحریر کیے تھے جو ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ میں ضائع ہو گئے تھے۔ اگر تلمیحات سے متعلّق اُن کا یہ تحقیقی کام پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتا تو اُردو تحقیق کے سرمایہ میں گراں قدر اضافہ ہوتا۔ مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ خواجہ صاحب کے تحقیقی کام نہایت اہم اور قابلِ قدر ہیں۔ اُنہوں نے تحقیق وتنقید میں توازن پیدا کرنے کی قابلِ قدر کوشش کی ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۷﴾ کس کتاب کی اہمیت کے اعتراف میں خواجہ احمد فاروقی کو ساہتیہ اکادمی کے ایوارڈ سے نوازا گیا تھا؟

﴿۸﴾ خواجہ احمد فاروقی کا مقالہ ''بہارِ عشق'' ماہنامہ ''نقوش'' کے کس خاص شمارہ میں شائع ہوا تھا؟

﴿۹﴾ ''اُردو میں وہابی ادب'' کا مصنّف کون ہے؟

08.06 خواجہ احمد فاروقی کی خاکہ نگاری

خاکہ نگاری باقاعدہ ایک فن ہے۔ اگرچہ خاکہ بہ اعتبارِ ہیئت سوانحی مضمون یا مختصر سوانح عمری جیسا معلوم ہوتا ہے مگر اس میں نہ تو سوانح عمری جیسی طوالت ہوتی ہے اور نہ واقعات وجزئیات جیسی ترتیب وتفصیل ہوتی ہے۔ البتّہ اس میں زندگی کی متحرّک تصویریں ضرور نظر آتی ہیں۔ دراصل خاکہ میں مفصّل سوانح سے گریز کرتے ہوئے اختصار کے ساتھ متعلّقہ شخصیت کے نقوش واضح کیے جاتے ہیں۔ خاکہ نگار وسیع پس منظر کے وہ حدود متعیّن کرتا ہے جس میں وہ اپنے کردار کو دیکھنے کا خواہاں ہوتا ہے۔ خاکہ نگاری کی پہلی شرط غیر جانب داری ہے۔ اس لیے خاکہ نگار کو چاہئے کہ وہ اپنی ذات وشخصیت اور پسند وناپسند کو اپنے خاکوں پر حاوی نہ ہونے دے۔ دراصل خاکہ نگاری اُس وابستگی اور تعلّق کا اظہاریہ ہے جو خاکہ نگار کو خاکہ کے کردار سے ہوتی ہے۔ دنیا سے گزر جانے والوں کے خاکے عام طور پر اس لیے لکھے جاتے ہیں کہ حال سے ماضی کا رشتہ برقرار رہے اور لوگ اپنے بُزرگوں کی شخصیت وسیرت سے متعارف ہو سکیں۔ زندہ افراد کے خاکے اس لیے قلم بند کیے جاتے ہیں کہ متعلّقہ افراد کی شخصیت وسیرت کے وہ اہم گوشے نمایاں ہو جائیں جن سے بعض لوگ واقف ہوتے ہیں اور بعض ناواقف۔ خواجہ احمد فاروقی اپنے خاکوں کے مجموعہ ''یادِ یارِ مہرباں'' میں خاکہ کی اہمیت کو اس طرح واضح کرتے ہیں:

> ''اگر ہم تاریخ کے اس تسلسل کو بھول گئے یا مُلک کے اُن فدائیوں کی پرچھائیاں ہمیں نئے تمدّن میں حرکت کرتی ہوئی نہ معلوم ہوئیں تو ہماری تہذیبی زندگی کا حال اُس پیڑ کا سا ہوگا جس کی جڑیں سوکھ گئی ہیں۔''

خواجہ احمد فاروقی کے خاکوں کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن کے نام ''یادِ یارِ مہرباں'' اور ''یادنامہ'' ہیں۔ دونوں مجموعوں میں شامل بیشتر خاکے اُن متوفّین کی شخصیت وسیرت سے متعلّق ہیں جن سے خواجہ صاحب کے کسی نہ کسی طرح کے روابط رہے ہیں۔ ان میں سے بعض حضرات سے قریبی اور بعض حضرات سے فاصلوں کے مراسم تھے۔ ''یادنامہ'' میں ۱۷ متوفّین کے خاکے ہیں اور ایک مختصر خاکہ ممنون حسن خاں کا ہے جو اُس وقت حیات تھے۔

خواجہ صاحب اپنے خاکوں میں تجربات اور وجدان کو اس طرح ہم آہنگ کرتے ہیں کہ خاکہ کا رنگ اور روپ نکھر کر نظروں میں پھرنے لگتا ہے۔ اُن کے خاکے محض متعلّقہ افراد کی شخصیت و سیرت کے عکّاس نہیں ہوتے بلکہ تنقیدی نظریات سے بھی مملو ہوتے ہیں۔ وہ کلاسیکیت کی اعلیٰ اقدار، عصری آگہی اور تہذیبی وراثت کے بھی دِلدادہ ہیں اور انہوں نے اپنے تنقیدی شہ پاروں کو ایک منفرد مزاج بھی عطا کیا ہے۔ وہ جگرؔ مُرادآبادی کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''بعض نقّادوں کا خیال ہے کہ جگرؔ کے یہاں لذّتیت ہے جس کی سرحد داغؔ سے ملتی ہے۔ جگرؔ کی لذّتیت اور رِندی بڑی مہذّب اور شائستہ ہے، عیّاشانہ نہیں، شریفانہ ہے۔''

سوانح میں متعلّقہ شخص کی سیرت کو مثالوں اور دلائل کے ذریعہ واضح کرنے کی کوشش کی جاتی ہے مگر خاکے وضاحت کے متحمّل نہیں ہوتے۔ اس لیے خاکہ نگار اپنے لب و لہجے اور طرزِ تحریر سے اس کمی کو پورا کرتا ہے۔ خواجہ صاحب نے ہریش چندر کی سیرت کو اپنے اُسلوبِ خاص کے ذریعہ اس طرح بیان کیا ہے:

''ہریش چندر صاحب نے جس پامردی اور خندہ پیشانی کے ساتھ نامساعد حالات کا مقابلہ کیا اور قلندرانہ زیست کی، اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے سنگِ گرانِ عشق اُٹھا لیا تھا اور دل پُرخوں کی گلابی سے جینے کا ایک ڈھنگ نکال لیا تھا۔''

خواجہ صاحب کی تحریروں میں رومانیت بھی نظر آتی ہے۔ وہ لفظوں کی مینا کاری سے اپنی تحریروں کو دل کشی عطا کرنے کے ہنر سے بخوبی واقف ہیں۔ وہ برمحل اشعار، مصرعوں، ہم وزن و ہم قافیہ الفاظ اور بے ساختہ تراکیب کی رنگ آمیزی سے وہ نثر میں شاعری کرنے لگتے ہیں۔ اُنہوں نے اعجاز صدّیقی کے خاکہ میں بے حِس معاشرہ پر اس طرح طنز کے تیر چلائے ہیں:

''بے حسی سب سے بڑا زہر ہے جو ہماری رگ و پے میں سرایت کر گیا ہے اور اُس نے احساسِ زیاں کو بالکل مٹا دیا ہے۔ اُردو کا قتل عصر حاضر کی تاریخ کا سب سے دردناک واقعہ ہے۔ ایسا کہ رگِ سنگ سے لہو ٹپکنے لگے لیکن اہلِ اُردو نے اس کا جنازہ بھی دھوم سے نہیں اُٹھایا۔''

خواجہ صاحب کے بعض خاکوں میں انشائیہ کی تمام خصوصیات نظر آتی ہیں۔ جگرؔ مُرادآبادی سے متعلّق خاکہ کی درج ذیل سطور میں انشائیہ کی اہم خصوصیات جیسے تخیّل، شخصیت کا اظہار، صنعت کاری، حُسن و رعنائی، سادگی و پرکاری، تجربات و مشاہدات، مصوّری اور رنگ آمیزی کو واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے:

''جگرؔ کے کلام میں دردؔ کی لَو اور انسانیت کی شبنم ہے جو موجودہ زندگی کی بے آہنگیوں میں ہمارا سب سے بڑا سہارا ہے۔ اس وقت ہمارے یہاں صنعتی انقلاب تو دَبے پاؤں آنے لگا ہے لیکن سماج کا ڈھانچا تقریباً وہی ہے گویا انقلاب تو آ گیا مگر ہم ابھی نہیں بدلے۔''

مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے خواجہ احمد فاروقی کے خاکوں کے مجموعے مشرقی انداز و تہذیب کی علامت بھی ہیں اور تاریخی دستاویز بھی ہیں۔ یہ متعلّقہ افراد کی شخصیت و سیرت کے عکّاس بھی ہیں اور اُسلوبِ خاص و اندازِ تحریر کے سبب بہترین انشائیوں میں شمار کیے جاسکتے ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱۰﴾ کس خاکہ نگار کے خاکوں کے مجموعہ کا نام ''یادِ یارِ مہرباں'' ہے؟

﴿۱۱﴾ خواجہ احمد فاروقی نے کس کے خاکہ میں بے حس معاشرہ پر طنز کیا ہے؟

﴿۱۲﴾ کس خاکہ نگار کے مجموعے مشرقی اقدار و تہذیب کی علامت ہیں؟

08.07 ترتیب وتدوین

خواجہ احمد فاروقی نے ترتیب وتدوین کے میدان میں بھی قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں۔ وہ مخطوطات اور قدیم کتب کے صحتِ متن، اختلافِ نسخ کے اظہار اور رموز واوقاف کے استعمال، ماخذ کی نشان دہی اور اُن کی جانچ پرکھ پر غیر معمولی توجّہ دیتے تھے۔ اُنہوں نے انگلستان، روس، جرمنی، اٹلی، فرانس، امریکہ کے کتب خانوں اور دیگر مقامات سے نایاب مخطوطات اور اہم کتابوں کے عکس حاصل کیے اور مائیکرو فلمیں بنوائیں۔ جن کی مدد سے اُن مخطوطات و کتب کی تدوین کی اور انہیں طبع بھی کرایا۔ اُنہوں نے مختلف نسخوں کی مدد سے متعدّد مصنّفین کی اُن اہم تصانیف کی بھی تدوین کی جن کے صحیح متون موجود نہیں تھے۔ ترتیب و تدوین کے حوالے سے خواجہ صاحب کے اہم کارنامے یہ بھی ہیں کہ اُنہوں نے اساتذہ کی خدمات حاصل کر کے متعدّد مخطوطات اور قدیم کتابوں کو مرتّب کرایا جس کا اظہار اُنہوں نے درج ذیل الفاظ میں اس طرح کیا ہے:

> ''ہم نے اس بات کو بھی شدّت سے محسوس کیا کہ ہمارے پاس اساتذہ کی تصانیف کے صحیح متون موجود نہیں ہیں۔ مَیں نے انگلستان، جرمنی، فرانس، اٹلی، روس اور امریکہ کے سفروں میں کچھ نایاب مخطوطات کے عکس حاصل کیے اور اُن کو دہلی یونیورسٹی کی طرف سے شائع کیا۔''

کربل کتھا، دیوانِ سوزؔ اور عمدۂ منتخبہ یعنی تذکرۂ سرورؔ کی تدوین کا شمار خواجہ صاحب کے اہم کاموں میں کیا جاتا ہے۔ جس وقت اُردو کا حال معرضِ خطر میں تھا اُس وقت خواجہ صاحب نے کربل کتھا، دیوانِ سوزؔ اور عمدۂ منتخبہ جس کا دوسرا نام تذکرۂ سرورؔ ہے، وغیرہ کی تدوین کر کے اُردو کے اہم اور قدیم سرمایہ کو محفوظ کرنے کا گراں قدر کارنامہ انجام دیا ہے۔ اُنہوں نے متون کی دُرستی، کلاسیکی سرمایہ کے مطالعے اور تحقیق و تدوین کی طرف بھی توجّہ مبذول کرانے کی کوشش کی تھی۔

عمدۂ منتخبہ یعنی تذکرۂ سرورؔ ۹۹۶ رشعرا کے تذکروں پر مشتمل ہے جو ۱۹۶۱ء میں بمبئی سے شائع ہُوا تھا۔ خواجہ صاحب نے فضلیؔ کے مخطوطہ کربل کتھا کو مقدّمہ، فرہنگ اور حواشی کے ساتھ مرتّب کیا تھا جو دہلی سے مارچ ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا تھا۔ اُنہوں نے میر امّن کی ''گنجِ خوبی'' کو مرتّب کر کے تنقیدی مقدّمہ کے ساتھ ۱۹۶۶ء میں بمبئی سے شائع کرایا تھا۔ غمگینؔ کے نام سے لکھے گئے مرزا غالبؔ کے غیر مطبوعہ فارسی خطوط کو انہوں نے نہایت عرق ریزی سے مرتّب کر کے ۱۹۶۰ء میں دہلی سے شائع کرائے تھے۔ اُنہوں نے معین الدّین حسن کا خدنگِ غدر: جنگ آزادی کا روزنامچہ بھی مرتّب کیا تھا جسے ایک مبسوط مقدّمہ کے ساتھ ۱۹۷۲ء میں دہلی سے شائع کرایا تھا۔ خواجہ صاحب نے میر تقی میرؔ کے معاصر بقاؔ اکبر آبادی کا کلام ''دیوانِ بقاؔ'' کے نام سے ترتیب دے کر تنقیدی مقدّمہ کے ساتھ دہلی سے شائع کرایا تھا۔ اُن کا ایک اہم کام دیوانِ میر سوزؔ کی تدوین ہے جو دہلی سے ۱۹۶۳ء میں طبع ہوا تھا۔ اُنہوں نے دیوانِ قائمؔ کو مُرتّب کر کے ۱۹۶۴ء میں دہلی سے شائع کرایا تھا۔

دلّی اُردو اخبار ۱۸۴۰ء کی مکمّل فائل کی ترتیب کو خواجہ صاحب کا اہم کارنامہ قرار دیا جاتا ہے جسے اُنہوں نے تعارفی مقدّمہ کے ساتھ ۱۹۷۲ء میں دہلی سے شائع کرایا تھا۔ قدیم دِلّی کالج نمبر ۱۹۵۳ء کی ترتیب وتدوین کا شمار بھی اُن کے اہم کارناموں میں کیا جاتا ہے۔ اُنہوں نے انشائے اُردو ۱۸۳۸ء کی لکھنوی قدیم نثر مطبوعہ دہلی ۱۹۷۲ء کی ترتیب وتدوین بھی نہایت دیدہ ریزی سے کی تھی۔ قانون النساء: اُنّیسویں صدی کا قلمی نسخہ مطبوعہ دہلی ۱۹۷۲ء بھی اُن کی تدوین کاری کا بہترین نمونہ ہے۔ خواجہ صاحب نے آصف علی کی تحریروں کو اپنے مبسوط مقدّمہ کے ساتھ ''ارمغانِ آصف'' کے نام سے مرتّب کر کے مئی ۱۹۶۶ء میں دہلی سے شائع کرایا تھا۔ درج بالا مخطوطات وکتب کی ترتیب وتدوین کے علاوہ اُنہوں نے تدوین کے میدان میں اور بھی گراں قدر کام کیے ہیں جنہیں کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱۳﴾ ''عمدۂ منتخبہ'' کا دوسرا نام کیا ہے؟

﴿۱۴﴾ خواجہ احمد فاوقی نے بقاؔ اکبرآبادی کا کلام کس نام سے مرتّب کیا ہے؟

﴿۱۵﴾ عمدۂ منتخبہ یعنی تذکرۂ سرورؔ کتنے شعراء کے تذکروں پر مشتمل ہے؟

08.08 خواجہ احمد فاروقی بحیثیت مکتوب نگار

خواجہ احمد فاروقی کو فنِ خطوط نگاری سے غیر معمولی دل چسپی تھی۔ اُن کے پی ایچ.ڈی. ڈگری کے مقالہ کا عنوان ''مکتوباتِ اُردو کا ادبی وتاریخی ارتقا'' ہے۔ اُن کے اس تحقیقی مقالہ کو تحقیق ودریافت کا اعلیٰ نمونہ قرار دیا جاتا ہے۔ اُن کے خطوط میں اُن کی نفسیاتی، سماجی، علمی اور ادبی شخصیت کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔ اُن کی شخصیت، سیرت اور اندازِ فکر کو سمجھنے کے لیے اُن کے خطوط کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

خواجہ صاحب ایک بلند پایہ انشا پرداز بھی تھے۔ وہ اپنی بات کو شاعرانہ انداز میں کہنے کے ہنر سے بخوبی واقف تھے۔ دراصل اُنہوں نے نثر میں شاعری کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے خطوط کا مطالعہ کرتے وقت انشائیہ جیسا لطف محسوس ہوتا ہے۔ خواجہ صاحب اپنی ایک کتاب چھپوانا چاہتے تھے جس کے متعلّق پروفیسر گیان چند جین نے اُنہیں ایک خط کے ذریعہ مطلع کیا کہ آپ اُتّر پردیش اُردو اکادمی، لکھنؤ سے بات کیجیے۔ وہ کتاب کی طباعت کے لیے مالی امداد دیتی ہے۔ اس کا جواب خواجہ صاحب نے ایک خط کے ذریعہ اس طرح دیا:

> ''۷۵ر فیصد کی بات صحیح ہے لیکن وہاں کا صحرا باوجود اپنی وسعت کے چشمِ حاسد کی طرح تنگ ہے۔ اللہ موقع دے گا تو ان شاء اللہ کبھی خود ہی چھپواؤں گا۔ بنارس کے دوست بڑی عنایت فرماتے ہیں اور شاگردی اُستادی کا بھی خیال کرتے ہیں لیکن شاید کچھ اختیار نہیں رکھتے۔ اس لیے مَیں نے حرفِ آرزو نگاہِ شوق سے بھی ادا نہیں کیا۔''

درج بالا خط کے اقتباس سے ظاہر ہے کہ اُنہوں نے مرزا غالبؔ کے شعر ؎

جُز قیس اور کوئی نہ آیا بہ روے کار صحرا مگر بہ تنگیِ چشمِ حسود تھا

میں استعمال کیے گئے الفاظ صحرا اور تنگیِ چشمِ حسود سے استفادہ کرتے ہوئے انہوں نے اپنے خط کو انشائیہ کے قریب کر دیا ہے۔

خواجہ صاحب نے ایک عرصہ تک اُردو تلمیحات پر بھی کام کیا تھا اور کچھ صفحات بھی قلم بند کر لیے تھے مگر ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ میں تمام صفحات ضائع ہو گئے تھے۔ اُنہوں نے اس واقعہ کو ایک خط میں اس طرح تحریر کیا ہے:

''مَیں نے کچھ کام کر کے اُنہیں دکھلایا بھی تھا لیکن وہ سب کاغذات ۱۹۴۷ء میں ضائع ہو گئے۔ اوروں کا زر لُٹا۔ میرا نقدِ سخن لُٹا۔ حضرت پیر و مرشد ذاکر صاحب کو اس کا حال معلوم ہے۔ بہر حال ناگفتہ بے ست، اب اگر آپ کا کرم ذوق فزا ہوا تو یہ کام اِنشاءاللہ مکمّل ہو جائے گا۔''

خواجہ احمد فاروقی موقع و محل کی مناسبت سے اُردو اور فارسی کے اشعار کا استعمال کرنے میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ وہ اشعار، مصرعوں یا مصرع کے کسی حصّہ کے برجستہ استعمال کے ذریعہ تحریر و تقریر میں زور و اثر پیدا کرنے کے ہنر سے بھی بخوبی واقف تھے۔ وہ بعض اوقات کسی شعر، مصرع یا شعری ٹکڑے کے برجستہ استعمال سے اپنے خطوط کی عبارت کو مؤثر اور بامعنی بنانے اور اظہارِ خیال کو دو آتشہ کرنے میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ وہ اُردو تحریک کے تعلّق سے قاضی عبدالغفار کی کوششوں کی تعریف کرتے ہوئے اُردو زبان کی بقا، تحفظ، ترقّی اور فروغ کے سلسلہ میں اُردو داں طبقہ کے عزم کا اظہار ایک خط میں اس طرح کرتے ہیں:

''ہمارے مُلک کی آنکھیں آپ پر لگی ہوئی ہیں۔ خدا آپ کو کامیاب اور اس محنت کو وصول کرے۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ اُردو والے ہر امتحان اور آزمائش میں پورے اُتریں گے۔ بقولِ غالبؔ

درعشق، غنچہ ایم کے لرزد زباد صبح ☆ درکارِ زندگی صفتِ سنگ خارا ایم

وہ پروفیسر گیان چند جین کے نام لکھے گئے ایک خط میں اُن کی تصنیف کی تعریف کرتے ہوئے عمر خیّام کے ایک مصرع کا استعمال اس طرح کرتے ہیں: آپ کی کتاب کو بہت لطف لے کر پڑھا۔ خیّام کے قاعدے سے

کم کم خور و گہ گہ خور و تنہا مے خور

خواجہ صاحب تمام شعرا میں مرزا غالبؔ اور میر تقی میرؔ کو بہت پسند کرتے تھے۔ اُنہیں ان دونوں شعرا کے بہت سے اُردو اور فارسی کے اشعار یاد تھے۔ اُنہوں نے مرزا غالبؔ کے شعر ؎

نے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال مدّت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے

میں استعمال کی گئی ترکیب ''آشتیِ چشم و گوش'' کو اس سلیقہ سے استعمال کیا ہے کہ قاری کا ذہن درج بالا شعر کی طرف فوراً منتقل ہو جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''آپ بخیر و عافیت حیدرآباد کے سفر سے واپس آ گئے ہوں گے۔ آشتیِ چشم و گوش ہو گئے ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ جلد سے جلد زیارت نصیب ہو۔''

خواجہ صاحب نے اپنے رٹائرمینٹ کی اطلاع جس خط کے ذریعہ پروفیسر گیان چند جین کو دی تھی اُس میں انہوں نے غالبؔ کے ایک مصرع کو نہایت برجستگی سے رقم کیا ہے۔

خواجہ صاحب لکھتے ہیں:

''۳۰/اکتوبر ۱۹۸۴ء کو میری بیڑیاں کٹ جائیں گی اور مَیں دہلی یونیورسٹی سے سبک دوش ہو جاؤں گا۔

﴿لو بندگی کہ چھوٹ گئے بندگی سے ہم﴾

خدا کا شکر ہے اور احسان ہے کہ یہ زمانہ عزّت و آبرو کے ساتھ گزرا اور یونیورسٹی کے حدود میں سب ہی اعزاز و اکرام حاصل ہوئے۔''

عام طور سے خطوط، گفتگو اور کتابی زبان کا اُسلوب ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے لیکن خواجہ صاحب جس مہذّب اور شائستہ انداز سے گفتگو کرتے تھے وہی اندازِ تحریر اُن کے خطوط میں بھی نظر آتا ہے۔ اُن کی طرزِ گفتگو کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ جس زبان میں اپنے ہم پایہ اور بلند مرتبت ہستیوں سے بات کرتے تھے یا خطوط لکھتے تھے اُسی زبان میں اپنے شعبہ کے ساتھیوں سے بھی بات کرتے تھے۔ جب خواجہ صاحب دہلی یونیورٹی کے صدر اور پروفیسر کے عہدہ پر فائز تھے اور رشید حسن خاں اُن کی ماتحتی میں شعبۂ اُردو میں کام کرتے تھے۔ وہ اُس وقت بھی رشید حسن خاں سے نہایت شائستگی سے پیش آتے تھے۔ رشید حسن خاں کو کسی کام سے طلب کرنے کے لیے وہ اُن کے پاس چپراسی کو بھیج سکتے تھے مگر وہ اکثر خطوط کے ذریعہ اُنہیں یاد کرتے تھے جس کی طرزِ تحریر کچھ اس طرح مودّبانہ اور شائستہ ہوتی تھی:

''آپ سے ملاقات کرنے کے لیے بے چین ہوں۔ براہِ کرم جس روز فرصت ہو صبح کو ۹، ۱۰، ۱۱ بجے کرم فرمایئے، عنایت ہوگی۔''

خواجہ صاحب کی شخصیت میں خودداری اور اَنا کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اُنہوں نے خودداری اور اَنا کی نگہداری میں اپنی شخصیت، اُردو اور اپنے فرزند کو بھی شامل کر لیا تھا۔ وہ نقصان کی پرواہ کیے بغیر بڑی سے بڑی طاقت سے بھی ٹکرا جاتے تھے اور اپنا ہر نقصان برداشت کرنے کے لیے تیّار رہتے تھے۔ الٰہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کے صدر پروفیسر گیان چند جین نے انہیں ایک مرتبہ زبانی امتحان کی دعوت دی۔ وہ جانے کے لیے راضی ہو گئے۔ اسی درمیان یونیورسٹی کے رجسٹرار نے اُنہیں فون کے ذریعہ مطلع کیا کہ اگر وہ اے سی. سے سفر کریں تو ریلوے سے سرٹیفکٹ یا سفر کرنے کا ٹکٹ ضرور ساتھ لائیں۔ خواجہ صاحب اس بداعتمادی سے چراغ پا ہو گئے۔ اُنہوں نے پروفیسر گیان چند جین کو ایک خط اس طرح لکھا:

''آپ کی یونیورسٹی سے ٹیلی فون آیا تھا اور مَیں نے اُن سے کہہ دیا تھا کہ مَیں ایسے قاعدہ کی پابندی سے قاصر ہوں جس کی بنیاد بداعتمادی پر ہو۔ براہِ کرم کسی دوسرے پروفیسر کو بلا لیا جائے۔ اُردو مقہور سہی لیکن اُس نے مجھے راست بازی اور شرافت سکھائی ہے اور مَیں ان اقدار کو دل و جان سے عزیز رکھتا ہوں۔''

خواجہ احمد فاروقی نے اپنے متعلّقین اور شاگردوں کی ترقّی اور اُن کی ملازمت سے متعلّق سفارشی خطوط بھی لکھے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے متعلّقین اور شاگردوں کا کس قدر خیال رکھتے تھے۔ خواجہ صاحب کے خطوط کے مطالعے سے اُن کی شخصیت و طبیعت، مزاج و کردار، دہلی یونیورسٹی اور شعبۂ اُردو کے حالات، ہم عصروں سے تعلّقات اور دیگر حالات و واقعات کا پتہ چلتا ہے۔ خواجہ صاحب کے بیشتر خطوط اُن کی شگفتہ نثر کا بہترین نمونہ بھی ہیں اور اُردو کے نثری ادب کے لیے کسی گراں قدر سرمایہ سے کم نہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱۶﴾ خواجہ احمد فاروقی کے پی ایچ.ڈی.ڈگری کے مقالہ کا عنوان کیا ہے؟

﴿۱۷﴾ تمام شعراء میں خواجہ احمد فاروقی کے دو پسندیدہ شعراء کون ہیں؟

﴿۱۸﴾ خواجہ احمد فاروقی نے جن لوگوں کو خطوط لکھے ہیں اُن میں سے کسی ایک کا نام؟

08.09 خواجہ احمد فاروقی کے چند خطوط کے اقتباسات

بنام قاضی عبدالغفار مرحوم:

آپ کا گرامی نامہ مورخہ ۲۲/مارچ موصول ہُوا۔شکر ہے کہ اب آپ کو افاقہ ہے۔شافیِ مطلق صحتِ کلی عطا فرمائے۔

آپ کا فرمان میرا ایمان ہے اور تلمیحات کا موضوع بالخصوص ایسا ہے جس سے مجھے دل چسپی ہے۔کئی برس ہوئے پروفیسر نعیم الرحمٰن مرحوم نے مجھے اس کام کی طرف توجّہ دلائی تھی اور مَیں نے کچھ کام کر کے اُنہیں دکھلایا بھی تھا لیکن وہ سب کاغذات ۱۹۴۷ء میں ضائع ہو گئے۔ اَوروں کا زر لُٹا۔میرا نقدِ سخن لُٹا۔حضرت پیر و مرشد ذاکر صاحب کو اس کا حال معلوم ہے۔بہر حال ناگفتہ بہ ست،اب اگر آپ کا کرم ذوق فزا ہوا تو یہ کام اِن شاءاللہ مکمّل ہو جائے گا۔براہِ کرم کتاب کی ترتیب اور دیگر امور کے متعلّق تفصیل سے اور اپنی کیفیتِ مزاج سے بھی مطلع فرمائیے۔

بنام پروفیسر گیان چند جین:

کم فرصت ہونا اچھّی تہذیب کی نشانی نہیں ہے لیکن آپ نے سازش کر کے مجھے ڈین بنا دیا ہے اور جس دن سے لے آیا ہوں کاغذوں کے نیچے دب گیا ہوں۔مَیں پرچہ بنانے میں اتنی دل چسپی نہیں رکھتا جتنی آپ سے ملاقات میں۔تاہم تعمیلِ ارشاد کروں گا۔فیکلٹی کی میٹنگ میں آپ سے نیاز حاصل ہوگا۔مجھے بڑی خوشی ہے کہ ایک صاحبِ نظر اور اچھّا دوست اس میں شامل ہُوا۔

بنام پروفیسر آلِ احمد سرورؔ:

برادرِ مکرّم!نظام توسیعی خطبات کے متعلّق ایک خبر ہماری زبان میں اشاعت کے لیے بھیجی تھی وہ اب تک شائع نہیں ہوئی۔اس کو دوبارہ بھیج رہا ہوں۔براہِ کرم اسے ہماری زبان میں شائع کر دیجیے ممنون ہوں گا۔

کل ایڈہاک کمیٹی کا جلسہ تھا۔یہ طے ہوا ہے کہ پروفیسر غلام السیّدین خطبات دیں گے۔

بنام بیگم صالحہ عابد حُسین:

مخدومہ ومکرّمہ!پہلے مجالس کی اطلاع ہو جاتی تھی۔اس سے تاریخ اور وقت کا علم ہو جاتا تھا۔اب وہ رسم بھی اُٹھ گئی ہے۔کرّار بھائی میرے ساتھ میرٹھ میں رہے ہیں۔اُن کی مرثیہ خوانی جو قومی رابطہ پر تھی سنتا رہا۔آخر میں انہوں نے عرفی کا مشہور شعر پڑھا۔

طغیانِ ناز میں کہ جگر گوشۂ خلیل در زیرِ تیغ رفت و شہیدش نمی کنند

امامِ تشنہ کام اور جگر گوشۂ رسول پر اس قربانی اور ایثار کی انتہا ہو گئی۔

مَیں نے یادگارِ حالؔی کا اپنا نسخہ آپ کی خدمت میں پیش کر دیا تھا۔اس وقت آپ دوسرے اِیڈیشن کی تیّاری کر رہی تھیں۔اگر ممکن ہو تو دوسرے اِیڈیشن کا ایک نسخہ قیمتاً مجھے بھیج دیجیے عنایت ہوگی۔

بنام ڈاکٹر خلیق انجم:

آپ کا عنایت نامہ مورخہ ۱۸/اپریل ۱۹۸۶ء آج ۲۵/اپریل کو دن کے ایک بجے موصول ہُوا۔مَیں برابر اسی خیال میں تھا کہ انجمن کے جلسہ ۲۸/اپریل کو منعقد ہوں گے۔اب آپ فرماتے ہیں کہ ۲۵/صحیح تاریخ ہے۔وقت کتنا تنگ ہے کہ مَیں باوجود کوشش کے حاضر نہیں ہو سکوں گا۔معذرت خواہ ہوں، اُمّید ہے آپ صحت مند ہوں گے اور جلسے بہت کامیاب ہوں گے۔

08.10 خلاصہ

خواجہ احمد فاروقی کی پیدائش ۳۰/اکتوبر ۱۹۱۷ء کو ضلع مُرادآباد کے قصبہ بچھراؤں میں ہوئی تھی۔اُن کے والد کا نام حسن احمد ہے۔خواجہ صاحب کی تعلیم وتربیت مشرقی ماحول میں ہوئی تھی۔''میر تقی میرؔ: حیات اور شاعری'' اور ''مکتوباتِ اُردو کا ادبی وتاریخی ارتقا'' کا شمار اُن کے اعلیٰ درجہ کے تحقیقی کاموں میں کیا جاتا ہے۔اُن کے تنقیدی، تحقیقی، تاریخی اور معلوماتی مضامین ومقالات کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں سے ''ادبی تنقیدیں، ذوق وشوق اور چراغِ رہ گزر'' نہایت اہم ہیں۔خواجہ صاحب نے متعدّد نایاب مخطوطات اور قدیم کتب کی ترتیب و تدوین بھی کی ہے جن میں سے ''عمدۂ منتخبہ یعنی تذکرۂ سرورؔ، کربل کتھا، گنج خوبی، مرزا غالبؔ کے غیر مطبوعہ خطوط، دیوانِ میر سوزؔ'' نہایت اہم ہیں۔خواجہ صاحب نے بہترین خاکے بھی قلم بند کیے ہیں۔اُن کے خاکوں کے مجموعوں کے نام ''یادِ یارِ مہرباں'' اور ''یادنامہ'' ہیں۔ان دونوں مجموعوں میں شامل بیشتر خاکے اُن متوفّین حضرات کی شخصیت وسیرت سے متعلّق ہیں جن سے خواجہ صاحب کے روابط رہے ہیں۔

''یادنامہ'' میں ایک مختصر خاکہ ممنون حسن خاں کا ہے جو اُس وقت حیات تھے۔خواجہ صاحب کو فنِ خطوط نگاری سے غیر معمولی دل چسپی رہی ہے۔اُن کے پی ایچ.ڈی.ڈگری کے تحقیقی مقالہ کا عنوان ''مکتوباتِ اُردو کا ادبی وتاریخی ارتقا'' ہے جسے تحقیق ودریافت کا اعلیٰ نمونہ قرار دیا جاتا ہے۔اُن کے خطوط میں اُن کی نفسیاتی، سماجی، علمی اور ادبی شخصیت کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔اُن کی شخصیت، سیرت اور اندازِ فکر کو سمجھنے کے لیے اُن کے خطوط کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

08.11 فرہنگ

آشوب	: فتنہ وفساد، غدر، بلوہ	سبک دوش	: آزاد، فارغ ہونا Retire
اختصار	: کم کرنا، گھٹانا، خلاصہ	عکّاسی کرنا	: عکس اُتارنا، بیان کرنا
ارتقا	: بتدریج ترقّی کرنا، بتدریج نشوونما ہونا	قلم بند کرنا	: لکھ لینا، تحریر کر لینا
اسلوب	: طریقہ، طرز، روِش	کثیر الجہت	: جس کی مختلف جہات ہو
التزام	: کسی بات کو لازم کر لینا	کلچرل	: Cultural، تہذیبی، ثقافتی
الحاق	: شامل کیا ہوا، داخل کیا ہوا	مبسوط	: کشادہ، پھیلا ہوا، فراخ
انشاپرداز	: مضمون نگار، نثّار، نثر لکھنے والا	متوفّین	: متوفّی کی جمع، وفات پائے ہوئے، مَرے ہوئے
بلند پایہ	: ماہر، باکمال، جیّد		

بے ساختہ : برجستہ، بے تامّل، بے تصنّع

پیکر : شکل، صورت

پیلیوگرافی : Paleugraphy، مخطوطہ شناسی

تفویض : سپردگی، حوالگی

تلف ہونا : ضائع ہونا، برباد ہونا

تلمیحات : تلمیح کی جمع، تحریر یا تقریر میں کسی قصّہ کی طرف اشارہ کرنا

چراغ پا ہونا : خفا ہونا، ناراض ہونا

چپراسی : وہ شخص جو چپراس پہنے، اردلی، پیادہ

خاکہ : نقشہ، نقش، پیکر، Sketch

خاکہ نگاری : پیکر تراشی، نقش اُتارنا

خطوط : خط کی جمع، متعدّد خطوط، چٹھّیاں

دوآتشہ : نہایت پُر اثر، تیز، تند، وہ عرق یا شراب جو دو دفعہ آگ پر کشید کی جائے

ڈپارٹمنٹ : Department، شعبہ، محکمہ، سررشتہ

روٗپ रूप : شکل، صورت، وضع، تصویر

ریٹائرمنٹ : Retirement، سبک دوشی، فراغت

زبانی امتحان : وہ امتحان جو زبانی یا تقریر کے ذریعہ لیا جائے Viva

مخطوطات : مخطوطہ کی جمع، قلمی کتب، غیر مطبوعہ کتب

معرکہ : لڑائی، جنگ، جھگڑا

مکتوب : خط، پیغام

مکتوب نگار : خط لکھنے والا، نامہ نگار، خط نویس

منصفانہ : از روے انصاف، عدل کے اعتبار سے

مہارت : استعداد، لیاقت، دسترس

مہتمّ بالشان : شانداری سے، شان وشوکت کے ساتھ

مرصّع سازی : مرصّع سازی، موشگافی، صنعت گری

میناکاری

ناگزیر : ضروری، لازم، واجب

نزاع : جھگڑا، فساد، تنازِعہ

نظریات : نظریہ کی جمع، مسائلِ فکری، اصول، قاعدے

ہم پایہ : ہم رتبہ، ہم سر

ہم عصر : ہم زمانہ، ایک ہی وقت کا

ہم وزن : ایک جیسے وزن والا، جو وزن میں برابر ہوں

ہیئت : ساخت، صورت، شکل

08.12 سوالات

مختصر سوالات

سوال نمبر ۱ : خواجہ احمد فاروقی کی زندگی کے کسی اہم گوشہ پر روشنی ڈالیے۔

سوال نمبر ۲ : خواجہ احمد فاروقی کی طرز تحریر کی بنیادی خصوصیات کی نشان دہی کیجیے۔

سوال نمبر ۳ : خواجہ احمد فاروقی کے خطوط اُن کے مزاج و کردار کے آئینہ دار ہیں۔ اظہارِ خیال کیجیے۔

سوال نمبر ۴ : خواجہ احمد فاروقی نے دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں کیا کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ تحریر کیجیے۔

تفصیلی سوالات

سوال نمبر۱ : خواجہ احمد فاروقی کے حالاتِ زندگی قلم بند کیجیے۔

سوال نمبر۲ : خواجہ احمد فاروقی کے تحقیقی کاموں کا جائزہ لیجیے۔

سوال نمبر۳ : مکاتیب خواجہ احمد فاروقی کی اہم خصوصیات کی نشان دہی کیجیے۔

سوال نمبر۴ : ترتیب وتدوین سے متعلّق خواجہ احمد فاروقی کی خدمات پر روشنی ڈالیے۔

معروضی سوالات

سوال نمبر۱ : خواجہ احمد فاروقی کی پیدائیش کب ہوئی تھی؟

(الف) ۳۰/اکتوبر ۱۹۱۷ء (ب) ۱۵/جولائی ۱۹۵۳ء (ج) ۳۰/جنوری ۱۹۴۸ء (د) ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء

سوال نمبر۲ : خواجہ احمد فاروقی کس کالج میں اُردو کے اُستاد مقرر ہوئے تھے؟

(الف) میرٹھ کالج، میرٹھ (ب) اورینٹل کالج، رام پور (ج) حلیم مسلم کالج، کان پور (د) بریلی کالج، بریلی

سوال نمبر۳ : ''چراغِ رہ گزر'' کیا ہے؟

(الف) ناول (ب) افسانوں کا مجموعہ (ج) سوانح عمری (د) مضامین کا مجموعہ

سوال نمبر۴ : خواجہ احمد فاروقی نے مرزا غالبؔ کی کس کتاب کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے؟

(الف) دیوان غالبؔ (ب) دستنبو (ج) چراغِ دیر (د) عود ہندی

سوال نمبر۵ : درج ذیل میں سے کون سی کتاب شعرا کے تذکروں سے متعلّق ہے؟

(الف) دیوان قائم (ب) کربل کتھا (ج) گنج خوبی (د) عمدۂ منتخبہ یعنی تذکرۂ سرورؔ

سوال نمبر۶ : ''مخطوطہ شناسی'' کو انگریزی میں کیا کہتے ہیں؟

(الف) Paleugraphy (ب) Bibliography (ج) Stenography (د) Biography

سوال نمبر۷ : خواجہ احمد فاروقی کے مضامین کے مجموعہ کا نام کیا ہے؟

(الف) ارمغانِ آصف (ب) میر تقی میرؔ: حیات وشاعری (ج) ذوق وجستجو (د) اُردو میں وہابی ادب

سوال نمبر۸ : خواجہ احمد فاروقی کے تحریر کردہ خاکوں کے مجموعہ کا نام کیا ہے؟

(الف) روٹی نامہ (ب) یادنامہ (ج) روزنامچہ (د) آدمی نامہ

سوال نمبر۹ : خواجہ احمد فاروقی کو ساہتیہ اکادمی کے ادبی ایوارڈ سے کب نوازا گیا؟

(الف) ۱۸۵۷ء (ب) ۱۹۵۳ء (ج) ۱۹۸۰ء (د) ۱۹۵۷ء

سوال نمبر۱۰ : ''یادِ یارِ مہرباں'' کیا ہے؟

(الف) خطوط کا مجموعہ (ب) افسانوں کا مجموعہ (ج) خاکوں کا مجموعہ (د) نظموں کا مجموعہ

معروضی سوالات کے جوابات

جواب نمبر۱ : (الف) ۳۰/اکتوبر ۱۹۱۷ء
جواب نمبر۲ : (ج) حلیم مسلم کالج، کان پور
جواب نمبر۳ : (د) مضامین کا مجموعہ
جواب نمبر۴ : (ب) دستنبو
جواب نمبر۵ : (د) عمدۂ منتخبہ یعنی تذکرۂ سرور
جواب نمبر۶ : (الف) Paleugraphy
جواب نمبر۷ : (ج) ذوق وجستجو
جواب نمبر۸ : (ب) یادنامہ
جواب نمبر۹ : (د) ۱۹۵۷ء
جواب نمبر۱۰ : (ج) خاکوں کا مجموعہ

08.13 حوالہ جاتی کتب

۱۔ خواجہ احمد فاروقی نمبر از کتاب نما کا خصوصی شمارہ
۲۔ ارمغانِ فاروقی از دہلی یونیورسٹی
۳۔ مکتوباتِ اُردو کا ادبی وتاریخی ارتقا از خواجہ احمد فاروقی
۴۔ میر تقی میرؔ: حیات وشاعری از خواجہ احمد فاروقی
۵۔ یادِ یارِ مہرباں از خواجہ احمد فاروقی
۶۔ یادنامہ از خواجہ احمد فاروقی
۷۔ خواجہ احمد فاروقی (انگریزی) از کیپٹل ٹائمس میڈیسن امریکہ

اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات:۔

﴿۱﴾ جون، ۱۹۳۹ء
﴿۲﴾ ادبی تنقیدیں
﴿۳﴾ دستنبو
﴿۴﴾ مکتوباتِ اُردو کا تاریخی وادبی ارتقا
﴿۵﴾ خواجہ احمد فاروقی
﴿۶﴾ ۳۰/اکتوبر، ۱۹۸۴ء
﴿۷﴾ میر تقی میرؔ: حیات اور شاعری
﴿۸﴾ جشن آزادی نمبر
﴿۹﴾ خواجہ احمد فاروقی
﴿۱۰﴾ خواجہ احمد فاروقی
﴿۱۱﴾ اعجاز صدیقی
﴿۱۲﴾ خواجہ احمد فاروقی
﴿۱۳﴾ تذکرۂ سرورؔ
﴿۱۴﴾ دیوانِ بقاؔ
﴿۱۵﴾ (۹۹۶)
﴿۱۶﴾ مکتوباتِ اُردو کا تاریخی وادبی ارتقا
﴿۱۷﴾ مرزا غالبؔ اور میر تقی میرؔ
﴿۱۸﴾ پروفیسر گیان چند جین

اکائی 09 : امتیاز علی خاں عرشی

ساخت :

09.01 : اغراض ومقاصد

09.02 : تمہید

09.03 : امتیاز علی خاں عرشی

09.04 : امتیاز علی خاں عرشی کے حالاتِ زندگی

09.05 : امتیاز علی خاں عرشی بحیثیت محقق

09.06 : ترتیب وتدوین

09.07 : امتیاز علی خاں عرشی بحیثیت ماہرِ غالبیات

09.08 : مقدّمے اور حواشی

09.09 : امتیاز علی خاں عرشی بحیثیت شاعر

09.10 : خلاصہ

09.11 : فرہنگ

09.12 : سوالات

09.13 : حوالہ جاتی کتب

09.01 اغراض ومقاصد

امتیاز علی خاں عرشی بیک وقت اعلیٰ درجہ کے محقّق ،متنی نقّاد، تدوین کار، انشا پرداز، ماہرِ لسانیات ،عربی و فارسی کے دانشور، عالمِ دین، تحشیہ نگار، مترجم اور شاعر تھے۔ اُن کا علمی، تحقیقی اور تنقیدی سرمایہ جس قدر اہم ہے اُسی قدر اُن کی شخصیت وسوانح کے بعض گوشے بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ اُردو کے ہر طالب علم کو اُن کے کارناموں اور اُن کی شخصیت سے واقف ہونا ضروری ہے۔

انہیں اغراض ومقاصد کے مدِّنظر اِس اِکائی کے ذریعہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی کے حالاتِ زندگی اور اُن کے کارناموں پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ آپ اِس اکائی کے مطالعے سے امتیاز علی خاں عرشی کی حیات وشخصیت کے اہم اور سبق آموز گوشوں سے واقف بھی ہوں گے اور اُن کے علمی، ادبی، تحقیقی، تنقیدی اور دیگر کارناموں سے بھی روشناس ہوسکیں گے۔

09.02 : تمہید

سچّائی تک پہنچنا یا حقائق کی تلاش انسانی فطرت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان حقائق وصداقت کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ تحقیق کا مقصد ہی حقائق کی بازیافت، صداقت کی تلاش، حقائق کا تعیّن اور اُن سے نتائج کا استخراج ہے۔ مخطوطات، قدیم کتب اور دیگر تحریر کے اصل متن تک پہنچنے کی کوشش کو متنی تنقید کہتے ہیں یعنی متنی تنقید کا اہم مقصد اصل متن کی دریافت ہے۔ تدوین یعنی متن کی تصحیح وترتیب باقاعدہ ایک فن ہے جس کے اپنے مسائل ومطالبات ہیں۔ اسی طرح حقائق کی بازیافت کو تحقیق کہتے ہیں۔

اب آپ بخوبی سمجھ گئے ہوں گے کہ تحقیق اور تدوین باقاعدہ طور پر دو مختلف موضوعات ہیں۔ البتّہ یہ ضرور ہے کہ ان دونوں کی حدود اکثر یا کہیں کہیں ایک دوسرے سے مل جاتی ہیں۔ اگر کوئی شخص حقائق کی بازیافت میں مہارت رکھتا ہے اور خالص منطقی انداز سے واقعات کو ترتیب دینے اور نتائج نکالنے کی بھی صلاحیت رکھتا ہے تو اُس کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ متنی تنقید کے اصول وقواعد سے بھی پوری طرح واقف ہو۔ متنی تنقید کے آداب وقواعد سے واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے اُس کی تحقیقی صلاحیت پر حرف نہیں آتا۔ اس کے برعکس تدوین کار یا متنی نقّاد کے لیے ضروری ہے کہ وہ تحقیق کے تمام اصولوں سے بھی واقف ہو۔ اُسے تحقیق سے بھی اُسی قدر دل چسپی ہو جس قدر فن تدوین سے ہے۔ کیوں کہ آدابِ تحقیق کے بغیر تدوین کے تقاضوں کو پورا نہیں کیا جا سکتا۔ صحیح متن تک پہنچنے کے لیے تدوین کار کو حواشی، مقدّمہ، متن کا زمانۂ تصنیف، مصنّف اور اُس کے عہد سے متعلّق مختلف ضروری معلومات، داخلی شواہد کا تعیّن اور بہت سی ایسی متعلّقہ باتیں ہوتی ہیں جن کا تعلّق خالص تحقیق سے ہے اس لیے وہی شخص تدوین کا حق ادا کر سکتا ہے جس کا مزاج تحقیقی ہو اور جو اصولِ تحقیق سے اچھّی طرح واقف ہو۔ امتیاز علی خاں عرشی کا شمار اعلیٰ درجہ کے تدوین کاروں یعنی متنی نقّادوں میں کیا جاتا ہے۔ انہوں نے کئی قابلِ قدر مخطوطات کی تدوین نہایت دیدہ ریزی سے کی ہے۔ آپ اس اِکائی کے ذریعہ امتیاز علی خاں عرشی کی ترتیب، تدوین کاری اور بحیثیت ماہر غالبیات اُن کے کارناموں کا جائزہ لیں گے۔ اس کے علاوہ اُن کے حالاتِ زندگی، اُن کی دریافتیں اور اُن کی شاعری کی اہم خصوصیات کا بھی مطالعہ کریں گے۔

09.03 : امتیاز علی خاں عرشی

تحقیق وتدوین کے حوالے سے امتیاز علی خاں عرشی کا نام امتیازی اہمیت کا حامل ہے۔ انہوں نے تحقیقِ متن اور متنی تنقید کے اصولوں کی روشنی میں دیوانِ غالبؔ اور مکاتیبِ غالبؔ کو جس جاں کاہی اور دقیقہ رسی سے مرتّب کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ''فرہنگِ غالب'' کی ترتیب بھی اُن کا ایک مثالی کارنامہ ہے۔ اس کے علاوہ دستور الفصاحت، تاریخِ محمّدی، تفسیرِ ثوری، تفسیرِ سفیان وغیرہ کی ترتیب وتدوین کو بھی اُن کا معیاری کام تسلیم کیا جاتا ہے۔ انہوں نے جس محنت، لگن اور دیدہ ریزی سے مذکورہ تصانیف کے متن کی تصحیح کی ہے اور جس باریک بینی سے مختلف نکات پر حواشی تحریر کیے ہیں اُس سے اُن کی علمی، ادبی اور دانش ورانہ صلاحیت کا پتہ چلتا ہے۔

امتیاز علی خاں عرشی ایک عظیم محقّق اور متنی نقّاد ہی نہیں تھے بلکہ بہترین تشبیہ نگار، مترجم، شاعر اور مضمون نگار بھی تھے۔ انہوں نے 'تاج' نعمانی کے قلمی نام سے چند افسانے بھی لکھے ہیں جو اُس وقت کے مؤقّر اخبارات ورسائل میں شائع ہو چکے ہیں لیکن اُن کے بیشتر افسانے فن کی کسوٹی پر کھرے نہیں اُترتے۔ انہوں نے ''فطرت فیّاض ہے'' کے عنوان سے ایک افسانہ قلم بند کیا تھا جس کا اندازِ بیان اور موضوع سوانحی ہے۔ اس لیے اس افسانے کو سوانح اور افسانے کی درمیانی کڑی کہا جا سکتا ہے۔

انہوں نے علمی وادبی نگارشات کے علاوہ آسان اور عام فہم اُسلوب میں ایسے دل چسپ اور معلوماتی مضامین بھی تحریر کیے ہیں جنہیں معمولی استعداد رکھنے والے عام قارئین بھی بہ آسانی سمجھ سکتے ہیں۔ بابر کی مَوت کا واقعہ، یادیں اور باتیں، قلمی کتابوں کی سرگزشت، داستان سرائی، ہارون رشید کی علمی مجلس اور کتابوں کا تاج محل جیسے مضامین کا اندازِ بیان صاف، سادہ اور سلیس ہے۔ اُن میں سے بعض مضامین بے تکلّفی اور طرزِ گفتگو کا بہترین نمونہ ہیں۔ امتیاز علی خاں عرشی اُردو زبان کے زبردست عالم، ماہرِ لسانیات بھی تھے اور اُنہیں عربی، فارسی، انگریزی اور پشتو زبان پر بھی قدرت حاصل تھی۔ انہوں نے عربی، فارسی اور پشتو زبانوں میں جو کارنامے انجام دیے ہیں اُن کی وجہ سے انہیں عالم گیر شہرت حاصل ہو چکی ہے۔ انہوں نے عربی اور فارسی زبان وادب کے ادبا، شعرا اور علما سے متعلّق جو مضامین ومقالات قلم بند کیے ہیں وہ انہیں مذکورہ زبانوں کے ادب کے ماہرین کی فہرست میں شامل کرانے کے لیے کافی ہیں۔

امتیاز علی خاں عرشی کی ایک کتاب کا نام ''نہج البلاغہ کا استناد'' ہے جس میں انہوں نے ہندوستان میں علمِ حدیث کی سمت ورفتار پر بھی روشنی ڈالی ہے اور اسی موضوع سے متعلّق سیر حاصل بحث بھی کی ہے۔ مذکورہ کتاب اور اسی نوعیت کی دوسری کتابوں اور مضامین ومقالات کے مطالعے سے واضح ہے کہ وہ اسلامیات پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ امام سفیان ثوری کی تفسیرِ قرآن ''الثوری'' کا شمار اُن کی وقیع دریافتوں میں کیا جاتا ہے۔ جس طرح علماے عرب ''الثوری'' کی تدوین کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اُسی طرح فارسی زبان کی کتاب ''تاریخِ محمّدی'' کی تدوین کو فارسی کے علما امتیاز علی خاں عرشی کا اہم کام قرار دیتے ہیں۔ ''رانی کیتکی کی کہانی'' کی تدوین اور رام پور رضا لائبریری میں مخزون عربی مخطوطات کی فہرست کا شمار بھی اُن کے اہم کاموں میں کیا جاتا ہے۔ اُن کے لسانی اور علمی کارناموں کی تعداد بھی کم نہیں ہے۔

اُنہوں نے سعادت یار خاں رنگین کے ''دیوانِ ریختی'' اور خان آرزو کی ''نوادرِ الالفاظ'' کی مدد سے خواتین کے محاورات یکجا کر کے ''محاوراتِ بیگمات'' کے عنوان سے نہایت اہم کتاب ترتیب دی ہے۔ وہ زبان وقواعد پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ ''محاوراتِ بیگمات'' کے علاوہ اُردو زبان کی بناوٹ میں افغانوں کا حصّہ، پشتو میں تذکیر وتانیث، امیر خسرو کے اشعار میں ایرانی تلفّظ جیسے مضامین کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں زبان وقواعد پر بھرپور دسترس حاصل تھی۔ دراصل مولانا امتیاز علی خاں عرشی ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ وہ بیک وقت اعلیٰ درجہ کے مخطوطہ شناس، عالمِ دین، انشا پرداز، عظیم محقّق، متنی نقّاد، مترجم، شاعر، دانشور اور ماہرِ غالبیات تھے۔

09.04 امتیاز علی خاں عرشی کے حالاتِ زندگی

مولانا امتیاز علی خاں عرشی کی ولادت رام پور کے محلّہ پھُلواڑ میں ۸/دسمبر ۱۹۰۴ء مطابق ۲۹/رمضان المبارک ۱۳۲۲ھ کو ہوئی تھی۔ اُن کے والد کا نام مختار علی خاں اور والدہ کا نام چھمّی بیگم ہے۔ مولانا عرشی کے آبا واجداد کا تعلّق افغانستان کے علاقۂ صوات سے تھا جہاں حاجی خیل نام کا ایک خاندان آباد تھا۔ یہ خاندان یوسف زئی قبیلے کی ایک شاخ اِکوزئی کی شاخ تھا۔ اسی شاخ کے ایک بزرگ کا نام رحم باز خاں تھا جو نوّاب سیّد فیض اللہ خاں والیِ رام پور کے عہد میں رام پور آئے تھے۔ عرشی صاحب کی والدہ کا تعلّق ایک صوفی خاندان سے تھا جو نسباً محمّد خیل اور موطناً باجوڑی تھا۔ اُن کے مورثِ اعلیٰ بھی نواب فیض اللہ خاں کے عہد میں افغانستان سے وارِدِ رام پور ہوئے تھے۔ مولانا عرشی کی والدہ عہدِ جوانی میں عارضۂ طاعون میں مبتلا ہوگئی تھیں جس کے سبب ۲۲/برس کی عمر میں اُن کا انتقال ہوگیا تھا۔ اُس وقت عرشی صاحب تقریباً ڈھائی برس کے تھے۔ امتیاز علی خاں عرشی کی ابتدائی تعلیم رام پور میں حافظ جعفر علی کے مکتب میں ہوئی۔

اس کے بعد اُنہیں ایک پرائمری اسکول میں داخل کرادیا گیا جہاں انہوں نے تقریباً دو سال تک تعلیم حاصل کی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد انہوں نے ۱۹۲۳ء میں اورینٹل کالج لاہور سے امتیازی نمبروں کے ساتھ مولوی عالم کا امتحان پاس کیا۔ بعدازاں انہوں نے صرف انگریزی مضمون کا امتحان دے کر انٹرینس کی سند حاصل کی۔ عام بچّوں کی طرح امتیاز علی خاں عرشی بھی بچپن میں پڑھنے سے زیادہ کھیل کود میں دل چسپی رکھتے تھے۔ انہیں اُن کے والد نے مدرسہ کے علاوہ کئی اُستادوں کے گھر پر پڑھنے کے لیے بھیجا مگر کہیں اُن کی طبیعت نہیں لگی۔ وہ ایک روز حکیم عبدالرشید کے مطب سے پڑھ کر واپس آرہے تھے کہ راستے میں انہیں ایک نوتعمیر مدرسہ مطلع العلوم نظر آیا۔ وہ نادانستہ طور پر اُس مدرسہ میں داخل ہوگئے۔ وہاں مولوی سیّد احمد ہزاروی کچھ بچّوں کو درس دے رہے تھے۔ مولوی صاحب نے انہیں دیکھ کر اپنے قریب بُلایا۔ اُن سے اُن کی کتابوں اور اُن کے اُستاد کے بارے میں پوچھا۔ اس کے بعد اُن سے سبق سُنانے کے لیے کہا۔ وہ نہ تو ٹھیک سے عربی عبارت پڑھ سکے اور نہ ہی اُس کا ترجمہ کر سکے۔ انہوں نے گھر پہنچتے ہی اپنے والد سے مدرسہ مطلع العلوم کا واقعہ بیان کیا اور اُس مدرسہ میں تعلیم حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ اُن کے والد نے انہیں مذکورہ مدرسہ میں داخل کرادیا۔ عرشی صاحب کی تعلیمی نشوونما میں اس مدرسہ کو اوّلیت حاصل ہے۔ یہاں کے تعلیمی اثرات کے سبب وہ بڑی حد تک کھیل کود، سیر وتفریح اور شادی بیاہ وغیرہ سے بے نیاز ہوگئے تھے۔ اسی مدرسہ میں تعلیم حاصل کرنے کے دَوران انہوں نے محبّ اللہ الہباری کی کتاب کی تلخیص ''**تسهيل الميزان في صناعقه الميزان**'' کے عنوان سے قلم بند کی تھی۔

۳۱/جولائی ۱۹۳۲ء کو امتیاز علی خاں عرشی کی تقرّری رام پور میں ناظمِ کتب خانہ کی حیثیت سے ہوئی۔ ۱۹۳۳ء میں اُن کا عقد اشفاق النبی کی دختر، اسحٰق النبی کی ہمشیرہ کے ساتھ ہوا۔ عرشی صاحب کے والد مختار علی خاں کو یرقان کا مرض لاحق ہوگیا تھا جس کے سبب ۸/جنوری ۱۹۵۱ء کو اُن کی وفات ہوگئی۔ ۱۹۵۸ء میں عرشی صاحب کو ماہرینِ ہندوستانیت وفد کے ایک رکن کی حیثیت سے یونائیٹڈ اسٹیٹ آف سوویت روس کے دَورے پر بھیجا گیا۔ اسی سال اُن کی مایۂ ناز تالیف ''دیوانِ غالبؔ نسخۂ عرشی'' شائع ہوئی۔ اُن کی اس کاوش کی قدر کے اعتراف میں ۱۹۶۱ء میں ساہتیہ اکیڈمی نے انہیں پانچ ہزار روپئے کے انعام سے نوازا۔ ۲۴ یا ۲۵/فروری ۱۹۸۱ء کی درمیانی شب میں تقریباً ڈھائی بجے عرشی صاحب کی وفات ہوگئی۔ عرشی صاحب کی پرورش وپرداخت خالص مشرقی ماحول میں ہوئی تھی۔ وہ پُرانی وضع قطع کے دِلدادہ تھے اور پرانی قدروں کی قدر کرتے تھے۔ وہ اکثر مشرقی لباس زیبِ تن کرتے تھے اور اکثر علی گڑھی وضع کا پاجامہ، شیروانی، رام پوری گول ٹوپی اور ہلکے سلیم شاہی جوتے پہنتے تھے۔ اُن کے ہاتھ میں اکثر ایک چھڑی بھی ہوتی تھی۔ لائبریری میں آنے کے تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنی شیروانی اُتار کر رکھ دیتے تھے۔ اُن کی شخصیت نہایت وجیہ اور بارعب تھی۔ اُن کے مزاج ہی کی طرح اُن کی گفتگو میں نرمی اور لطافت کو محسوس کیا جاسکتا تھا۔ رعونت، تکبر اور ظاہرداری کو انہوں نے کبھی اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیا۔ ہر شخص سے خندہ پیشانی، خوش دِلی اور انکساری سے ملنا اُن کا شعار تھا۔

عشرت رحمانی اپنے ایک مضمون ''عرشی رام پوری'' میں رقم طراز ہیں:

> ''عرشی کا ظاہر و باطن یکساں ہے۔ وہ جس سے ملتے ہیں کھُل کر ملتے ہیں۔ ہر کسی کو ''بھائی'' نہیں کہتے مگر جس کو اس رشتہ سے مخاطب کرتے ہیں اُس کو صدق دل سے سمجھتے ہے..... عرشی صاحب ذہنی اور جسمانی طور پر نہایت صحت منداور عملی انسان ہیں۔ وہ اپنے فرائض ومعاملات میں نہایت متدیّن ومستعد ہیں۔ اعزا و

احباب کے ساتھ برتاؤ میں بھی وہ اپنے اس اصول کا پورا پورا لحاظ رکھتے ہیں۔ ہر معاملہ اور تعلّق میں کامل خلوص و دیانت برتتے ہیں اور اپنے علمی و ادبی مشاغل کی انجام دہی میں بھی پوری طرح اپنے مقرّرہ اصول پر سختی سے کاربند رہتے ہیں۔ اس لیے پابندیِ وقت اُن کی فطرتِ ثانیہ ہے۔ کوئی ترغیب یا کوئی قوّت اُن کے عزائم و اصول میں تغیّر یا اضمحال نہیں پیدا کر سکتی۔''

(نقوش لاہور شخصیت نمبر حصّہ دوم، اکتوبر ۱۹۶۵ء، شمارہ ۵۹..۶۰، ص..۹۸۵..۹۸۶..۹۸۷)

عرشی صاحب کی شخصیت سادگی اور معصومیت سے عبارت تھی۔ وہ اپنی قابلیت اور کارناموں کا نہ کسی سے کبھی تذکرہ کرتے تھے اور نہ کسی کی زبانی اپنے کارناموں اور اپنے تعریف کو سُننا پسند کرتے تھے۔ اگر کسی تقریب میں کوئی شخص اُن کی تعریف کرتا تو وہ نہایت خوش اُسلوبی سے اُس موضوع کو دوسری طرف موڑ دینے کی کوشش کرتے تھے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱﴾ امتیاز علی خاں عرشی کی پیدائش کب ہوئی تھی؟

﴿۲﴾ امتیاز علی خاں عرشی کے والد کا نام کیا ہے؟

﴿۳﴾ امتیاز علی خاں عرشی کی وفات کس سنہ میں ہوئی تھی؟

09.05 امتیاز علی خاں عرشی بحیثیت محقق

مولانا امتیاز علی خاں عرشی کی تحقیقی کاوشات نہایت اہم ہیں۔ اُن کی زندگی کا ایک بڑا حصّہ عربی، فارسی اور اُردو کی نگارشات کی تحقیق میں صَرف ہوا ہے۔ اُن کا پہلا تحقیقی مضمون بہ عنوان ''صحیح مسلم کا ایک قدیم نسخہ ہندوستان میں'' ماہنامہ معارف اعظم گڑھ کے اگست ۱۹۳۰ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ اُن کے تحقیقی کاموں یا دریافتوں کی تعداد بہت زیادہ ہے مگر یہاں اُن کے اہم تحقیقی کاموں کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔

''تفسیرِ سفیانِ ثوری'' کا ایک قلمی نسخہ رام پور رضا لائبریری میں ایک عربی مخطوطہ کے ساتھ منسلک تھا جسے اُس مخطوطہ کا جُز خیال کیا جاتا تھا۔ ''تفسیرِ سفیانِ ثوری'' کا کوئی دوسرا نسخہ ابھی تک کہیں دریافت نہیں ہو سکا ہے۔ مولانا عرشی نے اس نسخہ کو اپنے مقدّمہ اور حواشی کے ساتھ شائع کیا جسے اُن کا اہم کارنامہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ مرزا غالبؔ نے وقتاً فوقتاً فرماں روایانِ رام پور کے نام جو خطوط رقم کیے تھے انہیں عرشی صاحب نے تلاش کر کے شائع کرائے۔ اُنہوں نے نوّاب الٰہی بخش خاں معروفؔ کی ایک غیر مطبوعہ غزل کو دریافت کر کے ماہنامہ نیرنگ دلّی میں شائع کرائی جس کا مطلع درج ذیل ہے:

کیوں کہ بہم ہوں مہر و مہ، پوچھے تو مت بتا کہ یوں جب شبِ مہ ہو مہر وش، مُنہ سے نقاب اُٹھا کہ یوں

نواب سیّد مشتاق علی خاں نے مدار المہامِ ریاست جنرل عظیم الدّین خاں سے متعلّقہ کتاب خانہ کی اصلاحات کے لیے مولانا شبلی نعمانی سے تجاویز ارسال کرنے کی خواہش کی تھی۔ شبلی نعمانی نے ۱۴/ اکتوبر ۱۸۸۸ء کو اپنی تجاویز ارسال کر دی تھیں۔ مولانا عرشی نے اپنے عہدِ نظامت میں ان تجاویز کی تحریر کو کتاب خانہ کے ردّی گھر سے برآمد کیا اور کتاب خانہ کے معائنہ رجسٹر پر مولانا شبلی کے اندراج کو ''علاّمہ شبلی کی دو غیر مطبوعہ تحریریں: کتاب خانۂ رام پور سے متعلّق'' عنوان سے ایک مضمون کی شکل میں ماہنامہ معارف اعظم گڑھ کے اکتوبر ۱۹۳۴ء کے شمارے میں شائع کرا دیا۔

نواب سیّد کلب علی خاں نوّابؔ کی فرمائش پر مرزا اسداللہ خاں غالبؔ نے اپنا اُردو اور فارسی کا منتخب کلام ارسال کیا تھا۔ کتاب خانہ کے منتظمین نے مرزا غالبؔ کے منتخب فارسی کلام کو تو کتب خانہ کے شعبۂ دواوین میں داخل کر دیا تھا مگر اُردو انتخاب کو ردّی گھر میں ڈال دیا تھا۔ مولانا عرشی نے تقریباً ۷۵ رسال کے بعد اس اُردو انتخاب کو رَدّی گھر سے برآمد کیا اور فارسی و اُردو شاعری کے مکمّل انتخاب کو ''انتخابِ غالبؔ'' کے عنوان سے ۱۹۴۲ء میں رام پور رضا لائبریری سے شائع کرا دیا۔ شبلی نعمانی اور رام پور کے ریاستی کتاب خانہ کے دو ناظموں حافظ احمد علی خاں شوقؔ اور حکیم اجمل خاں سے خط و کتابت ہوتی رہتی تھی۔ ان دونوں ناظموں کے نام لکھے گئے دو خطوط کے علاوہ تمام خطوط تلف ہو گئے ہیں۔ مولانا عرشی نے ان دونوں خطوط کو کتاب خانہ کے ردّی گھر سے برآمد کیا اور اپنے ایک مضمون کے ذریعہ تعارف کرایا جو ماہنامہ معارف اعظم گڑھ کے دسمبر ۱۹۴۲ء کے شمارہ میں شائع ہوا۔ یہ خطوط بالترتیب ۱۲ر جنوری ۱۸۹۸ء اور ۲۱ ر مئی ۱۹۰۳ء کو تحریر کیے گئے تھے۔

رام پور کے کتاب خانہ میں مومن خاں مومنؔ کا ایک ایسا قلمی دیوان محفوظ تھا جس میں اُن کی ایسی ۶ رغزلیں درج تھیں جو کسی قلمی یا مطبوعہ دیوان میں نہیں تھیں۔ مولانا عرشی نے ان غزلوں کو دریافت کر کے ماہنامہ نگار لکھنؤ کے جون ۱۹۴۳ء کے شمارہ میں شائع کرائیں۔ نواب سیّد محمد یوسف علی خاں ناظمؔ اور صاحب زادہ عبّاس علی خاں بیتابؔ کے کلام پر مرزا غالبؔ کی اصلاحات کو بھی مولانا عرشی کی تحقیق کہا جائے گا۔ اُنہوں نے یہ اصلاحات غالبؔ کے خطوط سے دریافت کی ہیں۔ ''مکاتیبِ غالبؔ'' کی پہلی اشاعت میں یہ اصلاحات شامل نہیں ہیں۔ اُنہیں دوسرے ایڈیشن میں شامل کر لیا گیا ہے۔ یہ اصلاحیں ماہنامہ نگار لکھنؤ کے اکتوبر ۱۹۴۳ء کے شمارہ میں بھی شائع کی گئی تھیں۔ کئی تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ آنند رام مخلصؔ نے اُردو اور فارسی زبانوں میں اشعار کہے ہیں مگر اُن کے اُردو کے دو چار اشعار ہی دستیاب ہوئے تھے۔ مولانا عرشی نے مخلصؔ کے کُلیاتِ نظم فارسی کے ایک مخطوطہ سے اُردو کے ۳۲ ر اشعار تلاش کیے اور اُنہیں اپنے ایک مضمون میں شامل کر کے ماہنامہ معاصر پٹنہ کے مئی ۱۹۵۱ء کے شمارہ میں شائع کرائے۔ ''دیوانِ غالبؔ نسخۂ عرشی'' کے حصّۂ سوم کا عنوان ''یادگارِ نالہ'' ہے۔ اس حصّہ میں مرزا غالبؔ کا جو کلام شامل کیا گیا ہے وہ بھی مولانا عرشی کی تلاش و جستجو کا نتیجہ ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۴﴾ امتیاز علی خاں عرشی کے پہلے تحقیقی مضمون کا عنوان کیا ہے؟

﴿۵﴾ کس نوّاب نے شبلی نعمانی کے کتاب خانہ سے متعلق تجاویز ارسال کرنے کی خواہش کی تھی؟

﴿۶﴾ ''دیوانِ غالبؔ نسخۂ عرشی'' کے حصّہ سوم کا عنوان کیا ہے؟

09.06 ترتیب وتدوین

مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے ادب کے کئی گوشوں میں قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں مگر اُن کا سب سے اہم کارنامہ ترتیب و تدوین ہے۔ اُنہوں نے اُردو، عربی اور فارسی کی متعدّد کتابوں کی ترتیب وتدوین کی ہے جن میں سے اُردو کی چند اہم کتابوں کا تعارف پیش کیا جا رہا ہے۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی صحتِ متن، اختلافِ نسخ کے اظہار، رموزِ اوقاف کے استعمال، ماخذ کی نشان دہی اور اُن کی جانچ پرکھ پر حد درجہ توجّہ دیتے تھے۔

﴿۱﴾ مکاتیبِ غالب: مرزا غالبؔ نے رام پور کے والیانِ ریاست کے نام جو خطوط تحریر کیے تھے اُنہیں مولانا عرشی نے ''مکاتیبِ غالبؔ'' کے عنوان سے مرتّب کیے جس کے متعدّد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس مجموعہ کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۷ء میں، دوسرا ۱۹۴۳ء میں، تیسرا ۱۹۴۵ء میں، چوتھا ۱۹۴۶ء میں، پانچواں ۱۹۴۷ء میں اور چھٹواں ایڈیشن ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا تھا۔ مولانا عرشی نے مجموعہ کے آغاز میں ایک مبسوط مقدّمہ تحریر کیا ہے جس میں غالبیات سے متعلّق مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مفید اور معلوماتی حواشی کا اندراج بھی کیا ہے۔ تمام خطوط مکتوبِ الیہم اور زمانۂ کتاب کے لحاظ سے ترتیب دیے ہیں۔ جن خطوط پر تاریخیں درج نہیں تھیں یا وہ حصّہ پھٹ گیا تھا یا خود مرزا غالبؔ سے غلط درج ہو گئی تھیں، اُن تاریخوں کو کہیں لفافوں پر درج تاریخ تو کہیں مکاتیب کے جوابات کی نقلوں سے استفادہ کر کے صحیح تاریخ تک پہنچنے کی کوشش کی گئی ہے جس کا اظہار باقاعدہ طور پر حواشی کے ذریعہ کر دیا گیا ہے۔ خطوط کے اندراج سے قبل مکتوبِ الیہ کا تعارف بھی کرایا گیا ہے۔ طبعِ اوّل میں خط شماری کے لیے ہر خطوط پر نمبر درج کیے گئے ہیں۔ طبعِ دوم اور دیگر ایڈیشنوں میں اتنا اضافہ اور کیا گیا ہے کہ دوسرے مکتوبِ الیہ کے تمام خطوط اور اس کے بعد والوں کے بھی تمام خطوط پر دوہرے نمبر درج کیے گئے ہیں جن کا التزام اس طرح کیا گیا ہے کہ ایک نمبر مکتوبِ الیہ کے خط کا اور دوسرا نمبر آغازِ کتاب سے خطوط کا درج کیا گیا ہے۔ خطوط لکھتے وقت مرزا غالبؔ سے جو الفاظ چھوٹ گئے تھے اُن کو جملوں اور عبارت کے مطابق پورا کر کے حاشیوں میں صراحت کر دی گئی ہے۔ حواشی کے ذریعہ اُن مکاتیب کی نشان دہی کر دی گئی ہے جن کی عبارت مرزا غالبؔ نے دوسروں سے لکھائی تھی۔

﴿۲﴾ انتخابِ غالبؔ: ''انتخابِ غالبؔ'' امتیاز علی خاں عرشی کی تدوین کا بہترین نمونہ ہے۔ اُنہوں نے مرزا غالبؔ کے کلام کی ترتیب روایتی انداز سے کی ہے۔ سب سے پہلے غزلیات، پھر قصائد اس کے بعد مثنوی در صفت انبہ پھر قطعات اور آخر میں رباعیات کی شمولیت ہے۔ بہ اعتبارِ صنف اشعار کی تعداد درج ذیل ہے:

تعدادِ غزلیات ۱۸۹/تعداد اشعار ۶۷۳، تعدادِ قصائد ۴ تعداد اشعار ۹۲، تعدادِ مثنوی ۱ تعداد اشعار ۳۳،

تعدادِ قطعات ۷ تعداد اشعار ۴۰، تعدادِ رباعیات ۵ تعداد اشعار ۱۰۔

اس انتخاب میں صحتِ متن پر خاص توجّہ مرکوز کی گئی ہے۔ انتخاب کے آخر میں اخلافِ نسخ کے عنوان سے کلامِ غالبؔ کے آٹھ نسخوں سے استفادہ کرتے ہوئے ۹۶/اختلافات کی نشان دہی کی گئی ہے۔ صحتِ تلفّظ کے مدِّنظر الفاظ پر اعراب بھی لگائے گئے ہیں اور اشعار کی صحیح قرأت کے لیے متن میں رموز و اوقاف کا بھی حد درجہ خیال رکھا گیا ہے۔

﴿۳﴾ نادراتِ شاہی: 'نادراتِ شاہی' مغل بادشاہ ابوالظفر جلال الدّین محمّد شاہ عالم ثانی کے اُردو، فارسی اور ہندی کلام کا مجموعہ ہے جو مخطوطہ کے مطابق فارسی اور دیوناگری رسمِ خط میں شائع کیا گیا ہے۔ کتاب کو عنوانات کے مطابق درج ذیل حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

﴿۱﴾ غزل ریختہ ﴿۲﴾ سیٹھنے ﴿۳﴾ استت پیراں

﴿۴﴾ مبارک باد جشنِ نوروز ﴿۵﴾ غزل و بیت فارسی ﴿۶﴾ ہوری، کبت و دوہرا

﴿۷﴾ مہدی غوثِ الاعظم ﴿۸﴾ کبت و دوہرا ﴿۹﴾ نائیکہ بھید

﴿۱۰﴾ترانے

بعض مقامات کے علاوہ تمام نظموں پر راگ یا تال کا نام عنوان دے کر تحریر کیا گیا ہے۔ ہندی اور اُردو کے متنوں میں جو اختلافات تھے اُن کی نہایت احتیاط سے صحت کی گئی ہے۔ اختلافِ الفاظ کے عنوان سے آخر میں ایک فہرست بھی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ دونوں زبانوں کے متن میں ۳۹۵ مقامات پر اختلاف کو ظاہر کیا گیا ہے۔

﴿۴﴾سلکِ گوہر: سیّد انشا اللہ خاں انشؔا کی ایک کتاب ''سلکِ گوہر'' کا ایک مخطوطہ رام پور رضا لائبریری میں محفوظ ہے لیکن اس کے دوسرے نسخہ کا کہیں پتہ نہیں چل سکا ہے۔ امتیاز علی خاں عرشی نے عام افادے کی غرض سے اس نسخہ کو منظر عام پر لانے کے لیے مرتّب کیا۔ دوسرا نسخہ دستیاب نہ ہونے کے سبب اسی نسخہ کو بنیاد بنا کر ضروری الفاظ کی تصحیح اور فُٹ نوٹس کے ساتھ ۱۹۴۸ء میں اسٹیٹ پریس رام پور سے طبع کرایا۔ انشا اللہ خاں انشؔا نے صنعتِ مہملہ میں ایک داستان لکھی تھی جو اس کتاب میں شامل ہے۔ کتاب کے کل صفحات ۱۵۱ ہیں۔

﴿۶﴾محاوراتِ بیگمات: سعادت یار خاں رنگینؔ نے اپنے کلام میں ایسے بہت سے الفاظ استعمال کیے ہیں جنہیں صرف عورتیں ہی استعمال کرتی ہیں۔ اُنہوں نے اپنے دیوانِ ریختی سے اُن الفاظ کو اخذ کیا جنہیں صرف عورتیں بولتی ہیں اور اُن کے معانی و مطالب لکھ کر ''لغتِ ریختی'' کا عنوان دے دیا۔ امتیاز علی خاں عرشی کو رام پور رضا لائبریری میں خان آرزوؔ کی لغت ''نوادرِ الالفاظ'' کا ایک ایسا نسخہ دستیاب ہو گیا جس میں تقریباً اُنہیں الفاظ کی تشریحات درج تھیں جنہیں سعادت یار خاں رنگینؔ نے لغتِ ریختی'' میں تحریر کی تھیں۔ مولانا عرشی نے دونوں کتابوں کی مدد سے ایک تیسری لغت بہ عنوان ''محاوراتِ بیگمات'' مرتّب کر دی۔

﴿۷﴾دیوانِ غالبؔ نسخۂ عرشی: ''دیوانِ غالبؔ نسخۂ عرشی'' کو امتیاز علی خاں عرشی کی تدوین کا بہترین نمونہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ اُنہوں نے اس کام کی ابتدا ۱۹۴۳ء میں کی تھی اور ۱۵ برس کی محنت و عرق ریزی کے بعد ۱۹۵۸ء میں مکمل کیا۔ اُنہوں نے شہاب سرمدی کو انٹرویو دیتے ہوئے ایک سوال کے جواب میں کہا تھا:

> ''مَیں نے کلام غالبؔ کی تصحیح و تدوین میں اُن تمام نسخوں کو سامنے رکھا ہے جو غالبؔ کی زندگی میں لکھے گئے یا طبع ہوئے۔ اُن میں سے ایسے نسخے بھی ہیں جن کی خود غالبؔ نے تصحیح کی تھی۔ مَیں نے غالبؔ کے سارے کلام کو تاریخی ترتیب سے جمع کیا ہے اور ساتھ ساتھ تمام مستند نسخوں کے اختلافِ الفاظ کو ضبط کر لیا ہے۔ علاوہ ازیں غالبؔ نے اپنے خطوط میں اپنے کلام کی جو تشریح یا توضیح کی ہے یا فارسی اشعار میں اُنہیں مطالب کو ادا کیا ہے، مَیں نے اس سب کو شرحِ غالبؔ کے نام سے آخر میں اِکٹھا کر دیا ہے۔ مزید برآں غالبؔ کے دواوین کے علاوہ دوسری جگہوں سے اُن کے جو شعر ملے ہیں ''یادگارِ نالہ'' کے نام سے اُنہیں آخر میں شامل کر لیا ہے۔''

امتیاز علی خاں عرشیؔ نے اس نسخہ میں مرزا غالبؔ کا وہ تمام کلام شامل کر لیا ہے جو اُس وقت تک اُنہیں دستیاب ہو گیا تھا۔ اس نسخہ میں بعض ایسے اشعار بھی شامل ہو گئے ہیں جو مرزا غالبؔ کے نہیں ہیں مگر اُن سے منسوب کر دیے گئے ہیں۔ مرزا غالبؔ کا جو کلام مذکورہ نسخہ کی اشاعت کے بعد دستیاب ہوا اُسے مولانا عرشی کے فرزند اکبر علی خاں عرشی زادہ نے ''ضمیمہ نسخۂ عرشی'' کے عنوان سے دو ماہی شیرازہ، کشمیر جولائی

۱۹۶۵ء کے شمارہ میں شائع کرایا۔ کچھ عرصہ کے بعد جب ''دیوانِ غالبؔ بہ خطِ غالبؔ'' دستیاب ہوا تو عرشی زادہ نے ''دیوانِ غالبؔ نسخۂ عرشی زادہ'' کے نام سے ہندوستان میں اور محمد طفیل نے ''بیاضِ غالبؔ'' کے نام سے پاکستان میں نقوش لاہور کے ایک خاص نمبر میں شائع کرایا۔

دیوان کے صفحہ ۳۰۲ پر درج اپریل فول سے متعلّق غزل نمبر ۳۲ اور آسیؔ لکھنوی سے نقل کردہ غزلیں غالبؔ سے منسوب کر دی گئی تھیں۔ اُنہیں بھی مولانا عرشی نے دیوان میں شامل کر دی ہیں۔ حقیقت واضح ہونے پر اُنہوں نے حواشی کے ذریعہ مذکورہ کلام کو دیوان سے خارج کرنے اور اپنی بے اطمینانی کا کھُل کر اظہار کیا ہے۔ طبعِ دوم میں تمام الحاقی اور مشکوک کلام کو دیوان سے خارج کر دیا گیا ہے۔ اس دیوان کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ تمام کلام کو تاریخی ترتیب سے تحریر کیا گیا ہے۔ اگر چہ بہ اعتبارِ تاریخ کلام کو ترتیب دینے میں کچھ دشواریاں بھی لاحق تھیں جن کا اظہار مولانا عرشی نے اس طرح کیا ہے:

> ''ہر حصّے کے اصناف کو جداگانہ تاریخ وار مُرتّب کیا ہے اور جہاں تک غزلوں کا تعلّق ہے ہر ردیف کی غزلوں کو الگ حصّہ قرار دے کر اُنہیں تاریخی حیثیت سے آگے پیچھے رکھا ہے۔ مرزا صاحب نے نسخۂ بھوپال کے متن کی اکثر غزلوں میں ۱۲۳۷ھ کے بعد نئے شعر بڑھائے تھے۔ ان اشعار کو مذکورہ غزلوں سے جُدا کر کے اُن کی تاریخی جگہ پر رکھنے کی جرأت نہیں کی کہ اس طرح غزلوں کے ٹکڑے نوالے ہو جاتے، ہاں اُنہیں دوسرے اشعار سے ممتاز ضرور کر دیا ہے۔''

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۷﴾ مرزا غالبؔ کے رام پور کے والیانِ ریاست کے نام تحریر کردہ خطوط کے مجموعہ کا نام کیا ہے؟

﴿۸﴾ ''نادراتِ شاہی'' کو عنوانات کے مطابق کتنے حصّوں میں شائع کیا گیا ہے؟

﴿۹﴾ امتیاز علی خاں عرشی نے ''دیوانِ غالبؔ نسخۂ عرشی'' کی تدوین کا کام کتنے برس میں مکمّل کیا؟

09.07 امتیاز علی خاں عرشی بحیثیت ماہرِ غالبیات

امتیاز علی خاں عرشی کی زندگی کا ایک بڑا حصّہ تحقیق و تدوین میں صَرف ہوا ہے۔ اگر چہ اُنہوں نے دیگر تحقیقی کام بھی کیے ہیں مگر اُن کی نظر ہمہ وقت غالبیات ہی پر رہی ہے۔ غالبؔ یا غالبیات سے متعلّق اُن کے سب سے اہم کارنامے ''مکاتیبِ غالبؔ'' اور ''دیوانِ غالبؔ نسخۂ عرشی'' کی تدوین ہے۔ ''مکاتیبِ غالبؔ'' مرزا غالبؔ کے اُن مراسلات کا مجموعہ ہے جو والیانِ رام پور سے ہوئی تھی اور ریاست کے دارالانشا میں بے توجّہی کے ساتھ مخزون تھی۔ مولانا عرشی نے اُنہیں تلاش کیا اور اپنے فاضلانہ و محقّقانہ مقدّمہ کے ساتھ شائع کرایا۔ اس مجموعہ میں شامل غالبؔ کے خطوط اور مولانا عرشی کے مقدّمہ سے غالبیات کے ایسے بہت سے پہلو نمایاں ہوئے ہیں جن سے لوگ ناواقف تھے۔

امتیاز علی خاں عرشی نے ''دیوانِ غالبؔ نسخۂ عرشی'' کے عنوان سے مرزا غالبؔ کے بیشتر کلام کو یکجا کیا ہے۔ اُنہوں نے اس مجموعہ میں اُس کلام کو بھی شامل کر لیا ہے جسے خود مرزا غالبؔ نے رَدّ کر دیا تھا۔ ''مکاتیبِ غالبؔ'' اور ''دیوانِ غالبؔ نسخۂ عرشی'' مولانا عرشی کے ایسے گراں قدر کارنامے ہیں جن کی بدولت اُن کا شمار ماہر غالبیات میں کیا جانے لگا۔ مولانا عرشی نے دَورانِ تعلیم غالبؔ سے متعلّق سب سے پہلے جس کتاب کا مطالعے کیا تھا وہ مولانا سہاؔ کی کتاب ''مطالب الغالب'' تھی۔ اس کے بعد وہ غالبؔ کی شخصیت اور کلامِ غالبؔ کے دِلدادہ ہوتے چلے گئے۔ لائبریری میں ملازم ہونے کے تقریباً دس بارہ سال کے بعد اُنہوں نے مرزا غالبؔ سے متعلّق کام کرنا شروع کیا اور کثرت سے کیا۔ غالبیات سے متعلّق اُن کی کتابوں کے نام ''مکاتیبِ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ نسخۂ عرشی، انتخابِ غالبؔ اور فرہنگِ غالبؔ'' ہیں۔

غالبیات سے متعلّق اُن کے چند اہم مضامین کے عنوانات درج ذیل ہیں:

غالبؔ کی ایک غیر معروف مثنوی، دیوانِ غالبؔ اُردو کے ابتدائی نسخے، مرزا غالبؔ کی اصلاحیں، تدوینِ اشعارِ غالبؔ، نسخۂ حمیدیہ کے چند اغلاط، غالبؔ کی شعر گوئی اور اُن کے دو اوین۔ غالبؔ کے فارسی خطوط: ایک نئی تحقیق، غالبؔ کی اپنے کلام پر اصلاحیں، کچھ غالبؔ سے متعلّق، غالبؔ کا دربار اور خلعت، غالبؔ اور بُرہانِ قاطع، غالبؔ کی تاریخِ پیدائش، اُردو شاعری پر غالبؔ کا اثر، غالبؔ کی چند نئی اُردو تحریریں، غالبؔ کی کچھ نئی فارسی تحریریں، دیوانِ غالبؔ کا ایک اور نادر نسخہ، غالبؔ اور بُرہان، مجلسِ یادگارِ غالبؔ کا شائع کردہ دیوانِ غالبؔ، نسخۂ حمیدیہ اور بجنوری، نسخۂ حمیدیہ کی اشاعت کا سال، دیوانِ غالبؔ اُردو نسخۂ عرشی، قاطعِ بُرہان کا مسودہ، غالبؔ اور قاطعِ بُرہان چند غیر مطبوعہ تحریریں، مرزا غالبؔ کا زائچہ اور غالبؔ کی نئی تحریریں۔

مذکورہ کتب و مضامین کے علاوہ مولانا عرشی نے ''سرگزشتِ غالبؔ'' بھی قلم بند کی تھی جس کا مسودہ ضائع ہو گیا ہے۔ اُنہوں نے غالبؔ کے بہت سے مشکل اشعار اور اُن کے استعمال کیے ہوئے بہت سے نامانوس الفاظ کی شرحیں بھی کی ہیں۔ ماہرینِ غالبیات میں مولانا عرشی کا کیا مقام ہے، اس کے لیے وہ تمہیدی سطور درج ذیل ہیں جو دِلّی کے ماہنامہ علم و فن کے ابتدائی حصّہ میں شائع کی گئی تھیں:

> ''اس برّصغیر میں جو ماہرینِ غالبیات ہیں یا جن لوگوں کو غالبؔ پر اتھارٹی (Authority) قرار دیا جا سکتا ہے یا غالبؔ شناس کہا جا سکتا ہے اُن میں مولانا امتیاز علی خاں عرشی کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے بلکہ سرِ فہرست ہے۔ ذکرِ غالبؔ ہو محفل میں عرشی نہ ہوں تو محفل بے رنگ رہے گی۔ غالبؔ پر کوئی کتاب لکھی جائے اور عرشی صاحب کا اُس میں کوئی Contribution نہ ہو تو اس کتاب کی کیا قیمت۔ غالبؔ پر اگر کوئی دستاویز تیار کی جائے اور اُس میں مولانا عرشی کا حصّہ نہ ہو تو میرے نزدیک وہ دستاویز خام ہو گی۔''

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱۰﴾ غالبیات سے متعلّق امتیاز علی خاں عرشی کے سب سے اہم کارنامے کیا ہے؟

﴿۱۱﴾ مولانا عرشی نے غالبؔ سے متعلّق سب سے پہلے کس کتاب کا مطالعہ کیا تھا؟

﴿۱۲﴾ غالبؔ سے متعلّق مولانا عرشی کا تحریر کردہ جو مسودہ ضائع ہو گیا، اُس کا نام کیا تھا؟

09.08 مقدّمے اور حواشی

امتیاز علی خاں عرشی کو مقدّمہ نویسی اور حاشیہ نگاری میں مہارت حاصل تھی۔ اُنہوں نے متعدّد کتابوں کے مقدّمے یا دیباچے تحریر کیے ہیں۔ یہی حال اُن کی حاشیہ نگاری کا بھی ہے۔ اُن کے تحریر کردہ بعض حواشی اس قدر طویل ہوتے ہیں کہ اُن کو ایک مستقل مضمون کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ اُنہوں نے جن کتابوں پر مقدّمے اور حواشی لکھے ہیں اُن میں سے درج ذیل نہایت اہم ہیں :

﴿۱﴾ مکاتیبِ غالبؔ: مکاتیبِ غالبؔ کا مقدّمہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی کی برسوں کی عرق ریزی اور محقّقانہ کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ یہ متن سے زیادہ ضخیم ہے۔ طبعِ اوّل کا متن مع حواشی پاورق ۱۲۱ صفحات پر مشتمل ہے اور دیباچہ یعنی مقدّمہ کے صفحات کی تعداد ۱۷۳ ہے۔ طبعِ

دوم میں متن کے صفحات کی تعداد ۱۱۶/اور دیباچہ کے صفحات کی تعداد ۲۱۹ ہے۔طبعِ سوم میں متن کے صفحات کی تعداد ۱۱۷.اور دیباچہ کے صفحات کی تعداد ۲۳۸ ہے۔یہی حال تقریباً طبع چہارم اور طبعِ پنجم کا ہے۔طبعِ ششم میں مقدّمہ کے صفحات کی تعداد ۲۵۴ ہے۔

مولانا عرشی نے اس مقدّمہ میں غالبیات کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

طبعِ ششم کے دیباچہ کو درج ذیل عنوانات کے تحت تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

﴿۱﴾سرگزشتِ غالب ﴿۲﴾تلامذۂ رام پور ﴿۳﴾لوازماتِ امارت

﴿۴﴾انگریز تعلّقات ﴿۵﴾تعلّقاتِ قلعۂ معلّٰی ﴿۶﴾تعلّقاتِ رام پور

﴿۷﴾اصلاحِ غالبؔ ﴿۸﴾انشاے غالبؔ ﴿۹﴾تعلّقاتِ انشاء ﴿۱۰﴾طبعاتِ خطوط

﴿۲﴾انتخابِ غالب: امتیاز علی خاں عرشی نے انتخابِ غالبؔ کے لیے جو طویل دیباچہ تحریر کیا تھا بعض وجوہات کے سبب اُس کا کچھ حصّہ ہی اس کے انتخاب میں شامل کیا جاسکا تھا۔کچھ عرصہ کے بعد اس دیباچہ کو اضافوں کے ساتھ ''دیوانِ غالبؔ نسخۂ عرشی'' میں شامل کیا گیا۔

اس دیباچہ میں تمہید کے بعد ''غالبؔ کا دعویٰ'' کے عنوان سے مرزا غالبؔ کے اُن تاثرات پر روشنی ڈالی گئی ہے جن سے فارسی شاعری پر اُن کے فخر و مباہات اور ریختہ سے نا اُمیدی اور باعثِ ننگ ہونے کا اظہار ہوتا ہے۔''تشریحِ غالبؔ'' کے عنوان سے چند اشعار کی تشریح بھی کی گئی ہے۔اس کے بعد ''اختلافِ نسخ'' کے عنوان سے ۹۶/اشعار کے اُن اختلافاتِ متن کی بھی نشان دہی کی گئی ہے جو ''انتخابِ غالبؔ'' اور ''کلامِ غالبؔ'' کے دیگر ماخذوں میں پائے جاتے ہیں۔

﴿۳﴾دستور الفصاحت: ''دستور الفصاحت'' کے مقدّمہ کا عنوان دیباچہ ہے۔شروع میں بطورِ تمہید شعراے اُردو کے چند تذکروں سے متعلّق معلومات فراہم کی گئی ہیں۔اس کے بعد ''دستور الفصاحت'' کے مصنّف سیّد احمد علی خاں یکتاؔ لکھنوی کے حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ''دستور الفصاحت'' میں درج مصنّف کے فارسی اور اُردو اشعار کو یکجا کر دیا گیا ہے۔مولانا عرشی نے کتاب کے زمانۂ تصنیف سے بحث کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ یہ کتاب ۱۲۱۳ھ میں لکھی گئی تھی اور مصنّف نے ۱۲۲۹ھ یا ۱۲۳۰ھ میں اُسے نظرِ ثانی کے ذریعہ درست بھی کیا تھا۔اُنہوں نے نظرِ ثالث اور بعد میں کیے گئے اضافوں کی بھی نشان دہی کی ہے۔

﴿۴﴾نادراتِ شاہی: امتیاز علی خاں عرشی نے ''نادراتِ شاہی'' کے دیباچہ میں شاہِ عالم ثانی سے قبل مغل بادشاہوں کی مقامی یا دیسی علوم کی سرپرستی کا حال قلم بند کیا ہے۔اُنہوں نے بادشاہ کی سوانح حیات اور دیگر منتشر معلومات کو بڑی حد تک یکجا کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔دیباچہ میں جن گوشوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

اُن کے عنوانات درج ذیل ہیں:

نام ونسب ولادت،حلیہ،اخلاق تعلیم وتربیت

ولی عہدی سہارن پور کو روانگی لکھنؤ کا دَورہ

بنگال پر حملہ	بادشاہی	الہٰ آباد کو واپسی
بکسر کی لڑائی	الہٰ آباد کا قیام	بادشاہ کے پیچھے دہلی کی حالت
جاٹوں اور سکھّوں کا زور	مرہٹوں کی دوبارہ آمد	بادشاہ کی دہلی میں آمد
ضابطہ خاں پر حملہ	مرہٹوں سے نجات کی تدبیر	نجف خاں کا عروج
سکھّوں کی سرکشی	نجف خاں کی مَوت پر حکومت کی ابتری	بادشاہ کی آزادی
مرہٹوں کا تسلّط	بادشاہ کا نابینا کیا جانا	مرہٹوں کا طرزِ عمل
انگریزوں کا قبضہ	تاریخِ انتقال	

﴿۵﴾ سلکِ گوہر: امتیاز علی خاں عرشی نے ''سلکِ گوہر'' کے مقدّمہ میں سب سے پہلے انشا اللہ خاں انشؔا کے کارناموں پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے بعد صنعتِ مہملہ میں لکھی گئیں معروف نگارشات کا تذکرہ کیا ہے۔ متن کے چار صفحات کے علاوہ ہر صفحہ کے پاورق میں حواشی کے ذریعہ ظاہر کیا گیا ہے کہ اصل نسخہ میں کیا لفظ تھا اور اُنہوں نے کیا تغیّر کیا ہے اور کیوں کیا ہے۔ انہوں نے تصحیح کرتے وقت کُلّیاتِ انشا اور دریائے لطافت سے مدد بھی لی ہے جس کا اظہار پاورق میں کر دیا ہے۔ حواشی میں بعض الفاظ کی تشریح بھی کی گئی ہے۔

﴿۶﴾ وقائع عالم شاہی: ''وقائع عالم شاہی'' کنور پریم کشور فراقی کا روزنامچہ ہے جس میں ولی عہدیِ شاہِ عالم سے شمول لشکر تک کے چشم دید حالات فارسی زبان میں درج کیے گئے ہیں۔ یہ روزنامچہ عہدِ شاہِ عالم ثانی کے حالات کو سمجھنے کا ایک اہم ماخذ ہے۔

امتیاز علی خاں عرشی نے اس روزنامچہ کو اپنے دیباچہ اور حواشی کے ساتھ ۱۹۴۹ء میں رام پور رضا لائبریری سے شائع کرایا۔ دیباچہ میں حالاتِ مصنّف کے تحت مصنّف کی سوانح حیات، ذاتی اوصاف، مذہب، اولاد اور تصانیف کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ روزنامچہ کے مخطوطہ کی حالت، تاریخِ تصنیف اور اُس کی فنّی حیثیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ وقائع سے حاصل ہونے والی دل چسپ اور کارآمد معلومات بھی دیباچہ میں درج کی گئی ہیں اور لفظی و معنوی لغزشوں کی بھی نشان دہی کی گئی ہے۔

﴿۷﴾ دیوانِ غالبؔ نسخۂ عرشی: امتیاز علی خاں عرشی نے ''دیوانِ غالبؔ نسخۂ عرشی'' طبعِ اوّل کے دیباچہ میں مستند حوالوں کے ذریعہ غالبیات سے متعلّق بعض ایسے گوشوں پر روشنی ڈالی ہے جن سے بیشتر حضرات ناواقف تھے۔

اس دیباچہ کو درج ذیل عنوانات کے تحت تقسیم کیا جا سکتا ہے:

تعلیم و تربیت شعر گوئی ناقدردانیِ عصر جدید ترتیبِ دیوان ماخذوں کی تاریخی ترتیب

اس دیباچہ کا خلاصہ ''غالبؔ کا معیارِ سخن'' کے عنوان سے ماہنامہ نگار لکھنؤ کے جنوری ۱۹۶۱ء کے شمارہ میں شائع ہو چکا ہے۔ اصل متن کے بعد دیوان کو دو حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصّہ کا عنوان ''شرحِ غالبؔ'' اور دوسرے حصّہ کا عنوان ''اختلافِ نسخ'' ہے۔ شرحِ غالبؔ کو بھی تین حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے جن کے عنوانات گنجینۂ معنی، نوائے سروش اور یادگارِ نالہ ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱۳﴾ ''دستورالفصاحت'' کے مصنّف کا نام کیا ہے؟

﴿۱۴﴾ روزنامچہ ''وقائع عالم شاہی'' کس نے قلم بند کیا ہے؟

﴿۱۵﴾ ''دیوانِ غالبؔ نسخۂ عرشی'' کو اصل متن کے بعد کتنے حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے؟

09.09 امتیاز علی خاں عرشی بحیثیت شاعر

امتیاز علی خاں عرشی نے تحقیق وتدوین کے میدان میں جہاں کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں وہیں وہ ایک اچھّے شاعر بھی تھے۔انہوں نے اپنی شاعری کے ابتدائی دَور میں تاجؔ تخلّص اختیار کیا تھا مگر کچھ عرصہ کے بعد شاید شہرہ آفاق ڈراما ''انارکلی'' کے خالق امتیاز علی کے تخلّص تاجؔ کے تواُرد کے سبب انہوں نے اپنا تخلّص عرشیؔ کرلیا اور اسی تخلّص سے مشہور بھی ہوئے۔اُن کے کلام کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اُنہوں نے اُردو شاعری کو اتنا کچھ دیا ہے کہ اُسے اہلِ علم اور ادبی مؤرّخ نظرانداز نہیں کرسکتے۔

یوں تو مولانا عرشی نے مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے مگر غزل اور نظم اُن کی محبوب صنفِ سخن ہیں۔برسات، جنّتِ نَو، آفتاب، مَیں کون ہوں؟، ایک تصویر دیکھ کر، طلبائے جامعہ ملّیہ اسلامیہ سے، عزیزانِ وطن سے، مَیں ایسی قوم سے باز آیا، خدا کے حوالے وغیرہ جیسی بہترین نظموں کے علاوہ اُنہوں نے انگریزی زبان کی کئی نظموں کا منظوم ترجمہ بھی کیا ہے۔اُنہوں نے(A Little Plant) کو ''شجرِ نَوخیز'' کے عنوان سے اُردو نظم کے سانچے میں اس طرح ڈھالا ہے:

قلب میں تخمِ سختِ پنہاں کے خوابِ شیریں کے لے رہا تھا مزے
ایک ننّھا سا دل رُبا پودا
گرمیٔ آفتابِ تاباں نے قطرہ ہائے یمِ درخشاں نے
جاگ! آروشنی میں، اُس سے کہا
ننھے پودے نے جب صدا یہ سُنی دیکھنے کار گاہِ بیرونی
کس قدر ہے عجیب، اُٹھ بیٹھا

مولانا عرشیؔ کی غزلوں میں کلاسیکی روایت اور اپنے دَور کی حسّیت کے سبب فکر وفن کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔اُن کے یہاں غمِ جاناں بھی ہے اور غمِ دَوراں بھی، حُسن کی بہترین مصوّری بھی ہے اور اس دَور کے مسائل کی عکّاسی بھی۔ان کے درج ذیل عشقیہ اشعار میں بھی ایک قسم کے وقار اور سنجیدہ ٹھہراؤ کا کو محسوس کیا جاسکتا ہے:

تا سنبھالے ہمیں کوئی اُٹھ کر ٹھوکریں بار بار کھائیں گے
دل میں جو تھی، وہ چھپائی نہ گئی بات واں ہم سے بنائی نہ گئی
اپنی ادا کا آپ پرستار ہو گیا وہ مستِ ناز اور طرح دار ہو گیا
جی چاہتا ہے اُس کو خفا کر کے دیکھے یوں اپنے دل پہ آپ جفا کر کے دیکھے

غزل ہو یا نظم ، قطعہ ہو یا رباعی ہر صنف سخن میں اُن کی قادرالکلامی کے جوہر نمایاں ہیں۔ اُنہوں نے حیات وکائنات کا نہایت سنجیدگی اور گہرائی سے مشاہدہ ومطالعہ کیا تھا۔ ایک حسّاس فنکار ہونے کے سبب وہ تلخ حقیقتوں اور زندگی کی ناہم وَاریوں کو شدّت سے محسوس کرتے تھے۔ اسی لیے ان کا لہجہ بعض جگہ غمگین اور دردآگیں ہے مگر انہوں نے دردوغم اور آلامِ روزگار کا نہ تو کبھی شکوہ کیا اور نہ کبھی اُس کے سامنے سپر انداز ہوئے۔ ان کے نزدیک انسان قوّتِ عمل کا سرچشمہ ہے۔ وہ مردانِ خودآگاہ کی طرح ہمّت وجرأت سے کام لے کر گردشِ تقدیر اور غم وآلام کو آگے بڑھنے اور زندگی کو کُندن بنانے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ وہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے کسی کا احسان مند ہونے کے بجائے اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں:

منّتیں اور وہ بھی مانجھی کی ناخدا ہے ، کوئی خدا تو نہیں
ہم گردشِ تقدیر کا شکوہ نہیں کرتے مردانِ خودآگاہ کبھی ایسا نہیں کرتے
ہجومِ غم سے قلندر کبھی نہ گھبرائے جو غم نصیب نہیں ہے وہ آدمی ہی نہیں
نمک پاشی سے لذّت اور بڑھتی ہے جراحت کی دلِ راحت طلب زخموں پہ اوندھا لے نمک داں کو

مولانا عرشؔی نے عشقِ مجازی کی نسبت عشقِ حقیقی پر زیادہ زور دیا ہے۔ وہ بادۂ عرفان سے مخمور وسرشار نظر آتے ہیں۔ اُن کے کلام میں ایسے اشعار کی بھی فراوانی ہے جن میں تصوّف کے اثرات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ اُن کے نزدیک پتّا پتّا بوٹا بوٹا حُسنِ حقیقی کا مظہر ہے:

ذرّے ذرّے میں تو پاتے ہیں مگر چاہتے ہیں تجھ کو دیکھا بھی کریں
چمن کی پتّی پتّی محرمِ رازِ محبت ہے عبث آباد کر رکھا ہے عرشؔی نے بیاباں کو
پتّا پتّا ہے ترے حُسن کا مظہر لیکن حیف وہ آنکھ نظر جس میں نہیں ہوتی ہے

اگر چہ مولانا عرشؔی نے شاعری کو کبھی اپنے شایانِ شان نہیں سمجھا مگر انہوں نے اُردو شاعری کو بھی ایسے بہت سے اشعار دیے ہیں جنہیں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱۶﴾ امتیاز علی خاں عرشی نے اپنی شاعری کے ابتدائی دَور میں کیا تخلّص اختیار کیا تھا؟

﴿۱۷﴾ امتیاز علی خاں عرشی نے انگریزی نظم (A Little Plant) کا منظوم ترجمہ کس عنوان سے کیا ہے؟

﴿۱۸﴾ امتیاز علی خاں عرشی کی کسی ایک نظم کا عنوان تحریر کیجیے۔

09.10 خلاصہ

امتیاز علی خاں عرشی ایک عظیم محقّق اور متنی نقّاد ہی نہیں تھے بلکہ بہترین تحشیہ نگار، مترجم، شاعر اور مضمون نگار بھی تھے۔ انہوں نے تاج نعمانی کے قلمی نام سے چند افسانے بھی لکھے ہیں۔ اُن کا پہلا تحقیقی مضمون بہ عنوان ''صحیح مسلم کا ایک قدیم نسخہ ہندوستان میں'' ماہنامہ معارف اعظم گڑھ کے اگست ۱۹۳۰ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ تفسیرِ سفیانِ ثوری، فرماں روایانِ رام پور کے نام غالبؔ کے خطوط، نوّاب الٰہی بخش

خاں معروفؔ کی غیر مطبوعہ ایک غزل، کتاب خانہ رام پور سے متعلّق شبلی نعمانی کی تجاویز، انتخابِ غالبؔ، کتاب خانہ کے ناظموں کو ارسال کیے گئے شبلی نعمانی کے خطوط اور مرزا غالبؔ کی اصلاحات کا شمار اُن کے اعلیٰ درجہ کے تحقیقی کارناموں میں کیا جاتا ہے۔

مکاتیبِ غالبؔ، دیوانِ غالبؔ نسخۂ عرشی، انتخابِ غالبؔ، نادراتِ شاہی، محاوراتِ بیگمات، دستورالفصاحت، سلکِ گوہر، وقائع عالم شاہی وغیرہ کی ترتیب وتدوین اور تحشیہ نگاری کے سبب اُن کا شمار بلند پایہ تدوین کاروں اور تحشیہ نگاروں میں کیا جاتا ہے۔ اُنہوں نے مکاتیبِ غالبؔ اور دیوانِ غالبؔ نسخۂ عرشی کے علاوہ غالبؔ کی شخصیت اور فکر وفن سے متعلّق اس قدر تحقیقی وتجزیاتی مضامین قلم بند کیے ہیں کہ اُن کا شمار ماہرینِ غالبیات میں ہونے لگا ہے۔ امتیاز علی خاں عرشی نے مختلف شعری سخن میں بھی طبع آزمائی کی ہے مگر غزل اور نظم اُن کی محبوب صنفِ سخن ہیں۔ اُن کی غزلوں میں کلاسیکی روایت اور اپنے دَور کی حسّیت کے سبب فکر وفن کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ اُن کے یہاں غمِ جاناں بھی ہے اور غمِ دَوراں بھی، حُسن کی بہترین مصوّری بھی ہے اور اس دَور کے مسائل کی عکّاسی بھی ہے۔

09.11 فرہنگ

اصلاحات	:	اصلاح کی جمع، درستیاں، ترمیمات	رسائل	:	رسالہ کی جمع، چھوٹی کتاب
التزام	:	کسی بات کو لازم کر لینا	ژرف نگاہی	:	گہری نظر
الحاقی	:	شامل کیا ہوا۔ داخل کیا ہوا	سرگزشت	:	واردات، کیفیت، قصّہ، سوانح، تذکرہ
امتزاج	:	آمیزش۔ ملاوٹ۔ ہم آہنگی	عرق ریزی	:	بہت زیادہ محنت کرنا
انشاپرداز	:	مضمون نگار۔ نثّار۔ نثر لکھنے والا	عکّاسی کرنا	:	عکس اُتارنا، بیان کرنا
بازیافت	:	گم چیز کی دستیابی، بازیابی، پھر پانا	غیر مطبوعہ	:	جو طبع نہ ہوا ہو۔ قلمی
پاورق	:	حاشیہ کے نیچے۔ اگلے صفحہ کا پہلا لفظ	قلمی	:	قلم سے لکھا گیا، غیر مطبوعہ
تحشیہ	:	حاشیہ لکھنا، حاشیہ چڑھانا	کلاسیکی	:	کلاسیکل۔ Classical۔ اعلیٰ درجہ کا
تحشیہ نگار	:	حاشیہ لکھنے والا، حاشیہ نویس	کُندن	:	اصلی سونا۔ خالص طِلا
تلخیص	:	خلاصہ۔ خلاصہ کرنا	کوائف	:	حالات، کیفیات
تدوین	:	تالیف کرنا۔ جمع کرنا۔ مرتّب کرنا	لاحق	:	کسی چیز کے پیچھے لگا ہوا، پیوستہ، وابستہ
تعیّن کرنا	:	مقرّر کرنا، معیّن کرنا	لہوولعب	:	کھیل کود۔ سیر تماشا۔ تفریح
حاشیہ	:	کتاب یا ورق کے چاروں طرف کا خالی حصّہ۔ نوٹ۔ شرح جو کسی کتاب کے متن سے باہر لکھی جائے	مترجم	:	ترجمہ کرنے والا
			متن	:	کتاب کی اصل عبارت
			مطبوعہ	:	طبع شدہ۔ چھپا ہوا
حسّیت	:	کتاب یا ورق کے چاروں طرف کا خالی حصّہ۔ نوٹ۔ شرح جو کسی کتاب کے متن سے باہر لکھی جائے	مکتوبِ الیہ	:	وہ جس کے نام خط لکھا جائے
			منطقی	:	علم منطق کا جاننے والا
			ناظم	:	منتظم۔ انتظام کرنے والا

خلعت : وہ پوشاک جو بادشاہ یا امراء کی طرف سے بطورِ عزّت افزائی عطا کی جائے

دارالانشا : شعبۂ مضامین۔ وہ شعبہ جہاں انشایا مضامین کی کتب کا ذخیرہ ہو

دیباچہ : کتاب کا مقدّمہ۔ پیش لفظ

دیوان : شاعر کے کلام کا ایسا مجموعہ جس میں حروفِ تہجّی کے اعتبار سے کلام کا اندراج ہو

زائچہ : کُنڈلی، رمل کی شکلیں

نامانوس : ناآشنا۔ اجنبی۔ بے گانہ

نسخ : نقل۔ تحریر

نسخہ : نوشتہ۔ لکھا ہوا۔ کتاب

نشوونما : روئیدگی۔ ظہور۔ پرورش

والیان : والی کی جمع، مالکان، حکمراں

وفد : نمائندوں کی جماعت

وقتاً فوقتاً : کبھی کبھی۔ گاہ بہ گاہ

09.12 سوالات

مختصر سوالات

سوال نمبر۱ : ''نادراتِ شاہی'' کی خصوصیات قلم بند کیجیے۔

سوال نمبر۲ : امتیاز علی خاں عرشی کی زندگی کے کسی ایک اہم واقعہ پر روشنی ڈالیے۔

سوال نمبر۳ : ''دستور الفصاحت'' کے دیباچہ کی خصوصیات کیا ہیں؟ اظہارِ خیال کیجیے۔

سوال نمبر۴ : ''انتخابِ غالبؔ'' امتیاز علی خاں عرشی کی تدوین کا بہترین نمونہ ہے۔ اظہارِ خیال کیجیے۔

تفصیلی سوالات

سوال نمبر۱ : امتیاز علی خاں عرشی کے حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالیے۔

سوال نمبر۲ : امتیاز علی خاں عرشی کے تحقیقی کاموں کا جائزہ پیش کیجیے۔

سوال نمبر۳ : ''مکاتیبِ غالبؔ'' کی اہم خصوصیات کی نشان دہی کیجیے۔

سوال نمبر۴ : ''امتیاز علی خاں عرشی بحیثیت ماہرِ غالبیات'' کے عنوان سے ایک مضمون قلم بند کیجیے۔

معروضی سوالات

سوال نمبر۱ : ''پشتو میں تذکیر و تانیث'' نامی مضمون کا تعلّق کس زبان کی تذکیر و تانیث سے ہے؟

(الف) اُردو (ب) پشتو (ج) عربی (د) فارسی

سوال نمبر۲ : ''مکاتیبِ غالبؔ'' کیا ہے؟

(الف) خطوط کا مجموعہ (ب) غزلیات کا مجموعہ (ج) مضامین کا مجموعہ (د) کتب کی فہرست

سوال نمبر۳ : ''سلکِ گوہر'' کس کی تصنیف ہے؟

(الف) مرزا غالبؔ (ب) انشااللہ خاں انشاؔ (ج) سعادت یار خاں رنگین (د) نواب سیّد کلب علی خاں

سوال نمبر۴ : امتیاز علی خاں عرشی نے چند ابتدائی افسانے کس قلمی نام سے لکھے تھے؟

(الف) عرشی (ب) فرشی (ج) سراج (د) تاج

سوال نمبر۵ : لغت ''نوادرالالفاظ'' کو کس نے مرتّب کیا ہے؟

(الف) خان آرزو (ب) سعادت یار خاں رنگین (ج) مرزا غالبؔ (د) انشاءاللہ خاں انشاؔ

سوال نمبر۶ : ''فرہنگِ غالبؔ'' کا مرتّب کون ہے؟

(الف) انشاءاللہ خاں انشاؔ (ب) مرزا غالبؔ (ج) سعادت یار خاں رنگین (د) امتیاز علی خاں عرشی

سوال نمبر۷ : صنعتِ مہملہ میں لکھی ہوئی داستان، انشاءاللہ خاں انشاؔ کی کس کتاب میں شامل ہے؟

(الف) دریائے لطافت (ب) سلک گہر (ج) لطائف السعادت (د) ترکی روزنامچہ

سوال نمبر۸ : ''دیوانِ غالبؔ نسخۂ عرشی'' کے پہلے ایڈیشن کے دیباچہ کی تلخیص ماہنامہ نگار میں کس عنوان سے شائع ہوئی تھی؟

(الف) کچھ غالب سے متعلّق (ب) مرزا غالبؔ کا زائچہ (ج) غالبؔ کا معیارِ سخن (د) تدوینِ اشعارِ غالبؔ

سوال نمبر۹ : ذرّے ذرّے میں تو پاتے ہیں مگر☆ چاہتے ہیں تجھ کو دیکھا بھی کریں..... یہ شعر کس شاعر کا ہے؟

(الف) امتیاز علی خاں عرشی (ب) شبلی نعمانی (ج) مرزا غالبؔ (د) مومن خاں مومنؔ

سوال نمبر۱۰ : سیّد احمد علی خاں یکتاؔ لکھنوی کی تصنیف کا نام کیا ہے؟

(الف) وقائع عالم شاہی (ب) نادراتِ شاہی (ج) محاوراتِ بیگمات (د) دستورالفصاحت

معروضی سوالات کے جوابات

جواب نمبر۱ : (ب) پشتو

جواب نمبر۲ : (الف) خطوط کا مجموعہ

جواب نمبر۳ : (ب) انشاءاللہ خاں انشاؔ

جواب نمبر۴ : (د) تاج

جواب نمبر۵ : (الف) خان آرزو

جواب نمبر۶ : (د) امتیاز علی خاں عرشی

جواب نمبر۷ : (ب) سلک گہر

جواب نمبر۸ : (ج) غالبؔ کا معیارِ سخن

جواب نمبر۹ : (الف) امتیاز علی خاں عرشی

جواب نمبر۱۰ : (د) دستورالفصاحت

09.13 حوالہ جاتی کتب

۱۔ اُردو تحقیق اور مولانا امتیاز علی عرشی از ڈاکٹر صابر سنبھلی

۲۔ نذرِ عرشی از مالک رام

۳۔ مقالاتِ عرشی از امتیاز علی خاں عرشی

۴۔ دیوانِ غالبؔ نسخۂ عرشی از مولانا امتیاز علی خاں عرشی

۵۔ مکاتیبِ غالبؔ از مولانا امتیاز علی خاں عرشی

۶۔ تذکرہ کاملانِ رام پور از حافظ احمد علی شوق

اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات:۔

﴿۱﴾ ۸/نومبر ۱۹۰۴ء مطابق ۲۹/رمضان ۱۳۲۲ھ

﴿۲﴾ مختار علی خاں

﴿۳﴾ ۱۹۸۱ء

﴿۴﴾ صحیح مسلم کا ایک قدیم نسخہ ہندوستان میں

﴿۵﴾ نوّاب سیّد مشتاق علی خاں

﴿۶﴾ یادگارِ نالہ

﴿۷﴾ مکاتیبِ غالب

﴿۸﴾ دس

﴿۹﴾ ۱۵/برس

﴿۱۰﴾ مکاتیبِ غالبؔ اور دیوانِ غالبؔ نسخۂ عرشی کی تدوین

﴿۱۱﴾ مطالب الغالب

﴿۱۲﴾ سرگزشتہ غالبؔ

﴿۱۳﴾ سیّد احمد علی خاں یکتاؔ لکھنوی

﴿۱۴﴾ کنور پریم کشور فراقؔ

﴿۱۵﴾ دو

﴿۱۶﴾ تاجؔ

﴿۱۷﴾ شجرِ نوخیز

﴿۱۸﴾ آفتاب

اکائی 10 : مسعود حُسین خاں

ساخت :

10.01 : اغراض ومقاصد

10.02 : تمہید

10.03 : مسعود حُسین خاں بحیثیت محقق

10.04 : مسعود حُسین خاں کے تحقیقی کارنامے

10.05 : خلاصہ

10.06 : فرہنگ

10.07 : سوالات

10.08 : حوالہ جاتی کتب

10.01 اغراض ومقاصد

اس اکائی کے مطالعے سے تحقیق کی تعریف، اس کا فن، اصول، طریقۂ کار، اُردو میں تحقیق کی روایات، اہم تحقیقی کتب اور محقّقین کے بارے میں واقفیت حاصل کرنے میں مدد ملے گی۔ اس اکائی کے مطالعے سے اُردو کے معروف ادیب، محقّق ناقد، ماہرِ لسانیات، شاعر اور مرتّب، مسعود حسین خاں کے سوانحی حالات، عہد، شخصیت اور مزاج، کتابوں اور مضامین سے تعارف حاصل ہوگا۔ اس اِکائی کے مطالعے سے مسعود حسین خاں کی تحقیقی، تنقیدی، شعری، ادبی، لسانی، تدوینی خدمات کا اندازہ ہو جائے گا اور یہ بھی پتہ چلے گا کہ تحقیق سے متعلّق مسعود حسین خاں کا طریقۂ کار کیا تھا؟ یہ اکائی مسعود حسین خاں کی مجموعی ادبی اور لسانی خدمات سے تعارف کرانے میں معاون ثابت ہوگی۔

10.02 تمہید

تحقیق دریافت کا عمل ہے۔ محقّق کا سفر انسانی زندگی کے سفر سے وابستہ ہے یعنی جب سے انسان نے اس سرزمین پر قدم رکھا ہے۔ ''ضرورت ایجاد کی ماں'' کے بطور اسی وقت سے تحقیق وتلاش کا عمل بھی شروع ہو گیا ہوگا۔ تحقیق وتلاش وطلب وضرورت کے سہارے ہی انسان نے ارتقا کے منازل اور مراحل طے کیے اور اپنی زندگی کو خوش گوار، آسودہ حال، بہتر اور باعمل بنانے کی سعی کی۔ تحقیق کا دائرہ معلومات، واقعات اور حالات کی صداقت پرکھنا اور ان کی روشنی میں بہتر نتائج تک پہنچنا ہے۔ تحقیق کا عمل انسان کی روزمرہ، عام زندگی کے لے کر علم وادب و مذہب وسماج اور تاریخ کے سبھی شعبوں سے ہے۔ دُنیا کی مختلف زبانوں اور ان کے ادب نے بھی تحقیق کے ذریعے غیر معمولی ترقّی کی ہے۔ اُردو ادب میں بھی تحقیق کی وقیع روایت بھی موجود ہے اور اس کے تحت کئی اہم کارنامے انجام دیے گئے ہیں۔ تحقیق میں کیوں کہ حقائق کی بازیافت کی جاتی ہے۔ اس کے لئے سچی لگن، طلب، تلاش، جستجو، مطالعہ، مشاہدہ اور تجربہ لازمی عناصر کی حیثیت رکھتے ہیں۔

تحقیق کرنے والے کو محقّق کہتے ہیں محقق کا وسیع المطالعہ، باذوق ہونا نہایت ضروری ہے کہ تحقیق کا فن ایک ذمّے دارانہ فن ہے جس میں محقّق کا انہماک اور استغراق اور ذوقِ عمل کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔

اُردو میں تحقیق کے اوّلین نقوش شعرا کے تذکرے اور بعض تواریخ ہیں لیکن بیش تر تذکروں اور تاریخوں میں تحقیق کے اعلیٰ معیار کو ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔ اُردو کی پہلی تاریخی کتاب ''آثارالصّنادید'' ہے جس میں سرسیّد نے مغربی اُصول تحقیق سے کام لے کر سائنٹفک انداز اختیار کر کے حقائق کو دلائل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ محمد حسین آزاد کی کتاب ''آبِ حیات'' میں اگر چہ بہت سا تحقیقی، تنقیدی اور تأثراتی مواد شامل ہے لیکن اپنے مخصوص اندازِ نظر اور مخصوص اُسلوب کے سبب یہ کتاب خالص تحقیقی کتاب نہیں بن پائی ہے۔ اس میں شامل کئی واقعات ،حالات، فیصلے اور تواریخ آج غلط ثابت ہو چکے ہیں۔ تحقیقی اُصول وفن اور معیار وانداز کو سب سے پہلے علامہ شبلی نعمانی نے اختیار کیا ان کی بیش تر سوانح، تواریخ، تذکرے اور تحریریں، تحقیق کا اعلیٰ اور معیاری نمونہ ہیں۔

سرسید اور شبلی کے بعد مولوی عبدالحق نے کئی اہم تحقیقی کام انجام دیے اور کئی نئے موضوعات کو متعارف کرایا۔ برج موہن دتاتریا کیفی، حافظ محمود شیرانی، مسعود حسن رضوی ادیب، نصیرالدین ہاشمی، حبیب الرّحمٰن خاں شیروانی، حامد حسن قادری، محی الدین قادری زور، سید محمد عبداللہ، شیخ چاند وغیرہ نے اُردو تحقیق کی روایت کو معتبر بنانے اور آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اُردو کے ایسے محقّق جنھوں نے تحقیق کے جدید اصولوں اور سائنٹفک طریقۂ کار کو اختیار کر کے پوری ذمّے داری کے ساتھ تحقیقی فرائض انجام دیے ہیں ان میں قاضی عبدالوَدود، مالک رام، امتیاز علی عرشی، مسعود حُسین خاں، نجیب اشرف ندوی، رشید حسن خاں، تنویر احمد علوی، گیان چند جین، ابومحمد سحر، عبدالقوی دسنوی، نثار احمد فاروقی، گوپی چند نارنگ، حنیف نقوی، شیام لال کالرا وغیرہ کے نام خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔

10.03 مسعود حُسین خاں بحیثیت محقق

مسعود حُسین خاں کا شمار اُردو کے اہم ترین محقّقین اور ماہرینِ لسانیات میں ہوتا ہے۔ انہوں نے شاعری بھی کی ہے اور آپ بیتی بھی لکھی ہے لیکن ان کی اصل پہچان ماہرِ لسانیات اور معتبر واہم محقّق کی ہے۔ مسعود حُسین خاں ۲۸ رجنوری ۱۹۱۹ء کو قائم گنج ضلع فرخ آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی درمیانی اور ثانوی تعلیم موجودہ بنگلہ دیش، گریجویشن اینگلو عربک کالج دہلی سے اور ایم.اے، اور پی ایچ.ڈی. کی اسناد اُنہوں نے مسلم یونی ورسٹی اور ڈی.لٹ. کی ڈگری پیرس یونی ورسٹی سے حاصل کی تھیں۔ ۱۹۴۳ء میں بحیثیتِ لکچرر شعبۂ اُردو مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ انہوں نے اپنی ملازمت کا آغاز کیا۔ ۱۹۵۶ء سے ۱۹۶۰ء تک وہ کیلی فورنیا یونی ورسٹی امریکہ کے وزیٹنگ ایسوسی ایٹ پروفیسر رہے ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۸ء تک عثمانیہ یونی ورسٹی حیدرآباد کے شعبۂ اُردو کے صدر رہے اور اگست ۱۹۶۸ء میں مسلم یونی ورسٹی کے شعبۂ لسانیات سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۹۷۳ء سے ۱۹۷۸ء تک وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے شیخ الجامعہ رہے اس کے بعد ۱۹۷۸ء سے ۱۹۸۴ء تک جامعہ اُردو علی گڑھ کے شیخ الجامعہ کے عہدے پر فائز رہے۔ ۱۶ راگست ۲۰۱۰ء کو علی گڑھ میں ان کا انتقال ہو گیا۔

مسعود حسین خاں کو علمی، ادبی ماحول وراثت میں ملا تھا۔ پڑھنے لکھنے کا شوق اُنہیں بچپن سے تھا۔ فرائضِ منصبی اور دیگر ذمّے داریوں کے باوجود اُنہوں نے مطالعہ اور تصنیف وتالیف کا سلسلہ عمر بھر جاری رکھا۔ ان کا مطالعہ وسیع، نظر عمیق اور تجربہ پختہ تھا۔ اُردو زبان کے علاوہ انہیں دیگر زبانوں پر بھی عبور حاصل تھا۔ تحقیق، تنقید اور لسانیات سے انہیں خصوصی لگاؤ تھا۔

قدیم کتابوں کا مطالعہ، اُن کی تحقیق اور تنقید اُن کے محبوب ادبی مشاغل تھے۔ لسانیات سے خاص مناسبت کے سبب انہوں نے کئی مضامین اور کتب لسانیاتی تحقیق سے متعلق یادگار چھوڑی ہیں۔ انہوں نے مختلف ادبی، تحقیقی اور لسانی موضوعات پر سیکڑوں مضامین تحریر کیے جو کہ ان کے بعض مجموعوں اور کتابوں میں اور اُردو کے رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔

مسعود حُسین خاں کثیر التّصانیف مصنّف تھے۔ ان کی تصانیف و تالیف کی فہرست درج ذیل ہے:

﴿۱﴾	مقدّمۂ تاریخِ زبانِ اُردو پہلی اشاعت		۱۹۴۸ء
﴿۲﴾	اُردو زبان و ادب		۱۹۵۲ء
﴿۳﴾	روپ بنگال اور دوسرے گیت		۱۹۵۴ء
﴿۴﴾	سریلے بول	(ہندی ترجمہ)	۱۹۵۴ء
﴿۵﴾	زبان ادب		۱۹۵۴ء
﴿۶﴾	A Phonetic & Philosphical Study of Word in Urdu		۱۹۵۴ء (ڈی لٹ کا مقالہ)
﴿۷﴾	دونیم	شعری مجموعہ	۱۹۵۶ء
﴿۸﴾	اُردو لفظ کا صوتیاتی و تجزیاتی مطالعہ	(انگریزی)	۱۹۵۶ء
﴿۹﴾	پرت نامہ	(از فیروز بیدری)	۱۹۶۵ء
﴿۱۰﴾	بکٹ کہانی	(از افضل)	۱۹۶۵ء
﴿۱۱﴾	ابراہیم نامہ	(از عبدل)	۱۹۶۶ء
﴿۱۲﴾	قصّہ مہر و دلبر	(عیسوی خاں بہادر)	۱۹۶۶ء
﴿۱۳﴾	شعر و زبان		۱۹۶۶ء
﴿۱۴﴾	دکنی اُردو لغت		۱۹۶۸ء
﴿۱۵﴾	اُردو کا المیہ	(خلیل احمد بیگ)	۱۹۷۳ء
﴿۱۶﴾	اُردو زبان کی تاریخ کا خاکہ		۱۹۸۱ء
﴿۱۷﴾	رقعاتِ رشید صدیقی		۱۹۸۱ء
﴿۱۸﴾	اقبال کی نظری و عملی شعریات		۱۹۸۳ء
﴿۱۹﴾	اُردو زبان، تاریخ، تشکیل، تقدیر	(خطبہ)	۱۹۸۸ء
﴿۲۰﴾	ورود مسعود	(خود نوشت سوانح)	۱۹۸۹ء
﴿۲۱﴾	مقالات مسعود حسین		۱۹۸۹ء
﴿۲۲﴾	محمد علی قطب شاہ		۱۹۸۹ء

﴿۲۳﴾ نظیر اکبرآبادی	(نظموں کا انتخاب)	۱۹۸۹ء
﴿۲۴﴾ یوسف حسین خاں	(مونوگراف)	۱۹۹۰ء
﴿۲۵﴾ تاریخ جامعہ اُردو	(پیش ولفظ وترتیب)	۱۹۹۰ء
﴿۲۶﴾ انتخاب کلام اقبال		۱۹۹۱ء
﴿۲۷﴾ انتخاب کلام غالب	(مع مقدّمہ)	۱۹۹۱ء
﴿۲۸﴾ اُردو غزل کے نشتر	(خطبہ)	۱۹۹۵ء
﴿۲۹﴾ مضامین مسعود		۱۹۹۷ء
﴿۳۰﴾ عاشورنامہ	(تدوین)	

ان کتابوں کے علاوہ مسعود حُسین خاں نے ۱۵۰/ سے زیادہ مضامین، ۱۵/ پیش لفظ اور مقدمات تحریر کیے جو کہ مختلف معیاری رسائل اور جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ انہوں نے لسانیاتی تحقیق کے ساتھ ساتھ ادبی تحقیق اور تدوین وترتیب سے متعلق کام بھی کیے۔ ایک شعری مجموعہ اور ایک خودنوشت سوانح کے علاوہ ان کے سبھی کام تحقیقی نوعیت کے حامل ہیں۔ تدوین وترتیب سے متعلّق کتب میں انہوں نے جو پیش لفظ یا مقدمے تحریر کیے ہیں وہ بھی تحقیقی انداز کے ہیں۔ اُنہوں نے تدوین کے تحت چار مثنویاں اور ایک داستان مرتب کی۔

10.04 مسعود حُسین خاں کے تحقیقی کارنامے

مسعود حُسین خاں کا سب سے پہلا اور اہم تحقیقی کارنامہ ان کا تحقیقی مقالہ ''مقدّمۂ تاریخِ زبانِ اُردو'' ہے۔ جو کہ ۱۹۴۸ء میں پہلی بار کتابی صورت میں شائع ہوا اور اب تک اس کے دَس ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اُردو زبان کے آغاز اور لسانیاتی تحقیق سے متعلّق اہم کتاب ہونے کے سبب یہ تحقیقی مقالہ برسوں سے طلبا اور ریسرچ اسکالرس کی لئے رَہ نمائی اور استفادے کا کام بھی انجام دے رہا ہے اور مختلف جامعات کے نصاب میں حوالہ کی کتاب کے بطورِ شامل نصاب ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے بار بار ترمیم واضافے کر کے موضوع کے لحاظ سے اسے **Update** کر دیا ہے کیوں کہ مسعود حُسین خاں محض محقّق ہی نہیں ماہرِ لسانیات بھی تھے اور ان کی اعلیٰ تعلیم ہندوستان ہی کی نہیں بیرون ہند کی جامعات میں بھی ہوئی تھی اور انگریزی ادب کے عمیق مطالعے کے سبب وہ جدید اور سائنٹفک طریقۂ کار سے بخوبی واقف تھے۔ اس لئے انہوں نے روایتی اور جدید دونوں قسم کے طریقِ تحقیق کے صالح عناصر اور مناسب طریقِ تحقیق سے کام لے کر اس طرح قدیم اُردو مسودات و مخطوطات و کتب کا تجزیہ کیا ہے کہ ادبی ولسانی دونوں اعتبار سے تحقیق وتدوین وترتیب وتجزیہ کا حق ادا ہو گیا ہے۔ مسعود حُسین خاں کی تحقیقات محض ادبی تحقیق نہیں لسانی تحقیق بھی ہے۔ ماہرِ لسان ہونے کے سبب اُنہوں نے فن پاروں یا ادب پاروں کی لسانیاتی تحقیق میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے، ان کی تحقیق کا اعلیٰ نمونہ ان کی پہلی تحقیقی، لسانی کتاب ''مقدّمۂ تاریخِ زبانِ اُردو'' ہے جو اُردو زبان کے آغاز وارتقاء اور تشکیل وتعمیر کے سلسلے میں ایک مستند حوالے کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔

بقول مسعود حسین خاں:

''مجھے علمی شہرت زیادہ تر اسی تصنیف سے ملی۔اب یہ حوالے کی مستند کتاب بن چکی ہے۔''

بلاشبہ یہ کتاب ایک تاریخی،لسانیاتی کتاب ہے جس میں تاریخ سے زیادہ لسانیاتی تحقیق پر معتبر مواد پیش کیا گیا ہے اور زبان کی تشکیل نیز آغاز وارتقا پر دلائل کے ساتھ سیر حاصل تحقیقی مواد شامل ہے۔بقول ڈاکٹر گیان چند جین:

''انہوں نے مقدّمہ کو تاریخ لسانیات کے تمام تر اُصول وقواعد پر پیش نہیں کیا بلکہ لسانیاتی مطالعے میں ادبی تحقیق کے اُصولوں کو زیادہ استعمال کیا۔اسی طرح مخصوص عہد کے ادب کو پرکھنے میں لسانیاتی نقطۂ نظر سے کام لیا ہے۔''

مسعود حُسین خاں نے نہ صرف دکنی اُردو کی قدیم کتب اور مخطوطات ولغات پر کام کیا بلکہ ''دکنی اُردو'' کو ''قدیم اُردو'' سے موسوم کر کے یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ دکنی کے مقابلے میں اُردو کے لئے ہندی، ہندوی اور گجراتی زیادہ قدیم نام ہیں۔اس سلسلے میں ان کی تحقیق یہ ہے کہ:

''عہدِ بہمنی کے کسی مصنف نے اپنی زبان کو دکنی کے نام سے نہیں پکارا۔اس کے ہندی، ہندوی اور گجراتی نام زیادہ قدیم ہیں۔قطب شاہی اور عادل شاہی حکومتوں کے قیام کے بعد اس کا نام دکنی پڑا.....''

''مقدّمۂ تاریخِ زبانِ اُردو'' ایک اہم،مفصّل،دستاویزی تحقیقی کتاب ہے جس میں علمی،لسانی اور تحقیقی انداز میں اُردو زبان کے تاریخی نقوش مرتب کیے گئے اور اُردو زبان کے آغاز وارتقا کے سلسلے میں بہت سے لسانی مفروضات کو باطل ثابت کر کے حقائق اور دلائل کے ساتھ قدیم لسانی نظریات کا تجزیہ کر کے حقیقی صورت حال کو علمی اور لسانی انداز میں پیش کیا ہے۔

مذکورہ بالا کتاب میں پیش کردہ ان کے نظریے کے مطابق اُردو زبان ۱۱۹۳ء کے بعد دہلی اور نواحِ دہلی میں پیدا ہوئی۔قدیم اُردو کی شکل میں دوآبہ کی کھڑی بولی اور جمنا پار کی ہریانوی کے اثرات نمایاں ہیں۔مسعود حُسین خاں کے نظریے کے مطابق کھڑی بولی ہی اُردو زبان کے آغاز کا مؤثر ذریعہ ہے۔

﴿۱﴾ اُردو کا المیہ: یہ مسعود حُسین خاں کے تحقیقی اور لسانیاتی مضامین کا مجموعہ ہے جسے مرزا خلیل احمد بیگ نے مرتّب کیا ہے۔اُردو زبان کی تشکیل،تعمیر،خصوصیات سے متعلق ان کے اہم مضامین میں مسعود حُسین خاں نے اُردو زبان سے متعلّق پھیلائی گئی غلط فہمیوں کو دُور کرنے کی کوشش کی ہے۔ان کی تحقیق کے مطابق:

''اُردو،ہندی کا دوسرا روپ نہیں۔اُردو اور ہندی دو الگ زبانیں ہیں۔''

''صوتیات'' اور ''اُسلوبیات'' بھی مسعود صاحب کے پسندیدہ موضوعات رہے ہیں۔انہوں نے صوتیات سے متعلق اپنے خیالات کو ''جے.آر فرتھ'' کے نظریات سے ہم آہنگ کرنے کی سعی کی ہے۔مسعود حُسین خاں نے لفظ کی تعریف،صوت،رکن کی صوتیات،ساخت کا مطالعہ اور لفظوں کی معکوسیت سے بحث کرتے ہوئے اپنے لسانی دلائل کا اظہار کیا ہے۔

متنی ترتیب اور تدوین کے کام بھی تحقیقی کاموں کے زُمرے میں آتے ہیں۔ مسعود حُسین خاں بنیادی طور پر محقّق تھے۔ انہوں نے اپنی محقّقانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر کئی اہم تدوینی کام انجام دیے ہیں۔ شمالی ہند کے ساتھ ساتھ دکنی ادب کی تحقیق اور تدوین سے متعلّق ان کے تحقیقی کاموں کو بھی وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ان کے مرتب کردہ چار متون ''بکٹ کہانی، پرت نامہ، ابراہیم نامہ اور عاشور نامہ'' ہیں مسعود صاحب نے اُردو میں سائنٹفک انداز میں تدوین متن کی روایات کا آغاز کیا۔

﴿۲﴾ بکٹ کہانی: یہ ''مسعود حُسین خاں کا اہم تحقیقی، تدوینی کارنامہ ہے جس میں انہوں نے تحقیقی حواشی بھی درج کیے ہیں۔ انہوں نے تدوین متن کے سلسلے میں دَس قلمی نسخوں اور دو مطبوعہ نسخوں کے مطالعے اور موازنے کے بعد اس متن کو آخری شکل دی ہے اور متن سے متعلق اختلافات کو حواشی میں نقل کیا اور اس پر ایک مبسوط مقدّمہ تحریر کر کے شائع کیا۔ ان کے اس مقدمے ''بکٹ کہانی'' میں شامل لسانی خصوصیات بھی زیرِ بحث آئی ہیں۔

مسعود حُسین خاں کو حیدر آباد کے قیام کے دَوران دکنی ادب کی قدیم کتب، مخطوطات اور لسانیات کے مطالعے کا موقع ملا۔ حیدر آباد کی علمی فضا اور یہاں رہ کر انجام دیے جانے والے ادبی تحقیقی کاموں کے سلسلے میں اُنہوں نے لکھا ہے:

> ''علمی اعتبار سے عثمانیہ یونی ورسٹی میں میرا چھ سالہ قیام (۱۹۶۲ء تا ۱۹۶۸ء) خود میرے لئے بار آور رہا۔ اسی دوران میں نے ''قدیم اُردو'' کے نام سے اُردو قدیم متون کی سائنسی انداز میں مرتب کر کے چار ضخیم جلدوں میں شائع کیا۔ جن میں پرت نامہ، بکٹ کہانی اور ابراہیم نامہ کے متون میرے مرتب کردہ ہیں۔''
>
> (ورود مسعود: ص...۲۰۰)

قدیم دکنی ادب کی جسے مسعود حُسین خاں نے ''قدیم اُردو'' کا نام دیا ہے تحقیق، تدوین، ترتیب و تنقید کے سلسلے میں مسعود حُسین خاں نے جو اہم اور وقیع تحقیقی کام انجام دیے ہیں ان میں ''پرت نامہ، ابراہیم نامہ، دکنی اُردو کی لغت'' کے علاوہ ''محمد قلی قطب شاہ'' کے نام بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔

﴿۳﴾ پرت نامہ: دکنی اُردو یا قدیم اُردو سے متعلّق مسعود حُسین خاں کی پہلی تحقیقی کتاب مثنوی ''پرت نامہ'' ہے جس کا خالق قطب الدین قادری فیروز بیدری ہے۔ یہ مثنوی پہلی بار عثمانیہ یونی ورسٹی کے مجلّہ ''قدیم اُردو'' میں شائع ہوئی تھی۔ اس مثنوی پر ڈاکٹر محی الدّین قادری زور اور دوسرے محقّقین نے بھی کام کیا تھا لیکن مسعود حُسین خاں نے اسے از سرِ نَو مرتب کر کے اور بعض اشعار کا اضافہ کر کے، حواشی اور تعارف تحریر کر کے شائع کیا جس کے سبب یہ مثنوی ادب سے لگاؤ رکھنے والے عام لوگوں تک پہنچ گئی۔

ڈاکٹر مسعود حُسین خاں نے اپنے طریقۂ تحقیق سے متعلّق لکھا ہے:

> ''اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ ''قدیم اُردو'' کے تلفظات کا صحت کے ساتھ تعیّن کیا جا سکے۔ اس غرض سے اعراب اور دیگر تشریحات سے مدد لی گئی ہے۔ مشکل مقامات سے سرسری طور پر گزرنے اور محض نقل نویسی کا جو عام انداز اب تک رہا ہے، اس سے گریز کیا گیا ہے۔ تلاش و جستجو کے باوجود جو مقامات حل

نہیں ہو سکے ان پر سوالیہ نشان؟ قائم کر دیا گیا ہے .....سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ ایک شعر (شعر نمبر ۴۴) جو انجمن کے نسخے میں غائب تھا ادارے کے نسخے میں مل گیا۔اس طرح ''پرت نامہ'' کا (۱۲۱) ابیات پر مشتمل مکمل متن تیار ہو گیا۔''

(قدیم اُردو جلد اول سے ماخوذ)

﴿۴﴾ ابراہیم نامہ: یہ عبدل دہلوی ثم بیجاپوری کی مثنوی ہے جو کہ بیجاپور کے فرماں روا ابراہیم عادل شاہ ثانی کی تعریف میں لکھی گئی تھی اور جسے عادل شاہی دَور کا پہلا ادبی نمونہ سمجھا جاتا ہے۔ڈاکٹر مسعود حُسین خاں نے اسے پہلی بار مجلّہ قدیم اُردو جلد سوم ۱۹۶۹ء میں شائع کیا تھا۔ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے اس مثنوی کے دو نسخوں کو سامنے رکھ کر اسے نہ صرف مرتب کیا بلکہ اس کا تعارف کرایا اور اس کے مصنّف کے حالات زندگی سے متعلق تحقیقی مواد بھی پیش کیا ہے۔اس مثنوی سے متعلق سیدہ جعفر لکھتی ہیں:

'' وہ (مسعود حُسین صاحب) تدوینِ متن کے آداب سے آشنا اور اصول تحقیق کے رمز شناس ہیں.....ان کے علمِ لسانیات پر عبور نے متروک الفاظ کھولنے اور ان کے ماخذوں کا سراغ لگانے اور مطالب کی تصحیح اور تشریح میں مدد کی ہے۔''

(نذر مسعود: ص....۲۱۷)

مسعود صاحب نے اپنے مقدمے میں دکن کی دوسری مثنویوں سے بھی ''ابراہیم نامہ'' کا موازنہ کر کے ''ابراہیم نامہ'' کو زیادہ حقیقت پسند ثابت کیا ہے اور اس مثنوی کے مشمولات کا تحقیقی تجزیہ کر کے حقائق کی تصدیق مختلف ذرائع سے کی ہے اور اس مثنوی کی ادبی اور شعری حیثیت پر اظہار خیال کیا ہے۔اس مثنوی کی شعری خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے:

''ابراہیم نامہ'' میں جو صناعت ملتی ہے اس کا جواب قدیم اُردو ادب میں کہیں اور نہیں ملتا۔عبدل اپنے اُسلوب کا خود بانی ہے۔عبدل کو ایک ایسی زبان میں لکھنا پڑا جو ابھی تک ادبی اسالیب سے نا آشنا تھی...''ابراہیم نامہ' بالذات ایک اہم شعری کارنامہ ہے جو اپج بھی ہے اور بیانیہ اور تمثیلی شاعری کے اُسلوب کا ماخذ بھی۔''

مثنوی ''ابراہیم نامہ'' مسعود حُسین خاں کے لسانیاتی شعور، تحقیق عرق ریزی، جدید تدوینی طریقِ کار کی اعلیٰ مثال ہے۔اس ضمن میں ڈاکٹر گیان چند جین کی یہ رائے مبنی بر حقیقت ہے:

''ابراہیم نامہ ہر اعتبار سے ایک مکمّل تدوین ہے۔مدون کے کسی تحقیقی بیان سے اخلاف کی گنجائش نہیں۔''

﴿۵﴾ محمد قلی قطب شاہ: (۱۱۲) صفحات پر مشتمل مسعود حُسین خاں کا تحریر کردہ یہ مونوگراف پہلی بار ساہتیہ اکادمی سے ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا تھا۔چار ابواب اور سات ذیلی عنوانات پر مشتمل اس مونوگراف میں عہدِ محمد قلی کا تاریخی، سیاسی پس منظر، محمد قلی کی شاعری، ان کی زبان، اصناف اور خصوصیات کو عالمانہ اور محقّقانہ انداز میں تحریر کیا ہے اور کتاب کے آخر میں محمد قلی قطب شاہ کے کلام کا انتخاب بھی شامل ہے۔

بعض محقّقین نے محمد قلی قطب شاہ اور اس کی محبوبہ بھاگ متی کی عشقیہ داستان کو خیالی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے لیکن مسعود حسین خاں نے تحقیقی شواہد سے اسے حقیقی ثابت کرتے ہوئے لکھا ہے:

''میں بذات خود روایت کے تواتر اور کلیات کی داخلی شہادتوں کی بنا پر سمجھتا ہوں کہ اس کہانی میں کچھ نہ کچھ صداقت ضرور ہے۔''

﴿۶﴾ دکنی اُردو کی لغت: یہ بھی مسعود حُسین خاں کا اہم تحقیقی اور لسانی کارنامہ ہے جسے انہوں نے اپنے رفیقِ کار ڈاکٹر غلام عمر خاں کے اشتراک سے مکمّل کیا تھا۔ ماہرین کا خیال ہے کہ مسعود حُسین خاں کے ماہر لسانیات اور صوتیات ہونے اور غلام عمر خاں کے ماہرِ دکنیات ہونے کے سبب یہ لغت بے حد جامع، اہم اور سائنٹفک ہوگئی ہے۔

﴿۷﴾ عاشور نامہ: ۳۵۴۴/اشعار پر مشتمل اس مثنوی کو روشن علی نے ۱۶۸۸ء میں لکھا تھا۔ اس کا شمار اُردو کے قدیم ترین ادب پاروں میں ہوتا ہے۔ مسعود حُسین خاں نے اسے ۱۹۷۲ء میں مرتب کر کے ''قدیم اُردو'' سلسلہ نمبر ۴ میں علی گڑھ سے شائع کیا۔ ۳۱/صفحات پر مشتمل اپنے مقدّمہ میں مسعود حُسین خاں نے اس مثنوی کے مصنّف کا تعارف، مثنوی کی وجہ تسمیہ، اس کا سن تصنیف وغیرہ کا تحقیقی جائزہ تفصیل سے پیش کیا ہے۔

مسعود صاحب نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ روشن علی سنی العقیدہ تھا۔ وہ باقاعدہ شاعر تھا نہ عالم بلکہ ایک ملاّ ے مکتب تھا جس نے عوام کے اصرار پر ایک مذہبی فریضے کے طور پر اسے قلم بند کیا تھا۔ ''عاشور نامہ'' کو متعارف کرانے کا سہرا مسعود حُسین خاں کے سر پر بندھتا ہے۔

﴿۸﴾ قصہ مہر وافروز و دلبر: یہ شمالی ہند کی قدیم نثری داستان ہے جسے مرتّب کر کے ۱۹۶۶ء میں مسعود حُسین خاں نے پہلی بار کتابی صورت میں شائع کر کے اہلِ ادب سے متعارف کرایا۔ حسبِ معمول مسعود حُسین خاں نے اس داستان کا عمیق مطالعہ کیا اور سائنٹفک جدید تحقیقی اصولوں کے تحت اس متن کو مرتّب کر کے ایک مبسوط تحقیقی مقدّمہ قلم بند کیا جس میں تشریحی حواشی شامل ہیں اور متن کے لسانی خصائص پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اگر چہ اس داستان کے مصنّف کا صحیح نام صحیح طور پر واضح اور ثابت نہیں ہوسکا ہے کیوں کہ وہ داستان کے مخطوطے کی سرِ ورق پر کسی شخص کے ذریعہ لکھا ہوا ملتا ہے۔ بقول مسعود حُسین خاں:

''سرِ ورق پر مصنف کا نام ''عیسوی خان بہادر'' بہ ظاہر کاتب قصّہ کا لکھا ہوا نہیں معلوم ہوتا۔ مزید یہ کہ بے ترتیب طور پر ایک طرف حاشیہ پر لکھا ہوا ہے، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بعد کو کسی دوسرے شخص نے تحریر کیا ہے۔''

داستان کے متن میں شامل بعض تاریخی شواہد کی مدد سے مسعود صاحب نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ اس داستان کے مصنف کا وطن دہلی تھا۔ اس ضمن میں انہوں نے لکھا ہے:

''چوں کہ قصّہ حاتم طائی کا عکس قصّہ مہر افروز میں ملتا ہے اس لئے قرین قیاس یہی ہے کہ محمد شاہ کے آخری دَور یا احمد شاہ ابدالی کے عہد کے عیسوی خاں نے جن کا لال قلعہ دہلی سے گہرا تعلّق رہا ہے فارسی داستانوں سے متاثر ہوکر یہ اوّلین کوشش اُردو زبان میں کی ہوگی۔''

اس داستان کے سنہ تصنیف سے متعلّق مسعود حُسین خاں کا خیال ہے کہ:

''.....عیسوی خاں نے یہ قصّہ کسی وقت ۱۷۳۲ء تا ۱۷۵۹ء کے درمیان لکھا ہوگا۔''

اس داستان کے اُسلوب اور اس کی اہمیت پر اظہار رائے کرتے ہوئے مسعود صاحب نے لکھا ہے:

''قصہ ادبی اُسلوب اور زبان کے بارے میں مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ قدما کی زبان کا پہلا ہیولیٰ یا زبان دہلی کا پہلا نقش ہے جس کے ایک طرف ہندی شاعری کی چھاپ ہے، دوسری طرف فارسی داستانوں کے جملوں کا دروبست پایا جاتا ہے۔ دہلی کے محاورے میں دراصل اُردو میں قصّہ کہنے کی یہ پہلی کوشش ہے۔ مصنّف اس تصنیف میں اُردو کے بنیادی اُسلوب کی داغ بیل ڈال رہا ہے جس پر بعد کو میر امّن اور اُن کے رفقا نے جدید اُردو نثر کی عمارت کھڑی کی ہے۔''

لسانی اعتبار سے بھی مسعود صاحب نے اس داستان کا تحقیقی وتنقیدی تجزیہ کیا ہے۔ ان کے تدوینی طریقہ کار نیز لسانی تجزیے کا ذکر کرتے ہوئے معروف محقّق رشید حسن خاں اعتراف کرتے ہیں:

''مسعود حسین خاں کا مرتّب کیا ہوا ''قصّہ مہر افروز ودلبر''بعض اعتبارات سے قابل ذکر کام ہے۔ اس کا یہ پہلو توجہ طلب ہے کہ تدوین میں متن کی نسبت سے لسانی بحث کے انداز واحوال کی جہت کیا ہوسکتی ہے۔ ادبی تحقیق مسعود صاحب کا میدان نہیں، وہ لسانی تحقیق کے مردِ میدان ہیں اور اس متن میں (اور ان کے مرتّب کیے ہوئے بعض دوسرے متنوں میں، جس میں '' بکٹ کہانی'' خاص طور پر قابلِ ذکر ہے) لسانیات سے واقفیت ان کا ساتھ دیتی ہے۔''

(ماخوذ: تدوین، تحقیق، روایت ص۱۸۴)

یہ داستان پہلی بار ۱۹۶۶ء میں حیدر آباد سے شائع ہوئی تھی۔ اس کا پہلا ایڈیشن جلد ہی بک کر ختم ہوگیا تو دوسرا ایڈیشن انجمن ترقّی اُردو ہند نے ۱۹۸۸ء میں شائع کیا۔ اس داستان سے عوام وخواص کی دل چسپی کے پیشِ نظر، دوسرے ایڈیشن کی دیباچے میں پروفیسر مسعود حُسین خاں صاحب نے لکھا تھا:

''قصہ مہر افروز ودلبر'' کا متن میں پہلی بار ۱۹۶۶ء میں حیدر آباد سے شائع کیا تھا۔ اس وقت یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس قدر جلد ''یارانِ نکتہ داں'' کی توجہ کا مرکز بن جائے گا۔ ڈاکٹر پرکاش مونس.....ڈاکٹر گیان چند جین.....اور ڈاکٹر جمیل جالبی.....نے شمالی ہند کی قدیم ترین نثری ادب کے شاہکار کی حیثیت سے اس کا خیر مقدم کیا۔ مجموعی طور پر اسے ایک اہم لسانی دستاویز اور ایک نادر اَدبی کارنامہ تسلیم کیا گیا لیکن اس کے اصل مصنّف کے تعیّن کا مسئلہ تحقیق طلب رہا۔''

بہر حال اس داستان کے مصنّف کے نام سے قطعِ نظر یہ امر مسلّم ہے کہ یہ داستان شمالی ہند کی پہلی اہم داستان ہے اور تہذیبی ولسانی اعتبار سے بھی اس کی اہمیت تسلیم کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر مسعود حُسین خاں بلا شبہ ایک بلند پایہ، معتبر ماہرِ لسانیات تو ہیں ہی ان کے تحقیقی کارنامے انہیں معیاری اور معتبر محقّق بھی ثابت کرتے ہیں۔

اُردو کی لسانیاتی تحقیق میں ان کا مقام بہت بلند ہے۔اُردو آغاز سے متعلّق ان کے لسانیاتی نظریے کو آج بھی استحسان اور اعتبار کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ان کی تحقیقی،لسانیاتی کتاب ''مقدّمۂ تاریخِ زبانِ اُردو'' اُردو زبان کی پیدائش اور اس سے متعلق لسانی نظریات پر ایک اہم اور مستند دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ اس کتاب اور اس کے مصنف کے بارے میں لکھتے ہیں:

''.....اُردو کے آغاز وارتقا کے بارے میں خالص لسانیاتی نقطۂ نظر سے وسیع تناظر میں غور وخوض کرنے والوں میں پروفیسر مسعود حُسین خاں کا نام سرِ فہرست ہے۔مسعود صاحب کے پیش کردہ نظریے کو (جسے صحیح معنوں میں نظریہ کہا جاسکتا ہے) آج اُردو کا سب سے قابل قبول نظریہ سمجھا جاتا ہے۔بعد ازاں شوکت سبزواری، سہیل بخاری اور گیان چند جین نے بھی اس مسئلے پر غور وفکر سے کام لیا اور اپنے اپنے خیالات پیش کیے.....اُردو کے آغاز وارتقا کا سب سے قابلِ قبول نظریہ وہ ہے جسے ہمارے عہد کے نامور ماہرِ لسانیات اور ممتاز محقّق پروفیسر مسعود حسین خاں نے پیش کیا ہے۔''

اُردو زبان کے آغاز سے متعلق ڈاکٹر مسعود حُسین خاں کے لسانی نظریے کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے مرزا خلیل بیگ نے اپنے مضمون: ''اُردو کے آغاز کا سب سے قابلِ قبول نظریہ'' میں لکھا ہے:

''کسی زبان کی پیدائش یا اس کے آغاز کے مسئلے پر غور کرنے کے لئے تین باتوں پر غور کرنا ضروری ہوتا ہے کہ وہ زبان کب پیدا ہوئی، کہاں پیدا ہوئی اور کیسے پیدا ہوئی؟ مسعود حُسین خاں ان ماہر لسانیات میں ہیں جنھوں نے ان تینوں باتوں کو نہایت عالمانہ اور محقّقانہ انداز سے غور کیا ہے اور لسانیاتی حقائق کی روشنی میں بے شمار دلیلوں اور مثالوں سے یہ بات ثابت کردی ہے کہ اُردو دہلی اور نواحِ دہلی میں ۱۱۹۳ء میں مسلمانوں کی فتح دہلی کے بعد کھڑی بولی کے بطن سے پیدا ہوئی جس پر ابتداً ہریانی کے بہت اثرات پڑے لیکن جیسے جیسے اُردو ترقی کرتی گئی ہریانوی کے اثرات زائل ہوتے گئے۔''

مسعود حسین خاں کی مسلسل اور اہم تحقیقی ولسانیاتی خدمات کے پیشِ نظر ان کا شمار اُردو کے اہم محقّقین اور ماہرِ لسانیات میں ہوتا ہے۔

10.05 : خلاصہ

پروفیسر مسعود حُسین خاں کا شمار اُردو کے اہم اور معتبر محقّقین اور ماہرینِ لسانیات میں ہوتا ہے۔وہ محض ماہرِ لسان، محقّق، مدوّن، مرتّب ہی نہ تھے شاعر و ناقد بھی تھے اور اُسلوبیاتی تنقید کے نبض شناس اور غوّاص بھی تھے۔ان کی پہلو دار شخصیت کا سب سے اہم پہلو محقّق اور لسانی ماہر کا تھا کہ ان کی بیش تر تصانیف، تالیفات اور مضامین میں ان کی اسی نوع کی صلاحیت کا اظہار ملتا ہے۔انہوں محض لسانیاتی تحقیق اور ادبی تحقیق کو ہی جلا نہیں بخشی بلکہ اسلوبیاتی اور متنی تنقید اور تدوین میں بھی غیر معمولی کارنامے انجام دیے اور ان سے متعلق کئی کتابیں، مضامین اور مقالات یادگار چھوڑے ہیں۔ان کی کتابوں میں ''مقدّمۂ تاریخِ زبانِ اُردو، دکنی اُردو کی لغت، اقبال کی نظری وعملی شعریات، اُردو کا

المیہ، رُقعاتِ رشید احمد صدیقی، شعری مجموعہ: دونیم، آپ بیتی، ورود مسعود، دکنی ادب'' اور شمالی ہند کی ادبی تالیفات ہیں ''پرت نامہ، ابراھیم نامہ، عاشور نامہ، محمد قلی قطب شاہ، بکٹ کہانی، قصّہ مہر افروز و دلبر'' سمیت (۳۰) کتابیں تصنیف و تالیف کیں اور مختلف تحقیقی موضوعات پر (۱۵۰) سے زیادہ مضامین و مقالات تحریر کیے۔ مسعود حُسین خاں کی تحقیق سائنٹفک اور معتبر تحقیق سمجھی جاتی ہے۔ انہوں نے عصری لسانی خصوصیات، متن کی چھان بین کے تحت اپنے تحقیقی اور لسانی نتائج کا اظہار کیا ہے اس لئے ان کی تحقیق میں قیاس اور خیال کے بجائے حقیقت کا رنگ غالب نظر آتا ہے اور اسی وصف کے سبب ان کا شمار اُردو کے اہم اور معتبر محقّقین اور ماہرِ لسانیات میں کیا جاتا ہے۔

10.06 فرہنگ

استحسان	:	تعریف، قدر	عکس	:	جھلک، پرچھائیں
استغراق	:	محویت، کھو جانا، غرق ہو جانا	عمیق	:	گہرا
اسناد	:	سند کی جمع، ڈگری	کلیدی	:	کنجی، بنیادی
اشتراک	:	تعاون، مل کر کام کرنا	قدماء	:	پرانے لوگ
المیہ	:	غم انگیز	قیاس	:	خیال، اندازہ
انہماک	:	پوری توجہ سے کسی کام میں مصروف ہونا	لسان	:	بولی، زبان، لغت
بانی	:	بنیاد ڈالنے والا	لغات	:	لغت کی جمع
بطن	:	پیٹ	ماخذ	:	اخذ کرنے کی جگہ
بازیافت	:	واپسی، حصول	مبسوط	:	بسیط، تفصیلی
بعدازاں	:	اس/ان کے بعد	مخطوطات	:	مخطوطے کی جمع Manuscript
تواتر	:	لگاتار، مسلسل	متروک	:	ترک کیا ہوا
جامع	:	مکمل، ٹھوس	محقّق	:	تحقیق کرنے والا، Research-Scholar
جہت	:	جانب، سبب، واسطے	مستند	:	تسلیم شدہ، مانا ہو، سند دیا ہوا
خصائص	:	خصوصیت کی جمع	مسودات	:	مسودے کی جمع، Script
دروبست	:	سب، تمام	مشمولات	:	شامل اجزا، شامل چیزیں
دریافت	:	تحقیق، حاصل	معکوس	:	الٹا، اوندھا
دستاویز	:	تحریری سند	مفروضات	:	مفروضہ کی جمع یعنی فرض کیا ہوا
رفقا	:	دوست، ساتھی	موثر	:	اثر والا، پُر اثر

رمز شناس	:	راز جاننے والا	نادر	:	عجیب، قیمتی
زمرہ	:	جماعت، گروہ	نبض شناس	:	نبض جاننے والا، حالات کو سمجھنے والا
سرورق	:	کتاب کا پہلا باہری صفحہ	نواح	:	اطراف، آس پاس
شعبہ	:	شاخ، محکمہ، گروہ، خاندان	وسیع	:	گہرا، پھیلا ہوا
صناعت	:	بناوٹ	وقعت	:	قدر
ضخیم	:	موٹا، زیادی حجم والا	وقیع	:	قابل قدر، اہم

10.07 سوالات

مختصر سوالات

سوال نمبر۱ تحقیق کسے کہتے ہیں؟

سوال نمبر۲ اُردو ادب میں مسعود حُسین خاں کی اصل پہچان کیا ہے؟

سوال نمبر۳ مسعود حُسین خاں کی تدوین اور ترتیب کردہ کتابوں کے نام؟

سوال نمبر۴ مسعود حُسین خاں کا پہلا اور اہم تنقیدی کارنامہ یا کتاب کون سی تھی؟

تفصیلی سوالات

سوال نمبر۱ مسعود حُسین خاں کے سوانحی حالات پر روشنی ڈالیے۔

سوال نمبر۲ تحقیق کا فن اور اُردو کے اہم محققین کی خدمات پر نوٹ لکھیے۔

سوال نمبر۳ مسعود حُسین خاں کی کتاب ''مقدّمۂ تاریخِ زبانِ اُردو'' کا تعارف تحریر کیجیے۔

سوال نمبر۴ ترتیب وتدوین سے متعلق مسعود حُسین خاں کی خدمات پر اظہار خیال کیجیے۔

سوال نمبر۵ مسعود حُسین خاں کے طریقہ تحقیق اور لسانیاتی مہارت اور دیگر ادبی خصوصیات پر روشنی ڈالیے۔

معروضی سوالات

سوال نمبر۱ : مسعود حُسین خاں کا سنہ پیدائش کیا ہے؟

(الف) ۱۹۱۹ء (ب) ۱۹۲۰ء (ج) ۱۹۱۸ء (د) ۱۹۱۵ء

سوال نمبر۲ : مسعود حُسین خاں کا انتقال کس سنہ میں ہوا؟

(الف) ۲۰۱۱ء (ب) ۲۰۱۰ء (ج) ۲۰۱۳ء (د) ۲۰۰۹ء

سوال نمبر۳ : مسعود حُسین خاں کی کتاب: ''مقدّمۂ تاریخِ زبانِ اُردو'' پہلی بار کس سنہ میں شائع ہوئی تھی؟

(الف) ۱۹۵۰ء (ب) ۱۹۴۶ء (ج) ۱۹۴۷ء (د) ۱۹۴۸ء

سوال نمبر۴ : مسعود حُسین خاں کی کون سی کتاب کے سب سے زیادہ ایڈیشن شائع ہوئے؟

(الف) دونیم (ب) ورودِ مسعود (ج) مقدّمۂ تاریخِ زبانِ اُردو (د) اُردو زبان وادب

سوال نمبر۵ : مسعود حُسین خاں عثمانیہ یونی ورسٹی حیدرآباد میں کتنے عرصہ رہے؟

(الف) ۵؍سال (ب) ۶؍سال (ج) ۱۰؍سال (د) ۴؍سال

سوال نمبر۶ : دورانِ قیامِ حیدرآباد مسعود صاحب نے کتنے دکنی متنوں کو مرتب کیا؟

(الف) چار (ب) پانچ (ج) تین (د) دو

سوال نمبر۷ : ترتیب وتدوین کے کاموں میں مسعود حُسین خاں نے کون سا طریقہ اختیار کیا؟

(الف) روایتی (ب) سائنٹفک (ج) قدیم (د) عام انداز

سوال نمبر۸ : دکنی ادب سے متعلق مسعود حُسین خاں کی مرتّب کردہ پہلی کتاب کون سی ہے؟

(الف) پرت نامہ (ب) عاشور نامہ (ج) قلی قطب شاہ (د) ابراھیم نامہ

سوال نمبر۹ : ''پرت نامہ'' میں کتنے اشعار شامل ہیں؟

(الف) ۱۲۵؍اشعار (ب) ۱۳۰؍اشعار (ج) ۱۲۲؍اشعار (د) ۱۲۱؍اشعار

سوال نمبر۱۰ : مسعود حُسین خاں کا تحریر کردہ مونوگراف ''محمد قلی قطب شاہ'' کتنے صفحات پر مشتمل ہے؟

(الف) ۱۱۵؍ص (ب) ۱۱۴؍ص (ج) ۱۱۲؍ص (د) ۱۱۱؍ص

معروضی سوالات کے جوابات

جواب نمبر۱ : (الف) ۱۹۱۹ء

جواب نمبر۲ : (ب) ۲۰۱۰ء

جواب نمبر۳ : (د) ۱۹۴۸ء

جواب نمبر۴ : (ج) مقدّمۂ تاریخِ زبانِ اُردو

جواب نمبر۵ : (ب) ۶؍سال

جواب نمبر۶ : (الف) چار

جواب نمبر۷ : (ب) سائنٹفک

جواب نمبر۸ : (الف) پرت نامہ

جواب نمبر۹ : (د) ۱۲۱؍اشعار

جواب نمبر۱۰ : (ج) ۱۱۲؍ص

10.08 حوالہ جاتی کتب

۱۔ مبادیاتِ تحقیق از عبدالرزاق قریشی

۲۔ اُردو تحقیق اور ترتیب متن از تنویر احمد علوی

۳۔ تحقیق کا فن از گیان چند جین

۴۔ مقدّمۂ تاریخِ زبانِ اُردو از مسعود حسین خاں

۵۔ اُردو زبان وادب از مسعود حسین خاں

۶۔ اُردو زبان کی تاریخ کا خاکہ از مسعود حسین خاں

۷۔ مقالاتِ مسعود حُسین خاں از مسعود حسین خاں

۸۔ مضامینِ مسعود از مسعود حسین خاں

۹۔ عاشورنامہ مرتبہ مسعود حسین خاں

۱۰۔ ابراہیم نامہ مرتبہ مسعود حسین خاں

۱۱۔ پرت نامہ مرتبہ مسعود حسین خاں

اکائی 11 : ڈاکٹر گیان چند جین

ساخت :

11.01 : اغراض ومقاصد

11.02 : تمہید

11.03 : ڈاکٹر گیان چند جین بحیثیت محقّق

11.04 : ڈاکٹر گیان چند جینکے تحقیقی کارنامے

11.05 : خلاصہ

11.06 : فرہنگ

11.07 : سوالات

11.08 : حوالہ جاتی کتب

11.01 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ تحقیق کے فن، اصول، طریقِ کار (Methodology) اور اس کی اہمیت وضرورت کے ساتھ ساتھ اُردو کے اہم محقّقین سے متعلّق مختصراً اور اُردو کے معروف محقّق وادیب ڈاکٹر گیان چند جین کی تحقیقی خدمات، ان کے طریقۂ تحقیق اور اُردو ادب میں بحیثیتِ محقّق، ان کے مقام اور مرتبے سے متعلّق ضروری معلومات حاصل کرسکیں گے۔ اس یونٹ کے مطالعے سے اُردو تحقیق کی صورتِ حال نیز ڈاکٹر گیان چند جین کی تحقیقی کاوشوں اور ان کی جملہ اہم تحقیقی تصانیف سے واقفیت حاصل کرسکیں گے۔

11.02 تمہید

انسانی زندگی کے ارتقا میں تحقیقی کدوکاوش اور تحقیقی عمل نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ تحقیق نے انسان کو زندگی کی حقیقتوں کے رازہائے سربستہ سے آگاہ کرکے اسے زندگی گزارنے کا سلیقہ اور شعور عطا کیا ہے اور اچھّا یا بُرا اور غلط اور صحیح کا احساس دلایا ہے۔ عام زندگی کی طرح ادب میں بھی تحقیق کی حیثیت اور اہمیت مُسلّم ہے۔

تحقیق ایک سائنٹفک عمل ہیں۔ زبان وادب کے فروغ کے ساتھ شعرا وادبا کی حیات اور ادبی خدمات کے صحیح جائزے اور ان کے مقام ومرتبے کے تعیّن میں تنقید کی طرح تحقیق بھی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ تحقیق ایک صبر آزما، سنجیدہ، نازک، قدرے دشوار اور ذمّے دارانہ فن ہے۔ اس کے لئے صرف باریک نظر ہی کافی نہیں ہے بلکہ وسیع المطالعہ ہونا بھی ضروری ہے۔ مطالعے کی وسعت اور عالمانہ بصیرت کے ساتھ ساتھ تحقیقی اُمور میں محنت وریاضت، ذہانت ومتانت، سائنسی عقل پسندی اور ایک خاص طرح کی تلاش وجستجو اور لگن کی ضرورت ہوتی ہے۔

بقول غلام رسول مہر:

''کسی بھی تحقیقی کام کی مشکلات کا صحیح اندازہ آسان نہیں، خصوصاً جن اصحاب کو ان مراحل سے کبھی سابقہ نہ پڑا ہو وہ پوری تشریحات کے بعد بھی سمجھ نہیں سکتے کہ ایک ایک معاملے میں صاحبِ تحقیق کے لئے کن کن دشوار گھاٹیوں میں گام فرسائی ناگزیر ہو جاتی ہے۔''

معروف محقّق عبدالرّزاق قریشی نے تحقیق کی تعریف بیان کرتے ہوئے اپنی کتاب ''مبادیاتِ تحقیق'' میں لکھا ہے:

''ذہین آدمی غور وفکر کا عادی ہوتا ہے۔ زندگی کے عام مسائل سے متعلق عموماً اور جن مسائل سے اسے دل چسپی ہوتی ہے، ان سے متعلق خصوصاً وہ سوچتا رہتا ہے یا سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ وہ فطرتاً ترقی پسند ہیں اور اپنے حالات کو بدلنا یا بہتر بنانا چاہتا ہے، اس لئے کہ اس دماغ میں نئے نئے مسائل پیدا ہوتے ہیں یا پرانے مسائل سے متعلق نئے نئے پہلو اور شکوک اس کے سامنے آتے ہیں وہ ان مسائل کو حل کرنا یا شکوک کو دُور کرنا یا یقین سے بدلنا چاہتا ہے۔ یہیں سے تحقیق کی ابتدا ہوتی ہے۔''

(مبادیات تحقیق ص ۱۵)

معیاری تحقیقی مقالے سے متعلق عبدالرّزاق قریشی لکھتے ہیں:

''تحقیقی مقالے میں کوئی علمی مسئلہ حل کیا جاتا ہے یا کوئی نئی بات کہی جاتی ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ جو بات کہی جائے وہ بنیادی طور پر نئی ہو۔ ایک بات پہلے کہی جا چکی ہے۔ اس میں جدید معلومات کا اضافہ بھی تحقیق ہے۔ مسئلہ کے کسی نئی پہلو پر بحث کرنا یا روشنی بھی ڈالنا بھی تحقیق ہے۔''

تحقیق کی ضرورت اور اہمیت ہر زمانے میں محسوس کی جاتی رہی ہے لیکن موجودہ سائنسی دَور میں اس کی قدر و قیمت میں مزید اضافہ ہوا ہے۔ اُردو میں تحقیق کی روایت وقیع ہے۔ اُردو میں نجی ذوق کے تحت کئی اہم اور معیاری تحقیقی کام انجام دیے جا چکے ہیں جامعات کے تحت حصولِ سند کی خاطر تحقیقی کاموں کا سلسلہ جاری ہے۔ تحقیق کا اصل مقصد حقائق کی بازیافت ہے۔ تحقیق ایک مسلسل عمل کی حیثیت رکھتی ہے اس میدان میں حرفِ آخر کو دخل نہیں۔

اُردو میں تحقیق کا آغاز تذکرہ نگاری سے ہوتا ہے۔ شعرائے اُردو کے تذکرے تحقیق کے ابتدائی نقوش ہیں لیکن اس کا باقاعدہ آغاز عہدِ سرسید سے ہوتا ہے۔ سرسید کے علاوہ محمد حسین آزاد اور شبلی نعمانی نے بھی اس میدان میں خدمات انجام دی ہیں۔

حافظ محمود شیرانی، سید سلیمان ندوی، وحیدالدین سلیم، مولوی عبدالحق، مسعود حُسین رضوی ادیب، عبدالسلام ندوی، غلام رسول مہر، رام بابو سکسینہ، محی الدین قادری زور، نصیرالدین ہاشمی، نجیب اشرف ندوی، قاضی عبدالودود، امتیاز علی خاں عرشی، مالک رام، ڈاکٹر سید عبداللہ، نورالحسن ہاشمی، ابواللیث صدیقی، خواجہ احمد فاروقی، گیان چند جین، عبدالقوس دسنوی، ابومحمد سحر، رشید حسن خاں، نثار احمد فاروقی، شیام لال کالرا اور حنیف نقوی وغیرہ کا شمار اُردو کے اہم اور معتبر محققین میں ہوتا ہے۔

آزادی کے بعد یونی ورسٹیوں اور کالجوں میں تحقیقی کاموں کی جانب خصوصی توجہ دی گئی اور مختلف نئے اور پرانے موضوعات پر تحقیقی مقالات تحریر کیے گئے۔ تحقیقی کتابیں شائع ہوئی ہیں اور تحقیقی جرائد بھی شائع ہوئے ہیں۔

11.03 ڈاکٹر گیان چند جین بحیثیت محقّق

ڈاکٹر گیان چند جین کا شمار اُردو کے نامور، معتبر، سنجیدہ اور اہم محقّقین اور ماہرِ لسانیات میں ہوتا ہے۔ انہوں نے شاعری بھی کی لیکن افتادِ طبع، مزاج کی مناسبت، علمیت اور ذاتی دل چسپی کے سبب انہیں تحقیق سے خاص لگاؤ تھا اور وہ بنیادی طور پر محقق تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے اپنی تحقیقی کاوشوں اور علمیت سے اُردو تحقیق میں قابل قدر اضافے کیے ہیں۔ ان کی تحقیقی کاوشوں اور خدمات کا ذکر آئندہ صفحات پر کیا جائے گا یہاں بطورِ تعارف ان کے سوانحی حالات کو مختصراً اس لئے پیش کیا جا رہا ہے تا کہ گیان چند جین کی ادبی خدمات کے تعیّن میں مدد مل سکے اور ان کی شخصیت سے بخوبی واقفیت حاصل ہو سکے۔

گیان چند جین کی پیدائش ۹ ستمبر ۱۹۲۳ء کو ہوئی۔ ان کا آبائی وطن سیوہارا، ضلع بجنور (اُتر پردیش) تھا۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ ۱۹۲۹ء میں گورنمنٹ پرائمری اسکول سیوہار میں داخل ہو کر باقاعدہ طور پر تعلیم کا آغاز کیا۔ ۱۹۳۹ء میں پارکر ہائی اسکول مراد آباد سے ہائی اسکول اور گورنمنٹ انٹر کالج، مراد آباد سے انٹر پاس کیا۔ ۱۹۴۳ء میں الٰہ آباد یونی ورسٹی سے بی.اے. اور ۱۹۴۵ء میں ایم.اے میں کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۴۸ء میں انہیں الٰہ آباد یونی ورسٹی سے ڈی.فل. کی سند ملی۔ ان کے تحقیقی مقالے کا عنوان ''شمالی ہند میں اُردو نثری قصّے'' (ابتدا سے ۱۸۰۰ء تک) تھا۔ ۱۹۵۶ء/۱۹۵۷ء میں انہیں اُردو مثنوی کے ارتقا کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھنے پر آگرہ یونی ورسٹی نے ڈی.لِٹ. کی ڈگری عطا کی۔ اس تحقیقی مقالے پر نظرِ ثانی کر کے اور اس میں ضروری اضافے کر کے انہوں نے اسے ''اُردو مثنوی شمالی ہند میں'' کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع کیا جسے ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔

انہوں نے ۱۹۶۱ء میں ساگر یونی ورسٹی (مدھیہ پردیش) سے لسانیات میں سرٹیفکٹ کا کورس اور ۱۹۶۲ء میں کرناٹک یونی ورسٹی سے ایڈوانس ڈپلوما کیا۔ ۱۹۴۷ء میں انگریزی اخبار ''پائنیر'' سے بحیثیتِ سب ایڈیٹر وابستہ رہے۔ مئی ۱۹۵۰ء میں ان کا تقرر حمیدیہ ڈگری کالج، بھوپال میں بحیثیتِ اُردو لکچرر ہو گیا۔ اکتوبر ۱۹۵۹ء میں جب جمّوں یونی ورسٹی میں شعبۂ اُردو قائم ہوا تو وہاں ان کا تقرّر بحیثیتِ پروفیسر ہو گیا۔ اس کے بعد وہ الٰہ آباد یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو سے وابستہ ہو گئے۔ جب حیدر آباد میں سینٹرل یونی ورسٹی کا قیام عمل میں آیا تو جین صاحب اس کے صدرِ شعبۂ اُردو مقرّر کیے گئے اور یہیں سے وہ ملازمت سے سبک دوش ہوئے۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد لکھنو میں سکونت اختیار کی۔ چند برسوں کے بعد وہ امریکہ منتقل ہو گئے اور وہیں ۱۸ اگست ۲۰۰۷ء کو ان کا انتقال ہوا۔

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے گیان چند جین شاعر بھی تھے اور انہوں نے اپنی زندگی کا آغاز بحیثیت شاعر ۱۹۳۷ء میں کیا تھا لیکن شاعری میں وہ کوئی امتیاز اور مقام حاصل نہیں کر سکے البتہ نثر خصوصاً تحقیق اور لسانیات میں انہوں نے غیر معمولی شہرت حاصل کر کے اُردو ادب میں نمایاں مقام حاصل کر لیا۔ ڈاکٹر گیان چند جین کثیر التّصانیف ادیب تھے۔ انہوں نے اپنی ساری زندگی لکھنے، پڑھنے، تلاش و تحقیق کرنے میں صرف کر دی اور مختلف علمی، ادبی، لسانی موضوعات پر درج ذیل اہم کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔

﴿۱﴾ اُردو کی نثری داستانیں ۱۹۵۴ء

﴿۲﴾ تحریریں ۱۹۶۴ء

﴿۳﴾ اُردو مثنوی شمالی ہند میں ۱۹۶۹ء

﴿۴﴾ تفسیرِ غالب ۱۹۷۲ء

﴿۵﴾ تجزیے ۱۹۷۳ء

﴿۶﴾ لسانی مطالعے ۱۹۷۳ء

﴿۷﴾ حقائق ۱۹۷۸ء

﴿۸﴾ ذکر و فکر ۱۹۸۰ء

﴿۹﴾ ابتدائی کلام اقبال (تحقیق و تدوین)

﴿۱۰﴾ عام لسانیات ۱۹۸۵ء

﴿۱۱﴾ تحقیق کا فن ۱۹۹۰ء

﴿۱۲﴾ ادبی اصناف ۱۹۹۰ء

﴿۱۳﴾ کھوج ۱۹۹۰ء

﴿۱۴﴾ پرکھ اور پہچان ۱۹۹۰ء

﴿۱۵﴾ اُردو کا اپنا عروض

﴿۱۶﴾ کچّے بول (شعری مجموعہ) ۱۹۹۱ء

﴿۱۷﴾ اوپندر ناتھ اشک

﴿۱۸﴾ قاضی عبدالودود

﴿۱۹﴾ ایک بھاشا، دو لکھاوٹ، دو ادب

﴿۲۰﴾ تاریخ ادب اُردو (تحقیق و تدوین) بہ اشتراک سیدہ جعفر

موصوف نے اپنی تحقیقی اور لسانی خدمات سے اُردو زبان و ادب کو ایک خاص وقار و اعتبار عطا کیا ہے۔ ان کی طویل و مسلسل اور اہم تحقیقی و لسانی اور ادبی خدمات قابل قدر اس لئے بھی ہیں کہ انہوں نے کئی نئے موضوعات کو اپنی تحقیق کا عنوان بنایا اور کئی نئے فن پاروں کو متعارف کرا کے اُردو ادب کے دامن کو معتبر اور وسیع بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ وہ بنیادی طور پر محقّق تھے لیکن ان کی تحریروں میں تحقیق و تنقید کا متوازن امتزاج ملتا ہے۔ تحقیق و تنقید لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتی ہیں۔ تنقیدی بصیرت کے بغیر اعلیٰ تحقیقی کام انجام نہیں دیا جا سکتا۔ ڈاکٹر گیان چند جین اس رمز سے بخوبی واقف تھے یہی سبب ہے کہ ان کی تحقیق اپنا خاص معیار و اعتبار رکھتی ہے۔ ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ:

''ان کے تنقیدی مضامین میں تحقیق کی اور تحقیقی کاوشوں میں نقاد کی بصیرت کا پہلو غالب ہے''

یوں جین صاحب کی بیش تر تحریر کردہ کتابیں معیاری ہیں لیکن ان کی کتابوں میں ''اُردو کی نثری داستانیں، اُردو مثنوی شمالی ہند میں، لسانی مطالعے، تحقیق کا فن، تحریریں'' خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ مذکورہ بالا کتابوں کے مطالعے سے جین صاحب کی غیر معمولی ادبی صلاحیتوں، وسیع المطالعہ ہونے اور تحقیقی وتنقیدی شعور کا اندازہ ہوتا ہے۔

11.04 ڈاکٹر گیان چند جین کے تحقیقی کارنامے

''اُردو کی نثری داستانیں'' دراصل تحقیقی مقالہ ہے جس پر ڈاکٹر گیان چند جین کو الٰہ آباد یونی ورسٹی سے ڈی.فل. کی سند دی گئی۔ یہ مقالہ پہلی بار انجمن ترقّی اُردو، پاکستان سے ۱۹۵۴ء میں کتابی شکل میں شائع ہوا تھا اور اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۹ء میں طبع ہوا۔ پہلا ایڈیشن میں صرف شمالی ہند کی داستانوں کے جائزے اور ۱۹ رویں صدی تک ہی محدود تھا لیکن دوسرے ایڈیشن میں دیگر تصانیف نیز دکنی داستانوں کو بھی موضوعِ تحقیق بنا کر اسے نئی ترتیب واضافہ کے ساتھ شائع کیا گیا۔ اس طرح یہ کتاب اُردو کی نثری داستانوں سے متعلق تعارف، تجزیہ اور تحقیق کے لحاظ سے پہلی اہم، وقیع اور ضخیم تحقیقی کتاب تسلیم کی جاتی ہے۔ اس کتاب کو مزید بہتر اور معتبر بنانے کے لئے جین صاحب نے ہندوستان کے مختلف کتب خانوں سے استفادہ کیا اور مواد کے حصول میں اصل ماخذات کا سہارا لے کر حقائق تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ یہی سبب ہے کہ گیان چند جین کی نہ صرف یہ کتاب بلکہ دیگر تحقیقی کتب بھی مواد اور پیش کش، معیار اور نتائج کے اعتبار سے معتبر اور بھرپور ثابت ہوئی ہے۔ گیارہ ابواب پر مشتمل اس ضخیم کتاب میں محقّق ومصنّف نے اُردو کی تمام اہم نثری داستانوں کا جائزہ پیش کر کے بہت سے گمنام اور پوشیدہ گوشوں کو عام کیا ہے۔ اس کتاب میں محض نثری داستانوں کا حقائق کی روشنی میں تعارف نہیں کرایا گیا ہے بلکہ فنِ قصّہ گوئی، عہدِ قدیم میں قصّہ گوئی کی روایت، عہدِ عتیق کے انسان کا ماحول، حالات اور نفسیات، عقائد وتوہمات، قدیم افسانوی ادب کی اقسام، حکایات و تمثیلات، قصّہ گوئی اور اس سے متعلّق متن وموضوع، تکنیک، اجزائے ترکیبی اور زبان وبیان کے معیار ومزاج پر بھی سیر حاصل تحقیقی مواد پیش کیا ہے اور اُردو میں داستان نویسی کی ابتداء، ارتقاء، فروغ اور زوال کے اسباب پر بھی اظہار خیال کیا ہے اور اُردو کی مشہور داستانوں کا تحقیقی تنقیدی جائزہ لے کر ان کے ادبی، افسانوی، لسانی معیار ومرتبے کا تعیّن بھی کیا ہے۔ اس اعتبار سے جین صاحب کی یہ کتاب اُردو کے داستانوی ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

ڈاکٹر گیان چند جین کی دوسری تحقیقی کتاب ''اُردو مثنوی شمالی ہند میں'' ہے جس پر انہیں آگرہ یونی ورسٹی سے ڈی.لٹ کی ڈگری دی گئی تھی۔ یہ مقالہ اگرچہ ۱۹۵۶ء کے آخر میں مکمل کر لیا گیا تھا لیکن اس کی اشاعت، انجمن ترقی اُردو ہند (علی گڑھ) سے ۱۹۶۹ء میں آئی۔ یہ کتاب ۸۶۲ر صفحات اور گیارہ ابواب پر مشتمل ہے اور اِس تحقیقی مقالے میں اُردو مثنوی کے فن، اس کے سیاسی وسماجی، تہذیبی پس منظر، موضوع، اصول اور عہد بہ عہد ارتقا کو پیش کرتے ہوئے شمالی ہند میں اُردو کی اہم مثنویوں کا تحقیقی، تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اُردو کی یہ پہلی تحقیقی کتاب ہے جس میں اُردو کی بارہ سَو مثنویوں کا ذکر شامل ہے جن میں کئی مثنویاں غیر مطبوعہ بھی ہیں جن کے مسودات کا مطالعہ کر کے گیان چند جین نے اپنی آرا کا اظہار کیا ہے یا جنہیں پہلی بار باقاعدہ طور پر متعارف کرایا ہے۔ ان مثنویوں میں میر تقی میر کی وہ تین مثنویاں اور امیر مینائی کی ایک طویل مثنوی بھی شامل ہیں جنہیں دریافت کرنے کا سہرا جین صاحب کے سر بندھتا ہے۔

گیان چند جین محض ادبی محقّق ہی نہ تھے بلکہ ماہرِ لسانیات بھی تھے۔ادبی تحقیق کی طرح لسانیاتی تحقیق سے بھی انہیں خاص دل چسپی تھی۔ چناں چہ انہوں نے بولیوں ،زبانوں کے ساتھ ساتھ اُردو زبان اور لسانی موضوعات پر بھی کئی مضامین تحریر کیے۔''تحریریں،لسانی مطالعے'' کے عنوانات سے کتابیں بھی شائع کی ہیں۔کتاب:''لسانی مطالعے'' دراصل لسانی موضوع پر لکھے گئے ۱۶ رمضامین کا مجموعہ ہے جو کہ پہلی بار ۱۹۷۳ء ترقی اُردو بیورو،نئی دہلی سے شائع ہوا تھا۔

۲۳۳ رصفحات پر مشتمل اس کتاب میں''لسانیات کے مطالعے کی اہمیت،زبان اور علم زبان،آغازِ زبان کے نظریے،اُردو کا نام اور آغاز کے نظریے،زبان اور بولی،کھڑی بولی اور ہندوستانی،ہندوستان کے رسوم الخط،بھوپالی اُردو،زبان کا مسئلہ،مہاتما گاندھی اور بھاشا کا سوال،یائے اضافت اور ہمزہ'' وغیرہ عنوانات سے اہم لسانی اور ادبی موضوعات پر مضامین شامل ہیں۔ مذکورہ بالا تمام مضامین خالص تحقیقی نوعیت کے حامل ہیں جن میں متعلقہ موضوع پر مصنّف نے اہم تحقیقی مواد پیش کر کے اُردو لسانیات اور اُردو تحقیق کے دائرے میں قابلِ قدر اضافہ کیا ہے۔اُردو ادب میں لسانیات پر بہت کم توجہ دی گئی ہے۔بقول گیان چند جین:

> ''اُردو میں لسانیات کی ابتدا ڈاکٹر زور کی کتاب''ہندوستانی لسانیات'' سے ہوتی ہے۔اس کے بعد ایک طویل عرصہ تک سناٹا رہتا ہے۔آزادی کے بعد ہندو پاک دونوں ممالک میں اس موضوع پر اِکّا، دُکّا کتابیں لکھی گئیں۔پچھلے دس سال سے رسالوں میں لسانیات پر مضمون بھی دکھائی دینے لگے ہیں،شروع شروع میں عام قارئین ان مضامین کو دیکھ کر ناک بھوں چڑھاتے تھے لیکن اب ان کی بھڑک کم ہوئی ہے۔''
>
> (لسانی مطالعے:ص..۱۱)

یہ حقیقت ہے کہ اُردو میں لسانیات خصوصاً صوتیات پر بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ڈاکٹر گیان چند جین پہلے لسانیاتی محقّق ہیں جنہوں نے نہ صرف اس اہم کمی کو محسوس کیا بلکہ باقاعدہ طور پر اس کی جانب خاص توجہ کر کے کئی اہم مضامین تحریر کیے ہیں۔اس نازک اور اہم موضوع پر قلم اُٹھانے سے قبل جین صاحب نے نہ صرف بغور مطالعہ کیا تھا بلکہ اُردو اور دیگر زبانوں کے ماہرِ لسانیات سے صلاح ومشورہ بھی کیا تھا۔جین صاحب کے لکھے گئے اس نوع کے مضامین میں''اُردو مصوتے ،اُردو کی غنائی اصوات،اُردو میں بل اور زور'' وغیرہ بے حد اہم ہیں اور پہلی بار ان کے ذریعے قابل توجہ مواد پیش کیا گیا ہے۔ڈاکٹر گیان چند جین نے اپنی محقّقانہ نظر اور تلاش وتفحّص کی صلاحیتوں سے کام لے کر کئی اہم تحقیقی موضوعات کو عام کرنے کی کوشش کی ہے اور کئی نئے موضوعات کو دریافت بھی کیا ہے۔انہوں نے اُردو سے متعلّق چودھواں مصوتہ دریافت کیا ہے جو کہ اُردو کے لئے مخصوص ہے اور جس کا رواج ہندی میں نہیں ملتا۔یہ خفیف مصوتہ''اَوْ'' ہے۔

کتاب''لسانی مطالعے'' پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔پہلا باب عام لسانیات سے متعلّق ہے۔دوسرا باب صوتیات سے تعلّق رکھتا ہے۔ تیسرے باب میں فنِ تحریر پر مفید مواد فراہم کیا گیا ہے۔چوتھے باب میں''زبان اور بولی'' کے تعلّق سے اہم تحقیقی ولسانی مواد شامل ہے۔ جب کہ پانچواں باب ڈاکٹر زور کی لسانی خدمات کا احاطہ کرتا ہے۔کتاب کا انتساب مسعود حُسین خاں کے نام کیا گیا ہے۔یوں تو ڈاکٹر جین کی بیش تر کتابیں تحقیق کا اعلیٰ نمونہ ہیں لیکن تحقیق کے فن پر لکھی گئی ان کی کتاب''تحقیق کا فن'' کئی اعتبار سے ایک اہم تحقیقی کتاب ہے جس میں متعلقہ موضوع پر تقریباً تمام اہم پہلوؤں پر اظہارِ خیال کیا ہے۔فی زمانہ جب کہ سند کے حصول کے خاطر جامعات میں M.Phil اور Ph.d کی

اسناد کے لئے تحقیقی سرگرمیوں میں خاصہ اضافہ ہوگیا ہے۔ یہ کتاب محقّقین خصوصاً ریسرچ اسکالر کے لئے ایک رَہ نما کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔اس کتاب کو ایجوکیشنل بک ہاؤس، دہلی نے ۱۹۱۲ء میں شائع کیا تھا۔اس کتاب کی اہمیت وضرورت کے پیشِ نظر اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۱۳ء میں شائع کیا گیا ہے۔اُردو میں تحقیق کے فن،اصول،طریقۂ کار(Methodology)اور تکنیک پر بہت کم کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ڈاکٹر گیان چندجین کی یہ کتاب اس لئے بھی خاص اہمیت اور منفرد نوعیت کی حامل ہیں کہ اس میں پہلی بار تحقیق کے فن،اُصول،اور طریقِ کار اور تکنیک کو سائنٹفک انداز میں پیش کر کے موضوع سے متعلق نہایت اہم مفید مواد پیش کیا گیا ہے۔

۲۲/ابواب اور ۶۱۱/صفحات پر مشتمل اس کتاب میں تحقیق کی تعریف، اقسام،اَوصاف،تحقیقی مقالے کی قسمیں،نگراں کے اوصاف،مقالے کے اجزا،موضوع اور ان کی اقسام،تحقیق کا خاکہ(Synopsis)مواد کی فراہمی،حوالے کے طریقے،نوٹس لینے طریقے،مواد کی پرکھ اور اس کے انتخاب کے طریقے،مقالے کی تسوید، زبان و بیان،مقالے کی ہیئت،اجتماعی تحقیق،انفرادی تحقیق کے طریقِ کار، تصحیحی تحقیق،سندی تحقیق،تحقیق کا تنقید اور دیگر علوم سے تعلّق وغیرہ تحقیقی اُمور اور نکات کو سائنٹفک انداز میں پہلی بار تفصیل اور دلائل کے ساتھ مؤثر طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔

اُردو کی بیش تر جامعات میں تحقیقی نصاب شامل نہ ہونے یا تحقیقی تربیت نہ کیے جانے کے سبب ریسرچ اسکالر ہی نہیں اساتذہ اور نگراں بھی تحقیقی مبادیات،طریقۂ کار،فن،اُصول،تکنیک وغیرہ سے لاعلم ہوتے ہیں اور بطور نگراں یا ریسرچ اسکالر اپنے فرائض بخوبی انجام نہیں دے پانے کے سبب تحقیقی معیار پست اور کمتر ہوتا جا رہا ہے۔گیان چندجین کی یہ کتاب اس لئے بھی اہم اور مفید ہے کہ یہ نگراں حضرات اور ریسرچ اسکالر کی صحیح رَہ نمائی کرتی ہے اور انہیں معیاری تحقیق کے گُر سکھاتی ہے۔ تحقیق کے فن،اہمیت،ضرورت اور طریقۂ کار سے آگاہ کرتی ہے۔ڈاکٹر گیان چندجین نے اس کتاب کی تیاری میں انگریزی،ہندی اور دیگر زبانوں کی کتابوں اور مصنّفین ومحقّقین سے خاطر خواہ استفادہ کر کے اسے Update اور مفید تر بنانے کی کوشش کی ہے۔اس نوع کی کتاب کی ضرورت عرصہ دراز سے محسوس کی جا رہی تھی۔اس کتاب کی اشاعت سے ایک بڑی کمی دُور ہوگئی ہے اور معیاری تحقیق کی راہ ہم وَار ہوگئی ہے۔

اس کتاب کی اہمیت اور ضرورت پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے معروف محقّق، ادیب اور تاریخ نویس ڈاکٹر جمیل جالبی نے لکھا ہے:

> ’’تحقیق کا فن‘‘ ڈاکٹر گیان چندجین کی وہ قابلِ قدر تصنیف ہے جس میں فنِ تحقیق کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔اس کتاب کے بارے میں خود مصنّف نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ’’میں ’’فنِ تحقیق‘‘ کو اپنی بہترین کتاب سمجھتا ہوں‘‘ اس کتاب میں نہ صرف ان کی زندگی کے علمی اور تحقیقی تجربوں اور وسیع، گہرے مطالعے کا نچوڑ آ گیا ہے بلکہ ترتیب کے ساتھ فنِ تحقیق کے وہ سارے پہلو بھی سامنے آ گئے ہیں جو تحقیق کرنے والے ہر طالب علم، ہر استاد اور سبھی محقّقوں کے لئے نہایت مفید ہیں۔کتاب کے مطالعے سے تحقیق کرنے والوں کی ایسی تعلیم وتربیت ہو جاتی ہے جن کی مدد سے وہ تحقیق کو سائنٹفک بنیادوں پر قائم کر سکتے ہیں۔اس کتاب کے مطالعے سے ایک طرف ایم فل. اور پی ایچ.ڈی. کے مقالوں کا معیار بلند ہوگا،ترتیب و تدوین کی بہترین صورت وجود میں آئے گی اور ساتھ ہی تحقیق کرنے والوں میں ایک گہرا شعور بھی پیدا ہوگا۔میری نظر سے اس موضوع پر ابھی تک کوئی ایسی کتاب نہیں گزری جس میں تحقیق کے سارے پہلوؤں اور طلبا اور اساتذہ کی ساری

ضرورتوں کو سامنے رکھ کر کتاب لکھی گئی ہو۔ یہ کتاب تحقیق کے سلسلے میں اسی لئے ایک بنیادی حوالے کی کتاب کا درجہ رکھتی ہے۔''

ڈاکٹر گیان چند جین نے اپنی اس کتاب میں تحقیق کی روایتی، قدیم وجدید سبھی کارآمد اور مفید پہلوؤں کو ملحوظ رکھا ہے لیکن رچرڈ ایلیٹ سے متاثر ہو کر بعض تحقیقی اُمور میں روایت شکنی بھی کی ہے اور تین ایسی شفارشات بھی پیش کی ہیں جو کہ اُردو تحقیق کی عام روایات اور اُردو محقّقین کے عام موقف سے جداگانہ ہیں۔

ڈاکٹر گیان چند جین نے منفرد اور جدید نوعیت کی جو تین شفارشیں کی ہیں وہ یہ ہیں:

﴿۱﴾ تحقیق کی زبان غیر دل چسپ اور بوجھل نہیں بلکہ سلیس وشگفتہ ہونی چاہیے۔

﴿۲﴾ تحقیق کو غیر شخصی اُسلوب میں نہ لکھیے۔ قاری اور اپنے بیچ ایک رشتہ شناسائی قائم کیجیے اور اسے اپنا رفیقِ سفر بنا کر آگے بڑھیے۔

﴿۳﴾ فُٹ نوٹ اور حوالے کم ہونے چاہیے۔ مختصر حوالوں کو متن کے بیچ میں درج کر دینا بہتر ہے۔

بلا شبہ تحقیق بھی ایک اہم فن اور ادبی شہ پارہ ہے اس میں بھی جاذبیت ضروری ہے۔ اُسلوب کی شگفتگی اور متن کی دل چسپ پیشکش سے تحقیقی مواد کو دل چسپ اور قابلِ مطالعہ بنایا جاسکتا ہے اور اس کی خشکی کو دُور کیا جاسکتا ہے۔ گیان چند جین کی مذکورہ بالا تینوں شفارشات مناسب اور معقول ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے اپنی تحقیقی کتب اور تحقیقی مضامین ومقالات میں تحقیق سے متعلق سبھی اہم نکات اور طریقۂ کار کو ملحوظ رکھا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی تحقیقی نگارشات میں حقائق اور دلائل کی آمیزش، اُسلوب کی شگفتگی، پیش کش کا سائنٹفک انداز، ضروری اور صحیح حوالے جات، ترتیب کا حُسن، مواد کی مناسبت اور تحقیق کے معیار و وقار کو برقرار رکھا ہے۔ بلا شبہ ڈاکٹر گیان چند جین اُردو کے اہم، معتبر محقّق ہیں۔ اُردو تحقیق اور لسانیات سے متعلّق ان کی طویل ومسلسل خدمات، اُردو ادب میں انہیں بحیثیتِ محقّق اور ماہرِ لسانیات اہم مقام دلانے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ انہوں نے جو وقیع اور اہم تحقیقی سرمایہ یادگار چھوڑا ہے وہ آنے والی نسلوں کی رَہ نمائی کرنے اور استفادہ کرنے میں ہمیشہ معاون ومفید ثابت ہوگا اور اُن کا شمار اُردو کے اہم محقّقین اور ماہرِ لسانیات میں کیا جاتا رہے گا۔

11.05 خلاصہ

اُردو ایک جدید ہندوستانی زبان ہے۔ اس کا ادبی سرمایہ خاصا وقیع اور متنوّع ہے لیکن لسانیات اور تحقیق سے متعلّق موضوعات پر اتنا کام انجام نہیں دیا جاسکا ہے جتنا کہ ضروری تھا۔ لسانیات جیسے مشکل اور خشک موضوع پر تو تحقیق سے بھی زیادہ کم کام کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین کو اس بات کا بخوبی احساس تھا۔ یوں بھی انہیں تحقیق اور لسانیات سے فطری اور ذہنی مناسبت تھی چناں چہ انہوں نے اپنے مزاج کی مناسبت، پسند اور وقت کے تقاضے اور اس کی پیشِ نظر ان پیچیدہ، خشک مگر اہم موضوعات کو منتخب کر کے ابتدا ہی سے تحقیق کے خارزار میں گام فرسائی قبول کی اور اپنی محنت، لگن، مطالعے، مشاہدے، تجربے، فکر، تلاش وتفحص کے ذریعے اُردو ادب اور لسانیات سے متعلّق اہم اور اچھوتے موضوعات کو عنوان بنا کر اُردو میں تحقیق اور لسانی مواد کا اضافہ کیا۔ انہوں نے محض تحقیق ہی نہیں کی بلکہ تحقیق کے فن، موضوع، اُصول، تکنیک، پیشکش اور طریقۂ کار (Methodology) پر بھی قابلِ قدر اور قابلِ عمل مواد پیش کر کے ایک ذمّے دار معتبر ومعیاری محقّق کا کام انجام دیا ہے۔

ڈاکٹر گیان چند جین ساری زندگی لسانی، تحقیقی مطالعے اور سرگرمیوں میں مصروف رہے۔ اپنی علمی تشنگی کو مٹانے کے لئے انہوں نے ملک کے کئی کتب خانوں کی خاک چھانی اور مخطوطات و کتب کا مطالعہ کر کے کئی نئے موضوعات سے اہلِ ادب کو متعارف کرایا۔ ڈاکٹر گیان چند جین کثیر التّصانیف مصنّف و محقّق تھے۔ انہوں نے مختلف تحقیقی اور لسانی موضوعات پر کئی اہم مضامین اور مقالات سپردِ قلم کیے اور کئی اہم اور مستقل موضوعات پر تفصیلی مواد پیش کر کے ضخیم کتابیں شائع کیں۔ اُردو ادب میں اُردو تحقیق اور اُردو لسانیات میں قابلِ قدر اضافہ کرنے اور نئے نئے تحقیقی موضوعات کو متعارف کرانے میں ڈاکٹر گیان چند جین نے جو نمایاں اور اہم کردار ادا کیا ہے اس کے سبب ان کا شمار اُردو کے اہم ترین محقّقین و مصنّفین میں ہوتا ہے۔

11.06 فرہنگ

آرا	: رائے کی جمع	ضخیم	: موٹی، زیادہ صفحات والی
آگاہ	: واقف، جاننا	عقائد	: عقیدہ کی جمع
اسباب	: سبب کی جمع	عہد بہ عہد	: زمانہ بہ زمانہ
استفادہ	: فائدہ، فیض، مدد	عہدِ عتیق	: پُرانا زمانہ، قدیم عہد
افتادِ طبع	: طبیعت کا رجحان، پسند، مزاج	فروغ	: ترقی
امتزاج	: آمیزش، ملاوٹ	گام فرسائی	: چلنا، گھومنا
امتیاز	: خاص پہچان، خاص مقام، خصوصیت	ماخذات	: ماخذ وہ اصل ذریعہ جس سے مواد حاصل یا اخذ کیا جاتا ہے
انتساب	: معنون کرنا، Dedicate کرنا		
بازیافت	: حاصل ہونا، حصول	ماہرین	: ماہر کی جمع، ایکسپرٹ
بصیرت	: شعور، عقل مندی، دانش مندی	متنوّع	: رنگا رنگ، تنوّع والا
تشریحات	: تشریح کی جمع، وضاحت، مطلب	متوازن	: توازن، درمیانہ، مناسب
تشنگی	: پیاس	محقّق	: تحقیق کرنے والا
تفحص	: تلاش و تحقیق	مسلّم	: تسلیم شدہ، مانا ہوا
توہمات	: توہم کی جمع	مسوّدات	: مسوّدہ کی جمع، تھیسس
جاذبیت	: کشش، دل چسپ	مشتمل	: پھیلا ہوا، محیط
جامعات	: یونی ورسٹی	معروف	: جانا پہچانا، مقبول
جداگانہ	: علاحدہ، مختلف	مقالات	: مقالے کی جمع، ریسرچ پیپر
جرائد	: جریدے کی جمع، میگزین	ملحوظ	: لحاظ
دلائل	: دلیل کی جمع	ملزوم	: لازمی

رازہائے سربستہ	:	چھپے ہوئے راز، اہم راز	منفرد	:	الگ، عام ڈھنگ سے مختلف
روایت شکنی	:	روایت سے ہٹ کر، عام ڈگر سے ہٹ کر	موقف	:	رائے، خیال
سپردِ قلم	:	تحریر کیے، لکھے	ناگزیر	:	ضروری
سرمایہ	:	مال دولت، مواد	نقوش	:	نقش کی جمع
سفارشات	:	سفارش کی جمع	نکات	:	نکتہ کی جمع
سکونت	:	رہائش	نگراں	:	گائڈ
سنگ میل	:	میل کا پتھر یعنی بہت اہمیت والا رہ نمائی کرنے والا/والی	نوعیت	:	قسم، طرز
			وسیع المطالعہ	:	زیادہ پڑھنے کا عمل
شکوک	:	شک کی جمع	وقیع	:	قیمتی، وقعت والی
صوتیات	:	صوت کی جمع، فونیٹکس کا علم	ہم وَار	:	آسان

11.07 سوالات

مختصر سوالات

سوال نمبر۱ : اُردو میں تحقیق کے ابتدائی نقوش کسے قرار دیا جاتا ہے؟

سوال نمبر۲ : کس عہد سے اُردو میں باقاعدہ تحقیق کا آغاز ہوتا ہے؟

سوال نمبر۳ : ڈاکٹر گیان چند جین نے کتنی تحقیقی کتابیں یادگار چھوڑی ہیں؟

سوال نمبر۴ : اُردو ادب میں ڈاکٹر گیان چند جین کی بنیادی حیثیت کیا ہے؟

تفصیلی سوالات

سوال نمبر۱ : گیان چند جین کے سوانحی حالات تحریر کیجیے۔

سوال نمبر۲ : گیان چند جین کی لسانیاتی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

سوال نمبر۳ : عبدالرزاق قریشی نے تحقیق کی کیا تعریف بیان کی ہے؟

سوال نمبر۴ : غالبؔ اور اقبالؔ پر لکھی گئیں جین صاحب کی کتابوں پر اظہار خیال کیجیے۔

معروضی سوالات

سوال نمبر۱ : اُردو میں باقاعدہ تحقیق کا آغاز کس کے عہد میں ہوا؟

(الف) میرؔ (ب) غالبؔ (ج) سرسیدؔ (د) میر امن

سوال نمبر۲ : گیان چند جین نے ڈی.فل. کی ڈگری کہاں سے حاصل کی تھی؟

(الف) علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی (ب) الہ آباد یونی ورسٹی (ج) دہلی یونی ورسٹی (د) عثمانیہ یونی ورسٹی

سوال نمبر۳ : گیان چند جین کس یونی ورسٹی سے سبک دوش ہوئے تھے؟

(الف) الٰہ آباد یونی ورسٹی (ب) سینٹرل یونی ورسٹی، حیدرآباد (ج) جموں یونی ورسٹی (د) وکرم یونی ورسٹی، اُجّین

سوال نمبر۴ : گیان چند جین کی پہلی کتاب اُردو نثر کی داستانیں کس سنہ ء میں شائع ہوئی تھی؟

(الف) ۱۹۵۴ء (ب) ۱۹۶۰ء (ج) ۱۹۶۵ء (د) ۱۹۷۰ء

سوال نمبر۵ : جین صاحب کی تحقیق پر لکھی گئی کتابوں میں سب سے اہم کتاب کون سی ہے؟

(الف) تحریریں (ب) لسانی مطالعے (ج) تحقیق کا فن (د) کھوج

سوال نمبر۶ : کتاب ''اُردو کی نثری داستانیں'' کتنے ابواب پر مشتمل ہے؟

(الف) ۱۰ (ب) ۱۲ (ج) ۹ (د) ۱۱

سوال نمبر۷ : گیان چند جین کو ''ڈی لٹ.'' کی ڈگری کس یونی ورسٹی نے دی؟

(الف) بنارس یونیورسٹی (ب) آگرہ یونی ورسٹی (ج) الٰہ آباد یونی ورسٹی (د) دہلی یونی ورسٹی

سوال نمبر۸ : گیان چند جین نے میر تقی میرؔ کی کتنی مثنویاں دریافت کی ہیں؟

(الف) ۳ (ب) ۲ (ج) ۱ (د) ۴

سوال نمبر۹ : کتاب ''لسانی مطالعے'' میں کتنے مضامین شامل ہیں؟

(الف) ۱۰ (ب) ۱۲ (ج) ۱۶ (د) ۱۱

سوال نمبر۱۰ : ڈاکٹر گیان چند جین نے اُردو کا جو مصوّر تہ دریافت کیا ہے وہ کون سا ہے؟

(الف) اے (ب) ای (ج) اَو (د) ان میں کوئی نہیں

معروضی سوالات کے جوابات

جواب نمبر۱ : (ج) سرسید

جواب نمبر۲ : (ب) الٰہ آباد یونی ورسٹی

جواب نمبر۳ : (ب) سینٹرل یونی ورسٹی، حیدرآباد

جواب نمبر۴ : (الف) ۱۹۵۴ء

جواب نمبر۵ : (ج) تحقیق کا فن

جواب نمبر۶ : (د) ۱۱

جواب نمبر۷ : (ب) آگرہ یونی ورسٹی

جواب نمبر۸ : (الف) ۳

جواب نمبر۹ : (ج) ۱۶

جواب نمبر۱۰ : (ج) اَو

11.08 حوالہ جاتی کتب

۱۔	مبادیاتِ تحقیق	از	عبدالرزاق قریشی
۲۔	لسانی مطالعے	از	گیان چند جین
۳۔	عام لسانیات	از	گیان چند جین
۴۔	تحقیق کا فن	از	گیان چند جین
۵۔	کھوج	از	گیان چند جین
۶۔	پرکھ اور پہچان	از	گیان چند جین
۷۔	تاریخ ادب اُردو	مرتبہ	گیان چند جین اور سیدہ جعفر

اُتراکھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی (نینی تال)

SCHOOL OF HUMANITIES

UTTARAKHAND OPEN UNIVERSITY

Teenpani Bypass Road, Behind Transport Nagar

Haldwani - 263 139, Nainital (Uttrakhand)

Phone: 05946-261122, 261123 Fax No.: 05946-264232

www.uou.ac.in email: info@uou.ac.in

Toll Free No: 1800 180 4025

MAUL-504-1(003897)